میرؔ کی آپ بیتی

(ذکرِ میرؔ کا اُردو ترجمہ)

مع فارسی متن

نثار احمد فاروقی

میر کی آپ بیتی

(ذکرِ میر کا اُردو ترجمہ)

میر کی آپ بیتی

(ذکرِ میر کا اُردو ترجمہ)

نثار احمد فاروقی

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند)، ۱۴۶۷

سنہِ اشاعت: ـــــــــــــ ۱۹۹۶ء
قیمت : ـــــــــــــ ۱۲۵ ؍ روپے
بہ اہتمام : ـــــــــــــ اختر زماں
طباعت: ـــــــــــــ ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

MEER KI AAP BITI
EDITED BY NISAR AHMED FARUQI
PRICE RS. 125/-
1996

ISBN-81-7160-088-3

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR : 212 ROUSE AVENUE
NEW DELHI-110002

اِنتساب

لائق نبود قطرہ بہ عمّان بُردن   خار و خسِ صحرا بہ گلستاں بُردن
لیکن چہ کنم کہ رسمِ مورے باشد   پائے ملخے بہ پیشِ سُلیماں بُردن

میں اپنی یہ حقیر کوشش، احترام و عقیدت کے سدا بہار پھولوں کی خوشبو میں بسا کر اپنے شفیق اُستاد اور پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ سلیمان احمد چشتی قدّسَ اللہ سِرَّہ العزیز (سجادہ نشینِ پنجم حضرت خواجہ شاہ عبدالہادی و خواجہ شاہ عبدالباری چشتی رضوانُ اللہِ علیہما) کی خدمت میں شرفِ قبول کی تمنّا کے ساتھ پیش کرتا ہوں، جن کے فیضِ تربیت سے خزف ریزوں کو ایسا آب و رنگ مل گیا کہ وہ لعل و گوہر سے آنکھ ملا سکیں۔

اوقات ہمان بود کہ با یار بسر رفت
باقی ہمہ بے حاصلی و بے خبری بود

فہرست

میری دلی سے ہجرت

ذکرِ میر[1] (متن فارسی)

---

[1] ذکرِ میر کا فارسی متن جو ۱۹۲۸ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا تھا، اس میں عنوانات خود مولوی عبدالحق نے قائم کیے تھے۔ ہم نے یہاں فارسی متن میں وہی عنوانات باقی رکھے ہیں جو میر نے لکھے تھے۔ فارسی متن میں کسی خاص موضوع کی تلاش کے لیے اشاریے سے مدد لی جائے۔

[نثار احمد فاروقی]

حرفِ آغاز

اُردو شاعروں کی محفل میں میر محمد تقی میرِؔ مجلس ہیں اِس کا اعتراف تو ہر زمانے میں کیا گیا ہے مگر اِس انوکھے، البیلے، عظیم شاعر کی زندگی اور فن پر جتنا اور جیسا کام ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوا۔ یہ بات مرزا غالبؔ اور شاعرِ مشرق اقبالؔ سے متعلق کتابیات کو سامنے رکھ کر پرکھی جائے تو اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

میرؔ پر تحقیق و تنقید کا اچھا اور وسیع کام نہ ہونے کے اسباب ہیں سے ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ اُن کے بارے میں اتنی تفصیلات نہیں ملتیں جتنی غالبؔ و اقبالؔ تو کیا، دردؔ، یا مصحفیؔ اور انشاؔ کے بارے میں بھی مل جاتی ہیں۔ دوسرا سبب یہ کہ میرؔ کا حلقۂ تلامذہ اور حلقۂ احباب اتنا وسیع نہ تھا جتنا غالبؔ، یا داغؔ و اقبالؔ کا تھا اُس لیے مراسلت بھی اتنی نہ تھی، ڈاک کا نظام بھی غالبؔ کے زمانے میں بہت وسیع ہوچکا تھا تیسرا سبب یہ کہ میرؔ کی زندگی کا وہ حصہ جو ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء تک دہلی میں بسر ہوا سخت سیاسی ہیجان اور ہل چل کا، طوائف الملوکی کا دور تھا، اُن سیاسی آندھیوں سے گزر کر میرؔ کا کلام ہی محفوظ رہ گیا تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔

لیکن میرؔ کو ایک امتیاز اور حاصل ہے جو اُن کے معاصرین میں کسی کے حصّے میں نہیں آیا اور اُن کے بعد بھی برسوں تک کسی کو نصیب نہیں ہوا، وہ یہ کہ انھوں نے اپنے ذاتی حالات اور اپنے عہد کی سیاسی شورش اور خلفشار کی داستان 'ذکرِ میر' کے نام سے قلم بند کی تھی۔ بابائے اُردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے احسانات سے اُردو زبان ہمیشہ زیرِ بار رہے گی کہ اُنھوں نے کتنے ہی نہایت اہم، نہایت

بیش بہا متون تلاش کر کے شائع کر دیے تھے، اُن کی بدولت ہی میر کی فارسی سوانح عمری "ذکرِ میر" کا متن ہمارے ہاتھوں میں پہنچا۔ آج سے ۶۸ سال قبل ۱۹۲۸ء میں یہ کتاب انجمن ترقی اُردو (ہند)، اورنگ آباد سے ٹائپ میں چھپی تھی۔ بابائے اُردو نے اس کے متن کا مقابلہ مولوی محمد شفیع لاہوری کے نسخے سے بھی کیا، اور متن کو پیش کرنے میں اپنی والی کوشش بھی کی، اِس کی اشاعت کے بعد نصف صدی تک ہمارے اہلِ علم اُس سے استفادہ کرتے رہے۔ مگر تحقیق میں حرفِ آخر کچھ نہیں ہوتا، جب کوئی تلاش کے لیے نکلتا ہے تو حجابات بھی ایک ایک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں اور علم کے خزانوں میں اِسی طرح اضافہ بھی ہوتا ہے۔ بابائے اُردو مرحوم کے اُس زمانے میں جب وہ ذکرِ میر کا فارسی متن شائع کر رہے تھے، اُردو میں متن کی تحقیق و تدوین کا شعور بھی اِتنا رچا ہوا نہیں تھا، وسائل بھی محدود تھے اور اُس کے پڑھنے والوں کا علم بھی اتنا راسخ تھا کہ متن خواہ غلط ہی لکھا ہو، وہ اُس سے صحیح مفہوم برآمد کر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ذکرِ میر (فارسی) کی اشاعت سے ۲۵ سال بعد ۱۹۵۳ء میں ہمارے دوست نثار احمد فاروقی کو اسے اُردو میں ترجمہ کرنے کا خیال آیا۔ اِس کا محرک یہ ہوا کہ اُس زمانے میں مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی پٹنہ سے رسالہ "تہذیب" شائع کرتے تھے اُنھوں نے اُس کی اشاعتِ خصوصی کو میر تقی میر سے مختص کرنے کا ارادہ کیا تھا اور فاروقی صاحب نے یہ ترجمہ "تہذیب" کو بھیجا تھا، مگر وہ "میر نمبر" شائع نہ ہو سکا اور رسالہ بھی بند ہو گیا تو اُس کا مسودہ اُس وقت انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری قاضی عبدالغفار مرحوم کو بھیجا گیا۔ انجمن کے مالی وسائل کی کمی اور قاضی صاحب مرحوم کی گرتی ہوئی صحت نے اسے وہاں سے بھی شائع نہ ہونے دیا تو فاروقی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے اس کی اشاعت کا معاملہ طے کر لیا تھا، اُسی زمانے میں جناب مالک رام نے بھی اُردو ترجمے کا ابتدائی حصہ بہ نظرِ اصلاح دیکھ لیا تھا۔ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے اُس کی کتابت بھی ہو گئی مگر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ حالی پبلشنگ ہاؤس سے بھی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ آخر اسے پہلی بار ۱۹۵۷ء میں مکتبہ برہان دہلی نے شائع کیا۔ چونکہ اس کتاب کے ترجمے کی ضرورت تو ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی، کتاب کو قدردانی کے ہاتھوں نے لیا اور ایک ڈیڑھ سال میں ہی اِس کا پہلا ایڈیشن تمام ہو گیا۔ اُس وقت تک اُردو اکادمیاں تو وجود میں نہیں آئی تھیں اتر پردیش سرکار نے اپنے اعلامیہ X/05114/XV-602/1958 مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۹ء کی رو سے اِس کتاب کو انعام سے بھی نوازا

تھا۔ یہ غالباً اُردو کی پہلی مطبوعہ کتاب تھی جو ۲۰ اگست ۱۹۶۱ء کو پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کی خدمت میں پیش کی گئی اور اخباروں نے بھی اِس خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ اخبار "جنگ" کراچی میں یہ خبر اس طرح چھپی :

اُردو کی کتاب میر کی آپ بیتی

نئی دہلی ۲۸ ستمبر۔ ۱۸ ویں صدی کے اُردو شاعر میر تقی میر کی سوانح حیات "میر کی آپ بیتی" جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے اور جس کو دہلی یونیورسٹی کے جناب نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے وہ وزیر اعظم پنڈت نہرو کو پیش کی گئی۔ یہ کتاب اسی سال حکومت یوپی سے انعام حاصل کر چکی ہے۔"

میر کی آپ بیتی اسی زمانے میں بعض جامعات کے ایم اے کے نصاب میں بھی شامل کی گئی۔

اِس کتاب کا اُردو کی علمی دنیا میں جس گرم جوشی سے استقبال ہوا اُس سے مترجم کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انھوں نے اس کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری ۱۹۶۲ء سے ہی شروع کر دی تھی۔ اب یہ خیال ہوا اس کا فارسی متن بھی شائع ہونا چاہیے۔ اِس مقصد سے ذکرِ میر کے متن کا مطالعہ کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ فارسی متن کی تصحیح کا حق ادا کرنا ابھی باقی ہے انھوں نے اس کا مقابلہ نسخہ رامپور سے کیا اور ممکن حد تک مطبوعہ متن کی غلطیوں کو دور کر دیا۔ اِس کے نتیجے میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ترجمے پر بھی نظرِ ثانی کی جائے یہ کام نثار صاحب نے اتنی دقیقہ رسی اور ایسی محنت سے کیا کہ اب اِس ترجمے کا پہلی اشاعت سے کوئی واسطہ نہ رہا، اِسے بالکل نیا ترجمہ ہی سمجھنا چاہیے جو سلیس، با محاورہ اور شگفتہ بھی ہے، وفادار بھی، کہیں تو فارسی اور اُردو کی عبارتیں لفظ و معنی اور اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے بالکل یک جان و دو قالب، نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند فقرے کسی انتخاب کے بغیر لکھتا ہوں جس سے متن کے ساتھ ترجمے کی چسپیدگی کا اندازہ کرنا دشوار نہ ہوگا۔

فارسی متن	اُردو ترجمہ
اے عزیز اگر آں محبوب سراپا ناز پیشِ چشم است بہشتِ جاوید۔ واگر از نظر رفت ، ہماں دوزخِ عاشق	اے عزیز اگر وہ ناز کا چھب والا آنکھوں کے سامنے ہے تو یہی بہشتِ جاوید کا عالم ہے ،اگر وہ نظروں سے

نا اُمید۔ بدان کہ سرِ کلافہ پیدا نمی شود یعنی بر ما ہیچ ہویدا نیست۔ نمی دانم کہ زاہدانِ ریاضت پیشہ چہ در سر دارند و بیخودانِ شوقِ آن مستِ سرانداز کہ خبر؟ جمعے را خلشِ خواہشے جماعتے را کاوشِ کاہشے۔ کسانیکہ حق شناس اند مُبرّا از اُمید و یاس اند عزیزانیکہ با خدا ایند، دلدادگانِ رضا ایند۔ جانِ عاشقاں راکہ بہ تلخی کار است، خونِ ایشاں شیریں بسیار است۔ رنج را بر خود گوارا کن کہ تا شایانِ راحت شوی۔ کار را بسیار با خود تنگ بگیر تا بہ فراغت روی۔

اوجھل ہوا تو یہی عاشق نا اُمید کا جہنم ہے۔ جان رکھو حقیقت کا اُور چھور نہیں ملتا یعنی ہمیں کچھ پتا نہیں۔ کیا جانے زاہدانِ پیشہ کیا ٹھانے ہوئے ہیں اور اُس مستِ سرانداز کے متوالے کیا جانے ہوئے ہیں۔ ایک جماعت کو خواہش کی خلش ہے تو دوسری کو کاہش کی کاوش مگر جو حق شناس ہیں، وارستۂ اُمید و یاس ہیں۔ وہ عزیز جو خدا کے ہو گئے اُس کی رضا میں کھو گئے۔ عاشقوں کی جان کو تلخیوں سے ضرور پالا پڑا ہے مگر اُن کا خون میٹھا بڑا ہے۔ رنج گوارا کرو کہ اپنے تئیں شایانِ راحت بنا سکو، کڑیاں جھیلو کہ بہ فراغت یہاں سے جا سکو۔

دوسرے ایڈیشن کے لیے متن کی تصحیح اور ترجمے پر مکمل نظرِ ثانی کے ساتھ ہی نثار صاحب نے جابجا نہایت ضروری اور مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔ لیکن اس میں ایک کمی بھی رہ گئی۔ اس دوسرے ایڈیشن کے لیے مترجم نے ایک مفصل مقدمہ لکھا تھا جو اُن کے ۲۰۔۲۵ سال کے مطالعے کا حاصل تھا اور فارسی متن کی نہایت مفصل فرہنگ تیار کی گئی تھی جس سے ایک ایک لفظ کی تشریح اور وضاحت ہو جاتی تھی۔ ابتدا میں اس اشاعتِ ثانی کا کام بھی مکتبہ بُرہان دہلی ہی نے کرایا تھا لیکن اِس عرصے میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کا انتقال ہو گیا اور اب یہ ادارہ زبوں حالی کا شکار ہونے لگا۔ جواہلِ قلم مکتبہ برہان سے محض اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے وابستہ تھے وہ ایک ایک کر کے الگ ہو گئے۔ نثار صاحب نے بھی کتابت شدہ اوراق کی اُجرت ادا کر کے اُنھیں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سپرد کر دیا۔ لیکن اس مرحلے میں اندازہ ہوا کہ انھیں فرہنگ کے ۴۰ صفحات اور مقدمے کے تقریباً ۵۰ صفحات نہیں دیے گئے۔ وہ نہ بہ زوری نہ بہ زاری نہ بہ زر کسی طرح حاصل نہ ہوئے تو انھوں نے مقدمہ اور فرہنگ کو دوبارہ لکھنا چاہا مگر وہ آمد تھی تو یہ آورد والی بات تھی۔ مقدمے میں بہت سے مسائل

اُس ترتیب و تفصیل سے نہ آسکے اور فرہنگ بھی ناقص ہی رہ گئی۔ لیکن اُمید ہے ان شاء اللہ آیندہ ایڈیشن کے لیے نثار صاحب اِن دونوں حصّوں کو اور زیادہ جامع بنا دیں گے۔

اُردو کے ادبی حلقوں کو ذکرِ میر سے انجمن نے ہی متعارف کرایا تھا، انجمن پریس نے ہی ۱۹۲۸ء میں اِس کا متن چھاپا تھا۔ اب ذکرِ میر کے تصحیح شدہ فارسی متن اور اُس کے ترجمے کو چھاپنے کا حق بھی سب سے زیادہ انجمن ہی کا بنتا تھا، اِس لیے ہماری ادبی کمیٹی نے اِسے بہ خوشی منظور کیا اور مجھے فخر ہے کہ یہ کتاب نئی شان کے ساتھ پھر انجمن سے ہی شائع ہو رہی ہے۔

اہلِ نظر نے اس کے پہلے ایڈیشن کا بھی شناسانہ اعتراف اور استقبال کیا تھا، اب یہ نیا ایڈیشن نئی زیبایش اور آرایش کے ساتھ آرہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ علمی حلقوں میں اِس کی پذیرائی ہوگی۔

۴ر جون ۱۹۹۶ء

خلیق انجم

مقدمہ

میرؔ اردو شاعری کے "پیمبر" نہیں، خدا ہیں، اور اُن کی "خدائی" کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی "بندگی" کا اظہار کیا ہے، جن کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، بلکہ متضاد ہے۔ بھلا ناسخؔ اور غالبؔ اور ذوقؔ میں کوئی وجہِ مشترک خیال میں آسکتی ہے؟ لیکن اِس کے باوجود اِن تینوں نے میرؔ کی برتری اور اُستادی کا اعتراف کیا ہے۔ کس کا جی نہیں چاہے گا کہ اِس خدائے سخن کے حالات تفصیل سے معلوم کرے۔ ہماری خوش قسمتی کہ میرؔ نے خود اپنے حالات "ذِکرِ میرؔ" کے عنوان سے فارسی میں لکھ دیے تھے اور حسنِ اتفاق سے یہ کتاب دستِ بُردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی۔ زیرِ نظر کتاب اسی خود نوشت سوانحِ عمری کا اردو ترجمہ ہے۔ چونکہ اصل فارسی نسخہ بھی اب کم یاب ہے، اِس لیے اردو دنیا کو مترجم کا شکرگزار ہونا چاہیئے، کہ اُنھوں نے اِسے اُردو میں منتقل کر کے اس سے استفادے کا حلقہ وسیع تر کر دیا۔

اِس کتاب کی اہمیت دوگونہ ہے۔ ایک اَنفُسی، دوسری آفاقی۔ اَنفسی یہ کہ اس سے میرؔ کے اپنے حالات، جن سے متعلق کسی شبہے کا امکان نہیں، کم و بیش تفصیل سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ میرؔ ۱۱۹۶ھ میں دہلی سے لکھنؤ گئے۔ اُن کی پیدائش غالباً ۱۱۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ گویا سفرِ لکھنؤ کے زمانے میں اُن کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ہمارے پاس اِن ساٹھ برس کے حالات کا "ذکرِ میرؔ" سے زیادہ مستند اور کوئی ماخذ نہیں۔

تذکرہ نویسوں نے عام طور پر، اور مولانا محمد حسین آزادؔ نے آبِ حیات میں خاص طور پر، جو باتیں میرؔ سے متعلق لکھی ہیں، اُن سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

ان کی اصلاح "ذکرِ میر" سے ہوجاتی ہے۔ مثلاً اس سے یقینی طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اُن کے والد کا نام میر محمد علی تھا، اور وہ اپنے زُہد و اِتّقا کے باعث میر علی متّقی کے عُرف سے مشہور تھے (ص ۵۰) اِسی سے معلوم ہوا، کہ وہ واقعی سید تھے اور جن لوگوں نے اُن کی سیادت پر شبہہ کیا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ آزاد نے آبِ حیات میں غالباً خود میر کے ایک بیان (نکات الشعرا، ص ۴) پر بھروسا کر کے اُنھیں خانِ آرزو کا شاگرد لکھا ہے، جو اُن کے سوتیلے ماموں بھی ہوتے تھے۔ اِس کتاب سے معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ کہ وہ اُن کے استاد نہیں تھے، بلکہ اُنھوں نے اِن کی تعلیم و تربیت میں کسی طرح کی دل چسپی ہی نہیں لی اور اپنے بھانجے میر محمد حسن (یعنی میر کے سوتیلے بڑے بھائی) کی انگیخت پر اُن سے بہت بدسلوکی کی (ص ۱۱۴) میر، بلکہ اردو ادب پر بہت بڑا احسان میر سعادت علی امروہوی کا ہے، جن کے کہنے پر میر نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ میر سعادت علی خود بھی شعر کہتے اور سعادت تخلص کرتے تھے۔ اُن کا نام تقریباً تمام تذکروں میں ملتا ہے۔ "ذکرِ میر" کے الفاظ بہت واضح نہیں، لیکن پھر بھی ان سے اتنا بآسانی مستنبط ہوتا ہے کہ میر نے اُن سے مشورہ کیا اور کلام پر اصلاح لی۔ (ص ۱۱۷) بلکہ اسی مقام سے کچھ ایسا خیال گذرتا ہے کہ غالباً میر اس سے پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ آزاد نے میر کے سفرِ لکھنؤ کے جو حالات لکھے ہیں، اُن میں داستان کا لطف ہے، لیکن "ذکرِ میر" دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل بے اصل ہیں۔ میر نے لکھنو کا سفر خود نواب وزیر آصف الدولہ کی دعوت پر کیا تھا۔ آصف الدولہ نے سالار جنگ کے ذریعے زادِ راہ بھیج کر اُنھیں بلوایا تھا (ص ۱۹۵) یہ وہاں پہنچ کر سالار جنگ کے دولت کدے ہی پر اُترے۔ اب اس کے بالمقابل آبِ حیات کا متعلقہ مقام دیکھیے تو افسانہ و حقیقت کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اِس طرح کی کئی تفصیلات ہیں، جن کی اِصلاح "ذکرِ میر" سے ہوتی ہے۔

میر کے ذاتی حالات کے علاوہ یہ کتاب ہندستان کی اُس دور کی تاریخ کا بھی

بہت اچھا ماخذ ہے۔ افسوس کہ ہمارے مؤرخوں کا دھیان اِس طرف نہیں گیا۔ یہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کی تاخت وتاراج اور اندرونی امیروں کی خانہ جنگی اور پیشِ قدمی نے سلطنتِ مغلیہ کا حال بہت پتلا کر رکھا تھا۔ بادشاہِ دہلی کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں تھی۔ جو شخص بھی اپنی ذاتی قابلیت اور ریشہ دوانیوں سے یا اپنے حلیفوں کی مدد سے وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو جاتا، دراصل وہی حکمرانِ وقت تھا۔ احمد شاہ درانی نے یکے بعد دیگرے متعدد حملے کیے۔ یہاں ملک کے اندر افغانوں اور مرہٹوں اور جاٹوں نے وہ اودھم مچا رکھی تھی کہ خلقِ خدا اُن کے ظلم وستم سے پناہ مانگتی تھی۔ یہ تمام حالات نہ صرف میرؔ کے سامنے پیش آئے، بلکہ وہ خود اِس "دریاے خون کے شناور" رہے۔ اور کتنے معرکوں میں تو بذاتِ خود موجود تھے۔ اِن خانہ جنگیوں کی بعض تفصیلات جو اُنھوں نے قلم بند کی ہیں، وہ کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں اور ضرورت ہے، کہ اِس پہلو سے اِس کتاب کا مطالعہ غائر نظر سے کیا جائے۔

لیکن اِن باتوں کے علاوہ اِس کتاب کی ایک اور خصوصیت بھی نظرانداز کر دینے کے قابل نہیں۔ اِس میں اخلاقی اور روحانی تعلیم ایسے سادہ اور دل نشین انداز میں بیان کی گئی ہے کہ اُس سے بہتر بہت کم کسی اور جگہ دیکھنے میں آئی۔ اخلاق اور روحانیت کوئی نظری چیز نہیں، یہ سراسر عملی حقیقت ہے۔ اگر آپ اِن تعلیمات پر عمل نہیں کرتے، تو اِن کی صرف زبانی تلقین یا اِن پر ذہنی ایمان نہ کافی ہے، نہ مفید۔ میرؔ ایک اہلِ علم عرفان خاندان کے نام لیوا تھے۔ اُن کے والد میر علی متقی برگزیدہ درویش اور صاحبِ رُشد وہدایت صوفی تھے، اِس لیے اگر وہ اِن مسائل پر گفتگو کریں اور اپنے حلقہ نشینوں کو یا خود میرؔ ہی کو پند ونصیحت کریں، تو اُن پر بے عملی کا الزام نہیں لگ سکتا، کہ کوئی اُن سے کہے "تو بُرونِ در چہ کردی، کہ درونِ خانہ آئی" یہی سبب ہے کہ میرؔ کے والد یا چچا نے جو تعلیم اُنھیں دی، اُس کا لفظ لفظ خلوص سے پُر اور ناخن بدل

ہے۔ چوں کہ یہ باتیں دل سے نکلی ہیں، اِس لیے دل پر اثر کرتی ہیں، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کس ماحول میں پیدا ہوئے اور کس پائے کے بزرگوں کی نگرانی میں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اِس سے میرؔ کی زندگی اور ان کا مزاج اور کلام سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

اِن اسباب سے میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بہت اچھا ہوا، جو "ذکرِ میر" کا ترجمہ اردو میں ہو گیا۔ جناب نثار احمد فاروقی نے بحیثیت مترجم اپنا فرض بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ انھوں نے اصل کے مطالب سے کہیں انحراف نہیں کیا، ترجمہ کی زبان بھی شگفتہ اور سلیس اور بامحاورہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو داں طبقہ اس کتاب سے پورے طور پر مستفید ہوگا۔

مالک رام

نئی دہلی

۳۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ابتدائیہ

(طبعِ اوّل)

اُردو میں میر تقی میر کا شاعرانہ مرتبہ تعریف یا تعارف سے بہت بلند ہے، اور اس حیثیت سے اُن کی ادبی اوّلیت مسلّم ہے کہ انھوں نے اُردو غزل کو نیا رنگ و آہنگ اور منفرد لب و لہجہ عطا کیا۔ اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ ان کا تذکرہ نکات الشعرا بھی اُردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اب تک جتنے تذکرے دریافت ہوئے ہیں اُن میں قدیم ترین مانا جاتا ہے۔ ان سے پہلے اگر کسی نے شعرائے اُردو کا کوئی تذکرہ لکھا بھی ہو تو وہ اب محفوظ نہیں[1]۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میر اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خود اپنی سوانح عمری لکھی اور وہ محفوظ رہ گئی۔

فارسی متن

اصل کتاب فارسی میں ہے اس کا ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۸ء) کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ خان بہادر مولوی بشیر الدین مرحوم بانی مسلم ہائی اسکول اٹاوہ کو ملا تھا۔ پہلی بار ۱۹۲۶ء میں اُس کا ملخّص اُردو ترجمہ مولوی عبدالحق نے سہ ماہی اُردو، میں چھاپا، پھر ۱۹۲۸ء میں فارسی متن بھی اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ ٹائپ میں چھاپا گیا تھا جس میں ۶ صفحے فہرس کے ۲۰ مقدمے کے اور ۱۵۳ متن کے ہیں۔ اِس میں طباعت

---

[1] اس کتاب کی اشاعت (۱۹۵۷ء) کے بعد میں نے ایک مضمون "تذکرۂ معشوق چہل سالہ" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اوّلیت قائم چاندپوری کے تذکرۂ مخزن نکات کو حاصل ہے۔ یہ مضمون میری کتاب "تلاش میر" میں شامل ہے۔

کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں اور ترتیب کے نقائص سے بھی خالی نہیں۔

نسخۂ لاہور

ذکرِ میر کے تین قلمی نسخے اب تک دریافت ہوئے ہیں۔ ایک تو یہی اٹاوے کا، دوسرا نسخۂ لاہور، جو پروفیسر محمد شفیع کی ملکیت ہے۔ یہ مطبوعہ متن کی تصحیح کے وقت مولوی عبدالحق کے پیش نظر رہا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اُس کے اختلافات کا اچھی طرح مقابلہ نہیں کیا۔ پروفیسر محمد شفیع کا یہ نسخہ ۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۳۱ھ مطابق ۲۷ فروری ۱۸۱۶ء یعنی سنہ جلوس اکبر ثانی کا لکھا ہوا ہے۔ نسخہ اٹاوہ میں جس پر مطبوعہ متن مبنی ہے، میر نے خاتمے میں اپنی عمر ۶۰ سال لکھی ہے لیکن نسخۂ لاہور میں اس کی جگہ ۵۰ سال ہے اور مطبوعہ فارسی متن کے صفحہ ۲۱۴ (ترجمہ ہذا کے صفحہ ۱۸۲) میں جہاں

این شامتِ اعمال قیامت بسر آورد

آیا ہے نسخۂ لاہور میں اُس کے بعد یہ عبارت ملتی ہے:

"آنچہ از اُسلوب معلوم می شود، حسام الدین خاں دراصل از میان رفت، چراکہ بدستِ دشمنانِ جانی اُفتادہ است، تا بمقدور زندہ نخواہند گزاشت۔"

پھر خاتمے کی عبارت اور قطعہ تاریخ ہے اور چند لطیفے دیے ہیں، جن کے بارے میں مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ فحش ہیں اس لیے طباعت کے وقت کتاب سے خارج کر دیے گئے۔

نسخۂ رامپور

ذکرِ میر کا دوسرا خطّی نسخہ کتاب خانہ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے، جو رمضان ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) کا مکتوبہ ہے اسے شیخ لطف علی حیدری نے نقل کیا ہے اور اُس میں:

این شامتِ اعمال قیامت بسر آورد

کے بعد یہ عبارت ہے:

"آنچہ ظاہر است حسام الدین خاں درحقیقت از میان رفت چراکہ بدستِ

دشمنانِ جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہند گزاشت۔ بیشتر اختیار خدا است کہ او بر ہمہ چیز قادر است۔"

رامپور کے نسخے میں کتاب کا اختتام میرؔ نے اپنی عسرت اور تنگ دستی کے دلدوز بیان پر کیا ہے جو نہ اٹاوے کے نسخہ میں ہے نہ لاہور کے۔ وہ عبارت یہ ہے:

"احوالِ فقیر از سہ سال آن کہ چوں قدر دانے درمیان نیست و عرصۂ روزگار بسیار تنگ است توکل بخدائے کریم کہ اُو رزاق ذی القوۃ المتین است، کردہ بخانہ نشستہ ام ظاہر از اسباب باعزہ چند مثل ابوالقاسم خاں برادر خُرد عبدالاحد خاں مجدالدولہ و وجیہہ الدین خاں برادر حُسام الدین خاں و بیرم خاں صاحب خلف الصدق بہرام خاں کلاں کہ درآدمی رُوشی یکتائے روزگارِ خود اند و قطب الدین پسر سعدالدین خاں خاتساماں اگرچہ بستش کم است . . . و خالی از سعادت مندی نیست و قاضی لطف علی خاں کہ آدمیانہ می زید گاہ گاہ ملاقات کردہ می آید خواہ از دستِ ایشاں انتفاعے رسد یا نرسد۔ مایۂ توکل ہمیں صاحبان اند و گاہے این چنین ہم اتفاق می شود کہ کسے فقیر و شاعر و متوکل دانستہ بطریقِ نذر چیزے می فرستد محلِ تشکر است۔ اکثر قرض دارمی باشم و بہ عُسرتِ تمام بسر می کنم۔"

نسخۂ رام پور کے خاتمے میں بھی مطبوعہ نسخے کے برخلاف اور نسخۂ لاہور کے مطابق میرؔ نے اپنی عمر ۵۰ سال لکھی ہے۔ ۱۱۳۵ھ اُن کا سالِ ولادت تسلیم کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا یہ احوال اُنھوں نے ۱۱۸۵ھ کے بعد لکھا ہے۔ اگر یہ اضافہ انھوں نے لکھنؤ میں کیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دربارِ اودھ سے وابستہ ہونے کے بعد بھی میرؔ کی تنگ دستی اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ اٹاوے کا نسخہ میرؔ کی زندگی میں نقل ہوا ہے اور نسخۂ رام پور ۱۲۴۶ھ میں یعنی میرؔ کی وفات سے تقریباً ۲۱ برس کے بعد لکھا گیا۔ اِس سے یہی قیاس ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا عبارت میرؔ نے لکھنؤ کے قیام میں بڑھائی ہوگی۔ ورنہ ۱۲۲۲ھ کا نسخہ اس سے خالی نہ ہوتا۔

<u>زمانۂ تصنیف</u> : ذکرِ میرؔ کی تصنیف کا آغاز کب ہوا، اس بارے میں کوئی قطعی رائے قائم

نہیں کی جاسکتی، میرا اپنا خیال ہے کہ میرؔ نے اُسے ۱۱۸۵ھ سے بہت پہلے لکھنا شروع کردیا تھا اور آخر عمر تک اس میں اضافہ و ترمیم کرتے رہے لیکن قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا، پٹنہ، فرماتے ہیں کہ کتاب ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ لکھنا شروع کی گئی۔ میرؔ نے اس کے اختتام کی تاریخ اِس قطعے سے نکالی ہے:

مسمّٰی باسمی شد اے باہنر
کہ این نسخہ گردد بعالم سَمَر
ز تاریخ آگہ شوی بے گمان
فزائی عدد لیست و ہفت ایران

کتاب کے نام "ذکر میر" سے ۱۱۷۰ھ نکلتے ہیں جس میں ۲۷ جمع کرنے سے ۱۱۹۷ھ حاصل ہوں گے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب میں اس سنہ کے بعد کے واقعات بھی درج ہیں یعنی غلام قادر روہیلہ کے مظالم کا بیان جو ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) کا واقعہ ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں۔

"..... میرا قیاس ہے کہ یہ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں شروع ہوئی۔ نسخہ لاہور کا انجام بظاہر ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۲ء) میں اور نسخہ آناوہ ظاہرا ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) میں تمام ہوا، آغازِ کتاب کے بارے میں میرا قیاس صحیح ہے تو کتاب کا بیشتر حصّہ (نسخہ مطبوعہ میں صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۲۰ تک) کاماں میں قلم بند ہوا ہے محض چند صفحے (صفحہ ۱۲۱ سے ۱۲۸ سطر ۴) دہلی میں اور باقی لکھنؤ میں...."

واقعات کی کیفیت:

اس کتاب میں ابتدائی حصّہ میرؔ کے والد اور منہ بولے چچا کی تعریفوں اور مسائلِ تصوّف سے بھرا ہوا ہے اس میں نہایت شاعرانہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے میرؔ کے والد یا "چچا" امان اللہ اتنے بڑے صوفی اور بزرگ نہ تھے کہ "خلقِ خدا، اُن کے آستانے کی خاک بطورِ تبرک" لے جاتی یا وہ آسمانِ درویشی کے آفتاب و ماہتاب ہوں، اِس میں میرؔ نے جی کھول کر مبالغے سے کام لیا ہے۔

میرؔ کو اپنے باپ اور چچا کا سایہ ۱۱-۱۲ برس سے زیادہ نصیب نہیں ہوا لیکن انھوں نے

میرامان اللہ کے ساتھ بعض درویشوں کی صحبت میں جانے کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے اقوال و اشعار نقل کیے ہیں مگر جن دنوں کی یہ باتیں ہیں اُس وقت میر کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی، پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنا کم سن بچّہ درویشوں کے صوفیانہ اقوال کو اس طرح سمجھ سکے کہ تقریباً تیس چالیس سال کے بعد جب وہ اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھے تو انھیں من وعن نقل کر دے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ سارے واقعات میر کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں ممکن ہے کہ خارج میں احسان اللہ اور بایزید وغیرہ کا وجود رہا ہو لیکن اُن سے جو ملفوظات روایت کیے گئے ہیں اُن کا بیشتر حصّہ جعلی اور اختراعی ہے، یہ شبہ یقین کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک فقیر احسان اللہ کی خدمت میں اپنے چچا کے ساتھ جانے کا حال لکھا ہے۔ یہ اُس درویش سے اُن کی آخری ملاقات تھی۔ اُس دن شام کو نصرت یار خاں صوبہ دارِ آگرہ آکر قدم بوس ہوا، اور پانچ اشرفیاں نذر کر کے چلا گیا وغیرہ۔ قطع نظر اس سے کہ نصرت یار خاں کے صوبہ دارِ آگرہ ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں، اُس کی تاریخ وفات جیسا کہ ہم نے ترجمے کے حاشیے میں لکھ دیا ہے ۱۱۳۴ھ ہے اور میر اس کی وفات سے بھی ایک سال بعد پیدا ہوئے ہیں اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ میر سے نام لکھنے میں سہو ہوا ہے تب بھی یہ باتیں زیادہ قابلِ قبول نہیں۔

کتاب کا جو حصّہ امیر الامرا صمصام الدولہ کے دربار سے وظیفہ مقرر ہونے اور اُس کے بعد کے حالات و حادثات سے متعلق ہے وہ البتہ تاریخی حقائق ہیں۔ اور دوسری تاریخوں سے زیادہ مستند سمجھے جا سکتے ہیں۔

ادبی حیثیت :

مولوی عبدالحق نے میر کی فارسی کی تعریف کی ہے، اور اُن کی نثر کو سادہ و شیریں بتایا ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس کا ابتدائی حصّہ میر نے خاصی محنت سے لکھا ہے اور اُس دور کے "مرزایانِ ایران" کی نقل کے شوق میں عبارت کو اتنا ادق بنا دیا ہے کہ بعض الفاظ کی تشریح خود انھیں حاشیے پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میر نے اپنے "چچا" کی وفات سے قبل اسد اللہ کے 'کبود جامہ' سے آنے کا تذکرہ کیا ہے، 'کبود جامہ' کے بارے میں صرف

"چراغِ ہدایت" سے یہ علم ہوا کہ ایک شہر کا نام ہے لیکن نہایت تلاش و تحقیق کے بعد بھی اُس کا جغرافیہ معلوم نہ ہو سکا۔ ذکرِ میر کے الفاظ اور محاورے چراغِ ہدایت کے سوا کسی دوسری لغت میں مشکل سے ملتے ہیں۔

"ذکرِ میر" سے متعلق بہت سے گوشے ایسے ہیں جن پر تفصیل سے بحث کی جا سکتی ہے لیکن میں نے اُسے یہاں قصداً قلم انداز کر دیا ہے پھر کبھی علیحدہ مضمون کی شکل میں پیش کروں گا۔

ترجمے کی کیفیت :

اب چند باتیں اِس ترجمے کے متعلق عرض کر دوں، اسے میں نے ۱۹۵۱ء کے اواخر میں شروع کیا تھا اور یہ ۱۹۵۳ء میں ختم ہوا، اس کے بعد گاہے گاہے اس پر نظرِ ثانی کرتا رہا، پہلے یہ آزاد ترجمے کی شکل میں لکھا گیا تھا، لیکن محترمی مالک رام صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اس پر دوبارہ محنت کی۔ اب کی بار اسے لفظی ترجمے میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور لگے ہاتھوں چند ضروری حواشی بھی لکھ دیے۔ لیکن اب بھی مجموعی طور سے یہ کام جیسا میں چاہتا ہوں ویسا نہیں ہے۔ اس میں بعض خامیاں رہ گئی ہیں جن کا مجھے احساس ہے لیکن اُن کی تلافی اِس وقت ممکن نہ تھی جب کہ کتاب کتابت کے مرحلوں سے چند بار گزر چکی ہے۔

شکریہ

یہ ایک قدیم رسم ہے کہ کتاب کے سلسلے میں جن لوگوں سے مدد ملی ہو اُن کا شکریہ ادا کیا جائے، مگر میں یہ سطور اس رسم کی پیروی میں نہیں لکھ رہا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ یہ بُری بھلی جیسی کوشش بھی ہے، میں اس کا اہل نہیں تھا، اگر میرے بعض بزرگوں اور دوستوں کی ہدایتیں اور مشورے شریک نہ ہوتے۔

میرے محترم جناب مالک رام نے کتاب کے ابتدائی نصف حصّے پر بڑی توجہ سے نظرِ ثانی فرمائی اور گراں قدر مشورے دیے۔ پھر اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر جامع مقدمہ لکھا ــــ یوں بھی وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے ہیں، میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور محض شکریہ

کے چند الفاظ اُن کی عنایتوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتے۔

اسی طرح مولانا امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتاب خانہ عالیہ رامپور اور قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ پٹنہ نیز حضرت نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے احسانات سے بھی میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کہ یہ بزرگ "بُعدِ منزل" کے باوجود خط و کتابت کے ذریعے مجھے ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے ہیں۔ اِس کتاب میں اگر کوئی خوبی ہو تو اِنھیں حضرات کا فیض ہے اور خامیاں میری اپنی ہیں۔

احباب میں جناب شاہد علی خاں دلی شکریے کے حق دار ہیں، اُنھوں نے ابتداً سے کتاب کی طباعت میں گہری دلچسپی لی اگر اُن کی توجہ نہ ہوتی تو شاید یہ کتاب ابھی اور تاخیر سے شائع ہوتی۔

میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا بھی تہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے سنجیدہ علمی کتابوں کی ناقدری کے اِس دَور میں اِس کی اشاعت کا سروسامان کیا۔ میرے دوست اور مشہور حُسن کار جناب اندر جیت نے کتاب کا سادہ و دلکش سرورق بنایا، اور جناب محمد شفیع دہلوی نے دلچسپی سے کتابت کی ہے اِن دونوں حضرات کا بھی ممنون ہوں۔

نثار احمد فاروقی

۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء

یونیورسٹی لائبریری۔ دہلی۔۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

ابتدائیہ

(طبعِ ثانی)

میر محمد تقی میرؔ اُردو کے میرِ مجلس ہیں اور اساتذۂ متقدمین میں وہ پہلے شاعر ہیں جس نے اپنی سوانح عمری فارسی زبان میں ذکرِ میرؔ کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب دستبردِ حوادث سے بچ گئی اور اِس کے چند قلمی نسخے متفرق ذخیروں میں محفوظ رہ گئے[1] مگر ایک طویل زمانے تک یہ منظرِ عام پر نہ آسکی۔ میرؔ کی وفات کے ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) برسوں کے بعد اس کا متن بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد دکن سے شائع کیا، اس کے مشمولات کا خلاصہ اُردو زبان میں رسالہ اُردو (سہ ماہی) میں شائع ہوا تھا۔ متن کی اشاعت کے (۳۰) سال بعد میں نے اِسے اُردو میں منتقل کیا اور یہ ترجمہ ۱۹۵۷ء میں مکتبہ برہان دہلی سے شائع ہوکر علمی حلقوں میں اتنا مقبول ہوا کہ پہلا ایڈیشن ایک ڈیڑھ سال کی مدت میں ہی ختم ہوگیا۔ اِس کی دوسری اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی اور یہ تقریباً (۴۰) سال کے بعد دوبارہ شائع ہورہی ہے اِس تاخیر کے بہت سے اسباب ہیں جن میں بعض نہایت تلخ بھی ہیں۔

پہلی اشاعت صرف اُردو ترجمے کی شکل میں "میر کی آپ بیتی" کے نام سے شائع ہوئی تھی دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے ساتھ مجھے یہ خیال آیا کہ فارسی متن بھی تصحیح و تدوین کا تقاضا کرتا ہے

---

[1] ذکرِ میر کے بعض خطّی نسخوں کی کیفیت طباعتِ اوّل کے مقدمے میں دیکھی جائے۔ اس میں دو معلوم نسخوں کا اضافہ اور کیا جاسکتا ہے ان میں سے ایک نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم (لکھنؤ) کے کتب خانے میں ہے، دوسرا نسخہ گوالیار میں ہے۔

مولوی عبدالحق نے اس کے صرف ایک اور قلمی نسخے سے مقابلہ کر کے بعض اختلافات حواشی میں درج کر دیے تھے۔ میں نے نسخہ رامپور رضا لائبریری سے اس کے ایک ایک لفظ کا مقابلہ کیا۔ مگر دو اور نسخوں تک میری رسائی نہ ہو سکی جن میں سے ایک گوالیار میں بتایا جاتا ہے۔

تصحیح متن اور مقابلے سے ظاہر ہوا کہ فارسی متن کی پہلی اشاعت میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں جنھیں محض طباعت کی غلطی نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ اندازہ ہوا کہ میر نے فارسی جدید لکھنے کے شوق میں چراغِ ہدایت کو سامنے رکھا ہے۔ میر کی آپ بیتی کے مقدمہ میں پہلی بار میں نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ "ذکرِ میر کے الفاظ اور محاورے چراغِ ہدایت کے سوا کسی دوسری لغت میں مشکل ہی سے ملتے ہیں" (طبع اول ص ۲۲)

میں نے ذکرِ میر کے الفاظ اور محاوروں کی فرہنگ بہت تفصیل سے تیار کی، جس میں چراغِ ہدایت کے علاوہ سیالکوٹی مل وارستہ کی مصطلحاتُ الشعراء، ٹیک چند بہار کی بہارِ عجم، غیاث الدین رامپوری کی غیاثُ اللغات سے بھی استفادہ کیا۔ مگر ان تینوں لغت نویسوں نے بھی اکثر الفاظ کی تشریح چراغ ہدایت ہی کی روشنی میں کی ہے۔ اِن کے ساتھ ہی ڈاکٹر علی اکبر دہخدا کے "لغت نامہ" سے مدد لی گئی تو ذکرِ میر میں استعمال شدہ ایک ایک لفظ واضح ہو گیا تھا۔ مگر وہ پوری فرہنگ ضائع ہو گئی اب اس کتاب کے آخر میں جو فرہنگ دی جا رہی ہے وہ میں نے دوبارہ محنت کر کے قدرے عجلت میں تیار کی ہے۔ اِس کے مطالعے سے یہ ظاہر ہو گا کہ ذکرِ میر میں جو محاورۂ اہلِ ایران کا استعمال ہوا ہے اُس کا دو تہائی سے زیادہ حصہ چراغ ہدایت کا مرہونِ منت ہے۔

سراج الدین علی خان آرزو (متوفی ۱۱۶۹ھ/۵۶-۱۷۵۵ء) ماہرِ السنہ اور لغت نویس بھی ہیں۔ اُن کے زمانے میں فارسی لغات میں فرہنگِ جہانگیری، بُرہانِ قاطع، فرہنگِ رشیدی، مجمع الفرس سروری وغیرہ سے رجوع کیا جاتا تھا، مگر آرزو نے محسوس کیا کہ ان کتبِ لغات میں بھی غلطیاں ہیں اور ان پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کیا جا سکتا، اُنھوں نے سراج اللغۃ کی تالیف کی جس میں اپنے پیش رو لغت نویسوں پر کھل کر تنقید بھی کی ہے۔ اِس نقص کے احساس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ آخر عہدِ مغلیہ میں بہت سے ایرانی شعراء اور اہلِ قلم ہندوستان آ گئے تھے جن کا کچھ احوال لچھمی نراین شفیق کے تذکرۂ شامِ غریباں[1] میں دیکھا جا سکتا ہے، اِن شعراء سے بعض ہندستانی

---

[1] مرتبہ اکبر الدین صدیقی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۷ء

شاعروں کا مباحثہ و مناظرہ بھی ہوا۔ خود آرزو اور شیخ علی حزیں کا معرکہ ہمیں معلوم ہے[1]۔ ہندوستان کے فارسی داں علماء اور فارسی گو شعرا، اپنے قدیم فارسی سرمائے پر قانع تھے جدید فارسی محاورات سے انھیں واقفیت نہیں تھی تو وہ ان ایرانی اہل زبان کے سامنے خود کو "ناخواندہ" محسوس کرنے لگے تھے۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ہندوستانی فارسی گو شعراء کی خاصی تعداد رفتہ رفتہ ریختہ گوئی کی طرف چل پڑی اس سے اردو شاعری میں نئی توانائی آ گئی۔ دوسری طرف خانِ آرزو اور ٹیک چند بہار جیسے علمائے فارسی زبان نے جدید فارسی محاورات کی جمع آوری اور ایک جامع لغت کی ترتیب و تدوین کو ضروری سمجھا تو لغت نویسی کے کام میں پیش رفت ہوئی۔

خانِ آرزو نے چراغ ہدایت کو[2] سراج اللغۃ کے حصہ دوم کے طور پر لکھا۔ سراج اللغۃ جو تقریباً چالیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے ۱۱۴۷ھ/ ۳۴-۱۷۳۳ء میں تکمیل پا چکی تھی اس کے بعد ہی آرزو نے چراغ ہدایت کی تالیف کا منصوبہ بنایا ہوگا۔

میر کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ ۱۱۳۵ھ/۲۳-۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے ۱۱۴۶ھ ستمبر ۱۷۳۳ء میں اُن کے والد محمد علی عرف علی متقی کا انتقال ہوا، اس کے بعد ہی کسی وقت وہ تلاشِ معاش کے لیے دہلی آئے اور فیض میر کی آخری حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ میاں محمد سعید خاں نامی ایک درویش صفت انسان سے ملے جو عوام ہی میں نہیں اُمراء کے حلقے میں بھی مقبول تھے۔ ذکرِ میر سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ محمد باسط انھیں صمصام الدولہ امیر الامراء (شہادت، ۱۷ فروری ۱۷۳۹ء/ ۹ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ) کی خدمت میں لے گئے جنھوں نے ایک روپیہ روز اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا[3] اگر یہ ملاقات ۱۱۴۸ھ

---

[1] شیخ علی حزیں اصفہانی عہدِ محمد شاہ میں ہندوستان آئے تھے۔ انھوں نے یہاں کے بعض شعراء کے کلام اور زبان کے غلط استعمال پر اعتراضات کیے تو خانِ آرزو نے اُن کے کلام سے چن چن کر غلطیاں نکالیں اور اُسے ایک رسالہ تنبیہ الغافلین کی صورت میں شائع کیا تھا۔ حزیں آخر عمر میں بنارس میں جا رہے تھے اور وہیں مدفون ہوئے۔ اُن کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں ہوا۔

[2] کتب خانہ رضا رامپور میں چراغ ہدایت کے پانچ خطی نسخے ہیں جن میں سب سے قدیم ۱۱۸۴ھ کا لکھا ہوا ہے

[3] خواجہ محمد عاصم کا لقب امیر الامراء صمصام الدولہ ہے ان کے والد خواجہ محمد قاسم درویش (باقی)

۱۷۳۵-۳۶ء میں مان لی جائے تو اس وقت میرؔ کی عمر ۱۳-۱۴ سال سے زیادہ نہ تھی ذکرِ میر میں جو انھوں نے لکھا ہے کہ خواجہ محمد باسط کی زبان سے نکلا "یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے" یہ سن کر میں نے ٹھٹھا مارا، امیر الامرا نے میری طرف دیکھا اور ہنسنے کا سبب پوچھا تو میں نے کہا قلمدان کا وجود ایک لکڑی سے زیادہ نہیں وہ وقت، غیر وقت نہیں جانتا، جس شخص کو بھی حکم دیں گے وہ اٹھا لائے گا" اس پر یہ شبہ وارد کیا گیا کہ اتنا کمسن بچہ اپنے وقت کے امیر الامرا کے سامنے اِس طرح قہقہہ لگائے اور اپنے محسن خواجہ محمد باسط کی لفظی گرفت کرے (جو امیر الامرا کے بھتیجے بھی تھے) یہ سب بعید از قیاس ہے۔ میں بھی اِس سے متفق ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ میرؔ نے صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے تصنیف کیا

(بقیہ) نقش بندی (متوفی ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸-۹ء) تھے مؤخر الذکر کی اولاد میں چار بیٹے اور ایک دختر تھی۔ خواجہ مقسم (وفات شوال ۱۱۵۳ھ/جنوری ۱۷۴۱ء) خواجہ محمد جعفر (وفات ۱۱۴۱ھ/اگست ۱۷۲۸ء) خواجہ محمد عاصم (وفات ۱۱ فروری ۱۷۳۹ء) محمد مستقیم مظفر خاں (وفات ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) اور دختر (متوفیہ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) خواجہ محمد عاصم کی شادی اسد قلی خاں (متوفی ۱۱۳۷ھ/اگست ۱۷۲۵ء) کی دختر ماہ بیگم سے ہوئی تھی ان کی اولاد میں احتشام خاں، احترام خاں، اشرف خاں (متوفی ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) اور عاشوری خاں تھے خواجہ محمد عاصم اور ان کے بھائی محمد مستقیم مظفر خاں نادرشاہی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے کرنال میں شہید ہوئے تھے۔ (فروری ۱۷۳۹ء) خواجہ محمد عاصم کا مقبرہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی درگاہ کے جوار میں ہے مگر بندرابن خوشگو کا بیان ہے کہ "بیرونِ قلعہ شہر پناہ متصل کھڑکی خلیل خاں مقبرۂ اوست" (تذکرہ خوشگو/۲۲۲) اگلے سال ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں اُن کی بیوہ ماہ بیگم بھی فوت ہو گئیں۔ خواجہ محمد عاصم کے بڑے بھائی خواجہ محمد جعفر تھے (متوفی ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء) اِن کے دو بیٹے تھے خواجہ علی مجتبیٰ خاں (متوفی ۱۱۴۰ھ/جون ۱۷۲۸ء) اور خواجہ محمد باسط۔ یہی خواجہ محمد باسط میرؔ کو اپنے چچا نواب صمصام الدولہ کی خدمت میں لے گئے تھے۔

صمصام الدولہ کی ڈیوڑھی موجودہ ایڈورڈ پارک کے قریب جانب جنوب واقع تھی، اس میں پہلے اسد خاں پھر میر جملہ رہے تھے ۱۷۱۸ء میں یہ صمصام الدولہ کو مل گئی تھی۔ اور خواجہ محمد باسط کا مکان ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ کے بیچ میں واقع تھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو محلہ وکیل پورہ میں رہتے تھے (یہ جگہ اب دہلی ریلوے اسٹیشن میں آ گئی ہے) خواجہ محمد باسط کے بارے میں مرآۃ آفتاب نما (قلمی ورق ۱۰۲۔ الف) میں لکھا ہے کہ وزیر (یعنی قمر الدین خاں) کے پیر و مرشد تھے ان کی حویلی شہر پناہ کے باہر واقع تھی۔ خواجہ کا انتقال ۱۱۰۸ھ/۹۵-۱۶۹۴ء میں ہوا۔

ہے کہ خواجہ محمد عاصم امیر الامراء جو صمصام الدولہ کے لقب سے مشہور ہیں اُمّی تھے لکھنا نہیں جانتے تھے۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روزینہ مقرر کرانے کے بعد میر آگرے کو واپس چلے گئے، خصوصاً اس لیے کہ ان کے چھوٹے بھائی محمد رضی وہیں تھے۔ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ صمصام الدولہ کے لیے یہ کچھ دشوار نہ تھا کہ وہ یہ وظیفہ آگرے ہی میں دیے جانے کا انتظام کردیں[1]۔ ۱۱۵۱ھ/ ۳۹-۱۷۳۸ء کے حملہ نادری میں صمصام الدولہ کی شہادت کے بعد یہ وظیفہ بند ہوگیا ہوگا اور اب کچھ امی جمی ہونے کے بعد ۱۱۵۳ھ/ ۴۰-۱۷۳۹ء میں یا اس کے بعد میر دوبارہ دہلی آئے۔ اس بار محمد رضی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ یہ زمانہ اُنھوں نے اپنی سوتیلی ماں کے بھائی سراج الدین علی خان آرزو کے ساتھ بسر کیا۔ انھوں نے میر جعفر عظیم آبادی سے فارسی پڑھنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اُن سے کچھ پڑھا ہوگا، مگر اُن کی تصنیف ذکر میر اور فیض میر نیز فارسی دیوان بلکہ اردو کے بعض اشعار میں بھی چراغ ہدایت کی جو چھوٹ پڑتی نظر آرہی ہے وہ اس بات کی قوی شہادت ہے کہ اُن کی تعلیم زیادہ تر خان آرزو ہی کی مرہونِ منت ہے۔

نکات الشعراء کی تالیف ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۱ء سے پہلے ہو رہی تھی اس میں انھوں نے خان آرزو کو بڑے آداب و القاب سے یاد کیا ہے: "استاد و پیر و مرشد بندہ" بھی کہا ہے[2]، اس وقت خان آرزو دہلی میں موجود تھے اور محلہ وکیل پورہ میں اپنی حویلی میں رہ رہے تھے۔ اواخر محرم ۱۱۶۸ھ/ نومبر ۱۷۵۴ء میں وہ اودھ کی طرف چلے گئے اور ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۵ء میں اثنائے سفر میں بیل گاڑی سے گر کر سخت مجروح ہوئے، کچھ زمانے کے بعد انتقال ہوگیا[3] اور اُن کا تابوت لکھنؤ سے دہلی لاکر اُن کی حویلی محلہ وکیل پورہ میں دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد ذکر میر لکھ رہے ہیں تو کہتے ہیں کہ "خالوے کذائی" لالچ کے مارے دہلی سے نکلے، اس توقع پر اودھ گئے کہ وہاں نواب اسحٰق خاں شہید کے بھائی ہیں[4] وہ سابقہ حقوق کا خیال کرکے کچھ مراعات کریں گے مگر میر کے لفظوں میں "نکدِ روزگار خوردہ بجان جامرد"۔

---

[1] قاضی عبدالودود: عیارستان [2] نکات الشعراء (ط ا) ص ۴

[3] آرزو کا انتقال ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ/ ۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء کو ہوا (خزانہ عامرہ ص ۱۱۹)

[4] نواب نجم الدولہ کے برادر خرد نواب سالار جنگ مراد ہیں جو نواب شجاع الدولہ کے سالے بھی تھے آرزو نے ان کے ساتھ ہی دہلی سے اودھ کا سفر کیا تھا (آزاد بلگرامی: سرو آزاد ۱۱۸)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر نے ذکر میر میں خان آرزو کی مذمت کیوں کی ہے لکھتے ہیں کہ اگر اُن کی "خصمی و حلاجی" کا بیان کروں تو پورا ایک دفتر درکار ہے۔ خانِ آرزو نے بھی ایک یتیم بچے پر ایسا ظلم و ستم کیوں روا رکھا؟ اِس کے لیے بھی ہمیں میر کی تصانیف کے بین السطور کو پڑھنا ہوگا اور داخلی شہادتوں سے ریزہ ریزہ جمع کر کے مطابق حالات تصویر بنانی ہوگی۔

میر جس زمانے میں خان آرزو کے ساتھ رہ رہے ہیں یہی وہ وقت ہے جب چراغ ہدایت لکھی جا رہی تھی۔ چراغ ہدایت میں ایک تاریخ ۳ رذی قعدہ ۱۲ء جلوس محمد شاہی ملتی ہے جو ۳ رذی قعدہ ۱۱۵۷ھ کے مطابق ہے (یعنی ۸ ردسمبر ۱۷۴۴ء) اس کا ایک قلمی نسخہ مولوی محمد شفیع لاہوری کے کتب خانے میں تھا جس کا ترقیمہ خود آرزو نے اپنے قلم سے ۲۷ رجب ۱۱۶۰ھ/۲ راگست ۱۷۴۷ء لکھا ہے۔ اِس کا عکس نوادر الالفاظ میں چھپا ہے اس سے ظاہر ہے کہ کتاب کی تسوید کا کام ۱۱۵۷/ ۱۷۴۴ء اور ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء کے درمیان ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میر نے اس کا مسودہ صاف کرنے میں آرزو کی مدد کی ہو یا کسی اور حیثیت سے تعاون کیا ہو۔ اِسی سے اُنھیں فارسی جدید کے اُن محاورات کا علم ہوا جو ایران سے آنے والے استعمال کرتے تھے اور کلاسیکی فارسی پڑھنے والے ہندوستانیوں کو اُن محاوروں سے واقفیت نہیں تھی۔ اُنھوں نے ذکر میر کے بعض واقعات خصوصاً اُس کا ابتدائی حصّہ ان محاورات کو کھپانے کے لیے ہی تصنیف کیا ہے۔

اِسی سلسلے میں یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اُن کے والد انھیں دس سال کی عمر میں عشق کا فلسفہ سمجھا رہے ہیں اور یہ پچاس برس کی عمر میں اُن ملفوظات کو ایسے لکھ رہے ہیں جیسے وہ کل کی باتیں ہیں۔ یہاں بھی بین السطور میں پوشیدہ مقصد یہ اظہار کرنا ہے کہ عشق کوئی گناہ یا بداخلاقی نہیں کوئی ایسا فعل نہیں جو باعثِ شرم ہو یا قابلِ تعزیر و لائقِ مذمت ہو بلکہ ایک نہایت مقدس جذبہ ہے۔ یہ کائنات بھی حرکتِ عشقی سے ہی چل رہی ہے:

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

مگر عشق سے عشق تک بھی بہت سے فاصلے اور مرحلے ہیں۔ ایک صوفیہ کا عشق ہے جو معرفت کا حاصل ہے اور ذریعہ بھی۔ دوسرا وہ عشق ہے جو میر نے ننگ نامہ

میں بیان کیا ہے[1]۔ میرؔ کے یہاں عشق کی کون سی کیفیت ہے اِس کا قطعیت سے فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ننگ نامہ والا عشق آخر عمر تک اُن کا پیچھا نہ چھوڑ سکا۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کے ایک شعر سے اِس کا اندازہ ہوتا ہے۔

دربار میں کرے ہے بیاں اپنے عشق کا
دیکھو تو اِس بڑھاپے میں تم میرؔ کی ہوس[2]

حاصلِ کلام یہ کہ میر جب خان آرزو کے ساتھ رہ رہے تھے اور یہ زمانہ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۱ء سے ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کے درمیان یا اِس سے کچھ آگے پیچھے کا ہو سکتا ہے تو اُنھوں نے خان آرزوؔ کے گھر یا خاندان میں کسی لڑکی سے عشق کیا اور بہت شد و مد کے ساتھ کیا۔ میرؔ کے لیے یہ بالکل فطری اور نفسیاتی وقوعہ تھا، اُن کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا، بڑے بھائی سوتیلے تھے چھوٹے بھائی کی وہ خود کفالت کر رہے تھے، اپنا وطن (آگرہ) اور گھر بار چھوڑ کر کس مپرسی کے عالم میں دہلی آئے تھے، دہلی بھی اب وہ نہ رہی تھی جو نادر شاہ کے حملے سے پہلے تھی، انھیں اپنی سوتیلی ماں کے بھائی (خانِ آرزو) کی سرپرستی میں رہنا اور تعلیم حاصل کرنا تھا، اِن سب حالات نے اُن کی جذباتی دنیا میں گہرا خلا پیدا کر دیا تھا، اُن کا فطری تقاضا یہ رہا ہوگا کہ کسی سے ٹوٹ کر محبت کریں۔ مگر اِس عہد کی معاشرت میں کسی کا اظہارِ عشق کرنا نہایت عظیم اور ناقابلِ معافی جرم تھا۔ ایسی ہی کسی لغزش کی وجہ سے انعام اللہ خاں یقین کو خود اُن کے والد نے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا تھا[3]۔

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ خیال صحیح ہے کہ میر نے ۱۱۵۲ھ سے ۱۱۶۰ھ تک تقریباً سات سال آرزو کی خدمت میں رہ کر گذارے (محمد تقی میر، ۲۴۔۲۵) [2] کلیات میر (عبدالباری آسی) نولکشور ۱۹۴۰ء مثنوی معاملات عشق (معاملۂ ہفتم) ص ۹۲۷

[2] دیوان شہزادہ سلیمان شکوہ (مرتبہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام)

[3] ۱۱۶۹ھ/۵۶۔۱۷۵۵ء تذکرہ چمنستانِ شعراء۔ تذکرہ خیراتی لال بے جگر (قلمی)، ورق ۲۰۸ ب شاہ محمد عمر مجددی کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ انتقال کے وقت یقین کی عمر ۲۵ سال تھی۔
نیز: تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۷، (بہ تصحیح نثار احمد فاروقی)، رامپور ۱۹۹۶ء تحت ۱۱۶۹ھ

جب اِس عشق نے خاصیتِ مشک پیدا کرلی تو پہلے خان آرزو نے میر کو سمجھایا ہوگا پھر کچھ سخت سُست کہا ہوگا، مگر یہ بھی خیال تھا کہ ایک یتیم اور بے آسرا بچہ ہے اس کو گھر سے نکال دوں تو کہاں جائے گا، اور جو بات ابھی گھر کے اندر ہی ڈھکی چھپی ہے، اُس کے طشت ازبام ہونے کا بھی اندیشہ تھا۔ آرزو نے یہ سارا ماجرا حافظ محمد حسن کو لکھا جو میر کے علاتی بھائی تھے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اِتمامِ حجت ہو جائے اور میر کو گھر سے نکال دیں تو اِس سے غلط فہمی نہ ہو سبب کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

حافظ محمد حسن نے اِن حالات سے واقف ہو کر ایک جذباتی سا جواب لکھ دیا ہوگا کہ یہ فتنۂ روزگار ہے، خاندان کی عزت کو مٹی میں ملادے گا، اِس کا کام تمام کر دینا چاہیے۔"

بین السطور کے مطالعے سے میرا اندازہ یہ ہے کہ خان آرزو نے میر کو اپنے گھر سے نکال دیا اگرچہ میر کا بیان یہ ہے کہ خود انھوں نے وہاں کی بود و باش چھوڑی اور نواب امیر خاں انجام کی حویلی میں آکر رہنے لگے۔[1]

امیر خاں کا نام میر محمد اسحٰق تھا انھیں پہلے کامیاب خاں خطاب ملا، پھر عزیز اللہ خاں پھر عمدۃ الملک امیر خاں۔ یہ بادشاہِ وقت کے بخشی سوم تھے الہ آباد کی صوبیداری اور کوڑہ جہان آباد و کڑہ مانک پور کی فوجداری اِن کے سپرد تھی۔ نہایت زندہ دل، ظریف حاضر جواب اور شعر و سخن کا مذاق رکھنے والے تھے انجام تخلص تھا، اِن کے اثر و رسوخ نے حاسد پیدا کر دیے تھے روز افزوں خاں خواجہ سرا نے اِن کے ملازموں میں سے ہی ایک شقی کو مامور کیا اُس نے ۲۳۔ ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ/ ۶۔ جنوری ۱۷۴۷ء کو جمعہ کے دن قلعہ میں دیوان خاص کی ڈیوڑھی پر انھیں قتل کر دیا۔[2]

امیر خاں انجام بہت بڑے امیر تھے اِس کا امکان کم ہے کہ میر سے اُن کے تعلقات ہوں شعر گوئی کی مناسبت سے شناسائی ہو سکتی ہے۔ میر نے اُن کی حویلی میں رہنے کا ذکر کیا ہے

---

[1] ذکرِ میر (ط ۱) ص ۳۷

[2] تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۶/۱۳۳ / سیر المتاخرین حصہ ۱۳/۳

SARKAR : Fall of the Mughal Empire vol.I p.11

اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ نواب امیر خاں کے متوسّلین جو اُن کی ڈیوڑھی میں رہتے تھے ان میں سے کسی کے ساتھ میرؔ نے رہنا اختیار کیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ انجام کی موت کے بعد کا واقعہ ہے۔

خانِ آرزو اور میرؔ کے تعلقات کی خرابی یا کشیدگی کے لیے جن لوگوں نے میرؔ کے مذہبی معتقدات یعنی تشیّع کو سبب بتایا ہے وہ مناسب نہیں، اِس لیے کہ خانِ آرزو بھی کچھ متشدد قسم کے سنّی نہ تھے اور میر کم سن تھے اُن کے اعتقادات میں ایسی جارحیت نہ تھی جس سے کوئی فتنہ پیدا ہو اور خانِ آرزو اتنے بے رحم ہو جائیں کہ میرؔ کی یتیمی، غربت اور بے کسی کا بھی خیال نہ کریں۔ دوسرے اُس وقت کی معاشرت میں، اور کسی حد تک آج بھی، ایسے متعدّد خاندان موجود ہیں جن کے کچھ افراد شیعہ ہیں[1] کچھ سنّی ہیں۔ خود میرؔ کا گھرانا اس کی مثال ہے۔ بہ ظاہر محمد علی عرف علی متقی کی پہلی شادی خانِ آرزو کی بہن سے ہوئی تھی جن کے بطن سے حافظ محمد حسن تھے۔ کسی دوسری اولاد کا میرؔ نے بھی تذکرہ نہیں کیا، دوسری شادی کہاں ہوئی اِس کا ہمیں علم نہیں مگر میرا خیال ہے کہ میرؔ کی ماں شیعہ تھیں۔ اُنھوں نے اشاروں کنایوں میں یہ اظہار بھی کیا ہے کہ محمد علی بھی شیعہ

---

[1] میرؔ نے اپنے علاتی بھائی کا نام حافظ محمد حسن لکھا ہے اِس میں بھی اُن کے سنّی ہونے کی طرف اشارہ ہے شیعہ حضرات میں حفاظ کم ہوتے ہیں۔ پھر میرؔ کہتے ہیں کہ والد کا ترکہ (یعنی تین سو کتابیں) محمد حسن نے اپنے قبضے میں رکھ لیں اور میرؔ کو اس سے محروم کر دیا، اگر یہ بیان صحیح ہے تو محمد حسن نے یہ رویّہ ہو سکتا ہے کہ میرؔ کے شیعہ ہونے کی وجہ سے اپنایا ہو یعنی یہ اہلِ سنّت کی کتابیں ہیں میرؔ کے کام کی نہیں وہ اِنھیں ضائع کر دے گا۔ یہاں یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ان کتابوں کو میرؔ نے "وقفِ اولادی" کہا ہے۔ میرؔ نے ترکہ نہ دینے کی طرف اِس طرح اشارہ کر دیا ہے۔ اِس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ باپ تین سو روپے کے مقروض مرے تھے وہ قرضہ میں نے ادا کیا۔ اس میں بھی یہ کنایہ ہے کہ شیعہ روایات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا قرض حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ادا کیا تھا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ میرؔ نے شیخ عبدالعزیز عزت (متوفی ۱۰۸۹ھ/ ۱۶۷۸ء) سے اپنی قرابت کا تذکرہ کیا ہے اُن کے والد لاہور سے واپسی میں عزت کے بیٹے سعدالدین کے مکان پر ٹھہرے تھے جن کا انتقال ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۶ء میں ہوا۔

(باقی صفحہ دیگر پر)

عقائد رکھتے تھے لہ

(بقیہ) عزّت کے بھائی شیخ عطاء اللہ کا شمار ممتاز حنفی علماء میں ہوتا تھا یہ بھی اسی سال فوت ہوئے تھے۔
عزّت کے دوسرے بیٹے فخر الدین تھے (متوفی ۱۱۴۲ھ/۳۱-۱۷۳۰ء) ان کا نام ذکر میر میں غلطی سے قمرالدین چھپا ہے
شیخ عبدالعزیز عزّت نے ردِّ شیعیت میں ایک رسالہ کشفُ الغطا کے نام سے لکھا تھا (تذکرہ خوشگو/۵۴) اس
رسالے کی شرح ایزدبخش رسا تخلص نے (شہادت ۱۱۲۴ھ/۱۲-۱۷ء)
حق الیقین کے نام سے کی تھی جس کا قلمی نسخہ ٹونک میں محفوظ
ہے۔ رسا نے عزّت کے ہاتھ پر شیعیت سے توبہ کر کے اہلِ سنّت کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ان شواہد کی روشنی میں
اپنے والد کے مذہب کے بارے میں میر نے جو کچھ لکھا ہے وہ بیان مشتبہ ہو جاتا ہے۔

لہ میر نے لکھا ہے کہ اُن کے والد نے اپنے پیر و مرشد شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی سے حاکم شام کے بارے میں
دریافت کیا۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اس پر عنوان دیا ہے: "باپ کی اپنے پیر سے گفتگو در بارۂ یزید" حاکم شام
کہا جائے تو عموماً امیر معاویہؓ مراد ہوتے ہیں۔ پیر نے کہا کہ میں نے کبھی اُس کا نام اپنی زبان سے نہیں لیا۔ خواجہ
علی اکبر مودودی (متوفی ۱۲۰۹ھ/۵-۱۷۹۴ء) کے ملفوظات لطائفِ اکبری (قلمی) میں بھی ایسی ہی عبارت
ملتی ہے: "ایک روز الٰہ آباد میں ایک شخص فقیر کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ پسرِ حاکم شام کے بارے میں آپ کی
کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: جو بھی اُسے آپ کہیں اُس سے بھی وہ بدتر ہے مگر میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھے اُس سے
کیا سروکار؟ میں اُس کا نام اپنی زبان پر کیوں لاؤں؟ مجھے اُس کا نام لینے سے کراہیت آتی ہے۔"

(برہان دہلی جلد ۶۷۔ شمارہ ۱ جولائی ۱۹۷۱ء)

اِن ملفوظات کے جامع خواجہ حسن مودودی کھاری میر کے معاصر ہیں ہوسکتا ہے میر نے اُن سے یا اُنھوں نے میر سے
یہ روایت سن رکھی ہو۔ میر کے والد کا ایک شیخ سے مرید اور صوفی ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھے۔
شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صوفیہ کے کس سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔
تاریخ محمدی سے اُن کی وفات ۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۷ء معلوم ہوتی ہے اس سے ۲۶ سال بعد میر پیدا ہوئے ہیں، اور
وہ ۱۲-۱۱ سال کے تھے جب اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ میر سے یہ روایت کس نے بیان کی؟
اسی حکایت میں محترم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد کا حوالہ ہے اِس کا نام خواجہ وقار المخاطب بہ محترم خاں
ہے اور یہ ۱۰۹۵ھ/ ۱۶۸۴ء میں فوت ہوا۔ اِس سے یہ متعین ہوتا ہے کہ محمد علی خاصی مدت تک اپنے پیر سے
فیض یاب رہے ہوں گے۔

میر کا یہ پہلا عشق بڑا جان گداز تھا جس کی لپیٹ اُن کی شاعری میں آج بھی محسوس ہوتی ہے مثلاً اس طرح کے اشعار اور اُن کی معنوی فضا پر غور کیجیے:

اُس کا منھ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

اب کی جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا؟

آگ سی اِک دل میں سُلگے ہے کبھی بھڑکی تو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

آشنا تجھ سے ملتے، نے دل کو کھو کے روتے
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

مدت رہے گی یاد ترے چہرے کی جھلک

جلوے کو جس نے ماہ کے دل سے بھلا دیا

یہ چند اشعار صرف دیوان اوّل کی ردیف الف سے سرسری طور پر دیکھ کر لکھ دیے ہیں، اِن سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہونا چاہیے کہ یہ اُردو شاعری کے روایتی ہجر و وصال کے بیان کی شاعری نہیں ہے۔ اِس میں شاعر کی پوری شخصیت اور اُس کے جذباتی ہیجان کا پَرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ میر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اُنھیں جنون ہو گیا تھا، اس کا بیان اُن کی مثنوی خوابِ خیال[1] میں بھی موجود ہے۔ وہ چاند میں ایک صورت کے نظر آنے کا ذکر کرتے ہیں، اُس حصّے کو غور سے پڑھیے تو میرا خیال ہے کہ یہ طبّی اصطلاح والا جنون (Mania) یا (Madness) نہ تھا بلکہ جذباتی کیفیات کے بے قابو ہو جانے والی کیفیت تھی۔ وہ اپنی محبوبہ کا نام لے کر پکارتے ہوں گے، یا اُس کی مالا جپنے لگے ہوں گے۔ ماورائے سخن جو معانی ہیں وہ یہ بتا رہے ہیں کہ اُن کی محبوبہ کا نام مہتاب یا قمر یا چاندنی یا ماہ بیگم یا ماہ پارہ رہا ہوگا یہ علامت اُنھوں نے اپنی شاعری میں بھی خاص انداز سے استعمال کی ہے مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

چاندنی (دیوانِ اوّل)

اُس مہ کے جلوے سے کچھ تا میرؔ یاد دیوے

اب کے گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

ماہ (دیوانِ دوم)

گفتگو وصفوں سے اُس ماہ کے کریے اے میرؔ

کاہش افزا ہے کروں اُس کی اگر ذات کی بات

ماہ پارہ (دیوانِ دوم)

کوئی تو ماہ پارہ اِس بھی رُواق میں ہے

چشمک زنی میں شب کی یوں ہیں نہیں ہیں تارے

---

[1] کلیاتِ میر، مرتبہ عبدالباری آسی، ص ۹۶۵ - ۹۰۴ (اس میں بھی "مہِ چاردہ" کا بار بار ذکر آیا ہے)

ماہِ چاردہ (دیوانِ اوّل)

اُس ماہِ چاردہ کا چھپے عشق کیوں کے آہ
اب تو تمام شہر میں مشہور ہو گیا

ماہ زمین گرد (دیوانِ چہارم)

وہ جو ماہ زمین گرد اپنا دو پہری ہے اِن روزوں
شوق میں ہر شب حرف و سخن ہے ہم کو فلک کے تاروں سے

ماہ طلعت

رہے خیال نہ کیوں ایسے ماہ طلعت کا
اندھیرے گھر کا ہمارے وہی اُجالا تھا

مہتاب (دیوانِ اوّل)

ٹک منھ سے اُس کے دی شب برقع سرک گیا تھا
جاتی رہی نظر سے مہتاب سی چھٹک کر

(یہاں مہتاب پُھلجھڑی کے معنوں میں ہے، کہ اُس کا نقاب ذرا سرکا تھا تو ایسا محسوس ہوا کہ پھلجھڑی سی چھوٹ گئی!)

اِن علامتوں کے اور اشعار بھی کلیاتِ میر میں ملیں گے[۱]

تحقیق ظاہر ہے کہ دستاویزی شہادت چاہتی ہے اور مفروضات کی بنیاد پر کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہو سکتا مگر قانون نے ایک گنجایش (Circumstancial Evidence) کی بھی رکھی ہے، میر کی شاعری کا ایسا مطالعہ ہمیں بعض مزعومات پر از سرِ نو غور کرنے کی دعوت ضرور دیتا ہے۔

ذکرِ میر کو میر کی سوانح عمری کہا جاتا ہے مگر اس میں "سوانح عمری" کم سے کم ہے، یہ حوادث اور سانحات سے بھری پڑی ہے۔ وہ ایسی سیکڑوں باتیں ہمیں نہیں بتاتے جن کا جواب کسی خود نوشت سوانح عمری سے طلب کیا جاتا ہے[۲] اپنے والد کا نام بھی ضمناً لکھ دیا ہے، وہ کب پیدا ہوئے،

---

[۱] ذکرِ میر میں بھی جہاں کیفیتِ جنون کا ذکر ہے یہ الفاظ غور طلب ہیں: در شبِ ماہ (چاندنی رات) از جرمِ قمر، ماہِ چہاردہ، گلِ مہتاب (چاندنی)، گلِ شب افروز، چہرۂ مہتابی وغیرہ۔

[۲] میر کا سال ولادت اواخرہ ۱۱۳۳/۲۲-۱۷۲۱ء تقریباً طے شدہ ہے۔ (باقی)

آگرے میں اُن کا مکان کہاں تھا، شادی کب اور کہاں ہوئی، اولاد کتنی تھی وغیرہ۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا اُنھیں یہ کتاب لکھنے کی ترغیب چراغِ ہدایت سے ملی اور اُنھوں نے ایرانی محاورہ استعمال کرنے کے شوق میں اِس کتاب کی داغ بیل ڈالی، یہ کلاسیکی فارسی، ایرانی محاورے اور سبکِ ہندی کی آمیزش کا ایک خوشگوار مرکّب ہے، اِس میں میرؔ کا اپنا منفرد اُسلوب ملتا ہے، وہ چھوٹے چھوٹے مربوط اور خوب صورت جملے لکھتے ہیں، اُن کی نثر میں بھی اکثر رعایتِ لفظی اور مراعاۃ النظیر کا وہ التزام موجود ہے جو میر کے شاعرانہ اُسلوب کا خاصہ ہے۔ مگر آورد یا تصنّع کا احساس نہیں ہوتا۔ میر کے معاصرین میں کسی دوسرے ہندی نژاد مصنّف نے ایسے فارسی اسلوب میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ یہ اُسلوب ذکرِ میر اور فیضِ میر میں خوب نمایاں ہے، مگر نکات الشعرا میں اِس کا اثر کمتر ہے۔

کتاب کا ابتدائی تقریباً ایک تہائی حصہ محاورۂ ایران سے بھرا پڑا ہے، جوں جوں وہ آگے بڑھتے ہیں تکلف کم ہوتا جاتا ہے اور بعض حصے تو ڈائری کی شکل میں لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ تین مختصر نمونے اسلوب کے اس فرق کو ظاہر کر سکتے ہیں۔

۱۔ "خاک شویانِ سرکوچہ محبت، نمدمویانِ بیابانِ وحشت، بندگانِ باخدا واصل، دور گردانِ نزدیک بہ دل، دلدادگانِ جلوۂ یار، خاک اُفتادگانِ سایۂ دیوار، آشنایانِ بحرِ حقیقت، مجرّدانِ بادیۂ طریقت، آوارگانِ بہ منزل رسیدہ" آفتابے از سایۂ شان دمیدہ خاک نشینانِ بر فلک رفتہ، عزلت گزینانِ نام

(بقیہ) اُن کی وفات ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ / ۲۱ ستمبر ۱۸۱۰ء کو جمعہ کے دن لکھنؤ کے محلہ سٹھی میں ہوئی اگلے دن دوپہر کو اکھاڑہ بھیم کے قبرستان میں دفن کیے گئے جہاں محمد محسن کی نوشتہ یادداشت کے مطابق اُن کے دوسرے عزیزوں کی قبریں تھیں۔ اُن کے بڑے بیٹے میر فیض علی تھے، دوسرے بیٹے جو بہ ظاہر دوسری بیوی سے تھے (اس لیے کہ اُن کی اور میر فیض علی کی عمروں میں بہت تفاوت ہے) میر کلو عرش ہیں جو خود بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ایک بیٹی بھی بتائی جاتی ہے وہ بھی شاعرہ تھی، بیگم تخلص کرتی تھی اور میر کی زندگی ہی میں شادی سے کچھ عرصے کے بعد فوت ہوگئی تھی۔

گرفتہ، آشفتگانِ دشتِ مہرووفا، غنچہ خسپانِ گلزارِ حیا، سنگ سخت بالینِ سر
علامتِ شیدائی در بر، سنگ بر شکم بندند و نہ نالند، نانِ خود را بر شیشہ نمالند"
(طبع اول ص ۲۷)

۲ - دوسرا نسبتہً سہل اور بے تکلف اُسلوب کا نمونہ :

" در خلالِ ہمین حال جواہر سنگھ بالشکرِ جرّار، و ملہار کہ احوالِ او نوشتہ آمد، بہ دعویِ خونِ پدر، بر نجیبُ الدولہ رفتہ، بہ دہلی چسپیدہ بود، خلقے از گرانیِ غلّہ بجان آمد قتل و قتال، جنگ و جدال، قریب دو ماہ ماند عماد الملک کہ در فکر کنارہ کردن بود مع ناموس از قلعۂ بھرت پور برآمدہ، مردمانِ زائد را بہ فرّخ آباد فرستاد و خود شریکِ جواہر سنگھ شد" (ط۔ ا ص ۱۱۲)

۳ - تیسرا نمونہ ڈائری کے انداز کا بھی دیکھیے :

"اکنوں کار پردازان، نول سنگھ پسرِ چار مین سورج مل را کہ در عرصہ نمودہ نیابت آن طفل برداشتہ اند اگر از آب خوب برمی آید خوب است، وگرنہ کار بسیار بے اُسلوب است (ط۔ ا ص ۱۱۸)

. . . . درین ایام مشہور است کہ رایاتِ اقبالِ پادشاہی بہ فرخ آباد سایہ افگن گشت . . . . (ص ۱۲۱)

الحاصل مغلانِ شرارت بنیاد و جنوبیانِ سراپا فساد قریب است کہ بروند و حضرتِ ظلِ سبحانی بہ ذاتِ قدسی صفات، بادو سہ محرر در قلعۂ مبارک بے تشویشِ آیندہ و روندہ تشریف دارند اگر روزے صد بار بر کنگرہ کنگرۂ حصار، جہتِ سیر برآیند کیست کہ حجابِ اُو مانع شود، وگر بہ بازار پیادہ پا برآیند حاجب کو کہ دور باش نماید، اُسلوب چنین بہ نظر می آید کہ اہلِ حرفہ سر بہ صحرا زنند و سپاہی پیشگان بہ گدائی دست دراز کنند، ہر کسے راہِ خود گیرد، شہر رونق بسیار پذیرد"

اِس آخری اقتباس میں جو طنز کی تلخی اور کاٹ ہے اُسے خوب سمجھا جا سکتا ہے۔ بادشاہ وقت کے لیے اِس طرح کا ریمارک۔ ذاتی ڈائری میں لکھا بھی جا سکتا ہے۔

میر کے فارسی نثری اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے لکھا تھا:

"میر بالعموم مقفّیٰ عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیے کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بیساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ شاید کہیں کہیں تصنع پیدا ہو گیا ہو لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ ہم قافیہ فقروں اور جملوں کی قید سے عبارت میں اکثر یہ نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر فقرے اور جملے کے بعد جو دوسرا جوابی فقرہ یا جملہ آتا ہے اُس میں کبھی پہلے فقرے یا جملے کے مفہوم کی بیجا تکرار ہوتی ہے اور کبھی بے ضرورت لفظوں کی بھرتی ہوتی ہے، اس سے عبارت میں تصنع، طوالت اور سُستی پیدا ہو جاتی ہے لیکن میر کے یہاں یہ نَقص نہیں ہے۔ اُن کے یہاں جوابی فقرے اور جملے بھی چست ہوتے ہیں اور اپنا مفہوم علیحدہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس عبارت میں بڑے بڑے جملوں کے آخر میں قافیہ لایا جاتا ہے وہ اکثر بے لطف معلوم ہوتی ہے لیکن میر کے یہاں چھوٹے چھوٹے جملوں بلکہ دو لفظی اور سہ لفظی فقروں کے بعد قافیہ آتا ہے تو عجب بہار دکھاتا ہے۔"[1]

ادبی اور لسانی حیثیت کے علاوہ ذکرِ میر کی اہمیت ایک ہم عصر تاریخی ماخذ کی بھی ہے اس میں جو وقائع بیان ہوئے ہیں اُن کا آغاز مارچ ۱۷۴۹ء سے ہوتا ہے اور آخری واقعات مارچ ۱۷۸۹ء کے ہیں اس طرح یہ پورے پچاس برسوں کے جستہ جستہ واقعات پر مشتمل ہے اس میں کچھ وقائع وہ ہیں جن میں میر تقی میر خود شریک ہیں مثلاً ۱۷۴۸ء میں وہ رعایت خاں کے ساتھ سرہند گئے جہاں مغل فوج کا مقابلہ احمد شاہ ابدالی کے لشکر سے ہوا۔ اسی میں نواب قمر الدین خاں ۲۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ / ۲۲ مارچ ۱۷۴۸ء جمعہ کے دن مارے گئے تھے اور درانی کے توپ خانے میں آگ لگنے کی وجہ سے بھگدڑ پڑ گئی تھی۔ اس کی تاریخ "فتح خداساز" (۱۱۶۱ھ) نکلتی ہے۔ جب مغل فوجیں سرہند[2] سے واپس

[1] مقدمہ فیض میر ص ۱۱-۱۲ (نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء)

[2] مغل فوجیں سرہند کے پاس ایک گاؤں مانوپور میں خیمہ زن تھیں۔ نواب قمر الدین خاں اپنے خیمے میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ابدالی کیمپ سے ایک گولا آ کر گرا جس سے نواب سخت زخمی ہو کر انتقال کر گئے۔ جادو ناتھ سرکار کا بیان ہے کہ انہیں وہیں خیمے میں چپکے سے دفن کر دیا گیا۔ یہ غلط ہے (باقی صفحہ دیگر پر)

آ رہی تھیں تو پانی پت کے قریب یہ خبر ملی کہ ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ/ ۲۵ اپریل ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ صفدر جنگ نے احمد شاہ کو تخت پر بٹھایا اور خود وزیر اعظم بن بیٹھا۔ اسی طرح وہ پشکر راجستھان کی مہم میں رعایت خاں کے ساتھ تھے۔ صفدر جنگ نے احمد خاں بنگش پر چڑھائی کی تو میر بھی اسحاق خاں نجم الدولہ کے ساتھ فرخ آباد تک گئے۔ صفدر جنگ کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ میر بھی اس لُٹے پٹے لشکر کے ساتھ دہلی واپس آئے۔ یہ ۱۱۶۳/ ۱۷۵۰ء کا قصہ ہے۔ ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء میں وہ جنگ سکرتال میں بھی شریک ہیں جب مرہٹوں نے شاہ عالم کو ساتھ لے کر نواب ضابطہ خاں پر چڑھائی کی تھی۔

ذکر میر سے میرؔ کے متعدد اسفار کا حال معلوم ہوتا ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ آگرے سے دہلی میں پہلی بار آمد	تقریباً ۱۱۴۷ھ/ ۳۵-۱۷۳۴ء
۲۔ آگرے سے دہلی میں دوسری بار آمد	حملۂ نادری کے بعد تقریباً ۱۱۵۴/ ۱۷۴۱
۳۔ دہلی سے سرہند کا سفر	۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء
۴۔ دہلی سے پشکر (راجستھان) کا سفر	۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹
۵۔ پشکر سے اجمیر کا سفر	۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء
۶۔ دہلی سے فرخ آباد کا سفر	۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء
۷۔ دہلی سے سکندر آباد (ضلع بلند شہر)	شعبان ۱۱۶۷ھ/ جون ۱۷۵۴ء
۸۔ دہلی سے برسانہ	
۹۔ برسانہ سے کمھیر (راجستھان)	
۱۰۔ راجا ناگر مل کے ساتھ شجاع الدولہ کو سمجھانے کے لیے بھی ایک سفر کا ذکر ہے مگر اُس کی منزل معلوم نہیں	

(بقیہ) اُن کی لاش دہلی لاکر مدرسہ غازی الدین خاں (اجمیری گیٹ) کے عقب میں ان کے خاندانی قبرستان (موجودہ دہلی کالج) میں دفن کی گئی تھی (رک: سنگی بیگ: سیر المنازل۔ مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی)

۱۱ ۔ کشمیر سے دہلی میں آمد	
۱۲ ۔ دہلی سے آگرے کا سفر (۲۳ سال کے بعد)	۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء
۱۳ ۔ دہلی سے آگرے کا دوسرا سفر	۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶-۶۷ء
۱۴ ۔ راجا ناگرمل کے ساتھ کاماں کا سفر	۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۱ء
۱۵ ۔ کاماں سے فرخ آباد کا سفر	۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۱ء
۱۶ ۔ فرخ آباد سے دہلی کا سفر	۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۲ء
۱۷ ۔ دہلی سے سکرتال کا سفر	۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء
۱۸ ۔ واپسی میں نجیب آباد، نہٹور، شیرکوٹ سیوہارہ، سلیم پور، امروہہ، گڑھ مکتیسر ہاپوڑ ہوتے ہوئے دہلی آئے ۔	۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء
۱۹ ۔ دہلی سے براہ فرخ آباد لکھنؤ کا سفر	ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء، مارچ
۲۰ ۔ آصف الدولہ کے ساتھ بہرائچ کا سفر	
۲۱ ۔ آصف الدولہ کے ساتھ پیلی بھیت اور دامن کوہ ہمالیہ کا سفر	

اِن کے سوا بھی میر نے بعض سفر کیے جن کا تذکرہ ذکرِ میر میں نہیں ہے نسنگ کے سفر کا حال کلیاتِ میر میں شامل مثنوی نسنگ نامہ سے معلوم ہوتا ہے۔[۱]

ذکرِ میر میں جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں اُن کا تحلیلی اور تقابلی مطالعہ بعض اہم نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ میر کا مقصد اپنے زمانے کی تاریخ لکھنا نہیں تھا وہ خود جن حوادث کی لپیٹ میں آئے ہیں اُن کا بیان کرنے سے اُس زمانے کے تاریخی وقائع سامنے آگئے ہیں۔ بہ ظاہر میر کسی گروہ بندی میں بھی نہیں ہیں اُس عہد میں سیاسی ریشہ دوانیوں کے دو بڑے اکھاڑے ایرانی اور تورانی گروپ (یعنی شیعہ اور سنی اُمراء) تھے میر نے ایرانی گروپ

---

[۱] کلیاتِ میر (مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ ۱۹۴۰ء)

میں صفدر جنگ، شجاع الدولہ، نجف خاں وغیرہ کا ذکر کیا ہے، تورانی گروپ میں عماد الملک، نجیب الدولہ وغیرہ ہیں مگر کہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اُن کی ہمدردی کسی خاص گروہ کے ساتھ ہے۔ وہ کسی کی بیجا مذمت نہیں کرتے۔

میرؔ کے ساتھ سلوک کرنے والے بیشتر اُمرا ر تورانی گروہ کے ہیں اور عجیب تر یہ ہے کہ ہندو اُمرا نے اُن کی دست گیری اور مالی امداد سب سے زیادہ کی ہے۔ اُن کے ہندو مربّیوں میں وزیر کے دیوان مہا نرائن، بنگالہ کے وکیل راجا جگل کشور، دیوان خالصہ و تن راجا ناگر مل راجا جگل کشور کی بیوی، صفدر جنگ کے خزانچی لالہ رادھا کشن کا بیٹا بہادر سنگھ جیسے کئی ہندو امرا شامل ہیں جو میرؔ کی شاعری کے قدر دان تھے اور اُس پُر آشوب زمانے میں بھی جب جان، مال، عزت آبرو سب داؤں پر لگے ہوئے تھے، یہ لوگ ایک فن کار کی مدد کر رہے تھے راجا ناگر مل نے تو ایک طویل عرصے تک میر کو مع اہل وعیال کے اپنے علاقے میں محفوظ رکھا۔

ذکرِ میر فرمائشی یا درباری تاریخ (Commissioned History) بھی نہیں ہے اس لیے یہاں جن وقائع کا بیان ہوا ہے وہ کسی عصبیت اور جانب داری سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ مغلوں کے آخری دور کی کئی تاریخیں ملتی ہیں، کچھ تاریخی مواد مختلف مصادر میں (مثلاً شعرا کے تذکرے) یا غیر تاریخی کتابوں میں (مثلاً ملفوظات، منشآت وغیرہ) میں بکھرا ہوا ہے بعض سفرنامے بھی ہیں (جیسے سفرنامۂ مخلص) کچھ متفرق کتابیں ہیں (جیسے بدائع وقائع از انند رام مخلص) اِن میں سے جن مصادر سے جادو ناتھ سرکار نے اپنی تالیف" زوال سلطنت مغلیہ" (FALL OF THE MUGHAL EMPIRE) میں فائدہ اُٹھایا ہے ان میں تاریخ عالمگیر ثانی، سرگذشت نجیب الدولہ از سید نور الدین حسین بہار گلزار شجاعی، تاریخ مظفری از محمد علی انصاری، تذکرہ شاکر خاں، مجمل التواریخ اور کاشی راج کی تاریخ پانی پت وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مصادر کی تلخیص ایلیٹ اور ڈاسن کی تاریخ میں بھی ملتی ہے، مگر ذکرِ میر سے ایک مصدرِ تاریخی کی حیثیت سے استفادہ کسی نے نہیں کیا۔

بہت سے واقعات کی طرف میر نے صرف اشارہ کیا ہے، اس اشارے کی مدد سے اور دوسرے مصادر سے مقابلہ کر کے واقعات کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ تاریخی طور پر زیادہ

معتبر ہوسکتی ہے۔ یہاں صرف کتاب کے آخری حصّے کا مختصر مطالعہ بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

میر جنگ سکرتال میں موجود ہیں (۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء) وہ کہتے ہیں کہ ضابطہ خاں کو بغیر جنگ کے ہی بھگادیا۔ وہ اپنے حرم کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر نکل بھاگا تھا جس کی تاریخ مرزا سودانے کہی تھی: "غوث گڑھ سے گیا وہ کھو کر شرم" (۱۱۸۶ھ) [1] (=۲۳ فروری ۱۷۷۲ء)۔ ذکر میر (طبع اول ۱۲۲) میں نجف خاں دیلو جان و موسیٰ مدک فرنگی" چھپا ہے یہ دیلو جان نہیں وبلوچان (یعنی بلوچ فوج) ہے جو موسوی خاں کے بھائی سید محمد خاں بلوچ کی کمان میں تھی۔ موسیٰ مدک دراصل موسیو مدک ہے یہ فرنگی نہیں فرانسیسی تھا اس کا پورا نام MONSIEUR RENE MADEC ہے اس کے حالات میں ایک کتاب بھی ملتی ہے۔ مدک کو شاہ عالم نے نواب شمس الدولہ بہادر قائم جنگ خطاب اور شش ہزاری ذات وسوار منصب دیا تھا وہ بھرت پور کی ملازمت چھوڑ کر دہلی میں ۱۷ نومبر ۱۷۷۲ء کو شاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا [2]

کتاب کے آخری حصّے میں بڑے واقعات کو ایک دو لفظوں میں ہی سمیٹ لیا گیا ہے مثلاً نجف خاں کے حال میں وہ کہتے ہیں" اب آن (نواب حسام الدولہ) کے اشارے پر مرہٹہ سردار قوم کو شہر سے نکالنے کے درپے ہے" یہ سطریں ۷ جنوری ۱۷۷۳ء کے آس پاس لکھی گئی ہیں جب مرہٹوں نے نجف خاں کے مکان کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اِسی میں آگے مرہٹوں سے عہدو پیمان کرنے کا اشارہ ہے نجف خاں نے ۲۰ جنوری ۱۷۷۳ء کو تین ہزار روپیہ یومیہ پر مرہٹوں کی ملازمت قبول کر لی تھی۔ نصرانیوں کی مدد لے کر شجاع الدولہ نے فرخ آباد پر حملہ کیا یہ ۳ مارچ ۱۷۷۳ء کا قصّہ ہے مرہٹوں نے اس سے ۲۱ اپریل ۱۷۷۳ء کو صلح کر لی تھی۔ نجف خاں مرہٹوں کی مدد سے دوبارہ شہر میں ۲۰ مئی ۱۷۷۳ء کو داخل ہوا تھا۔ مجد الدولہ ۲۲ مئی ۱۷۷۳ء کو دیوانی خالصہ پر فائز ہوا۔ حسام الدین خاں ۵ جون ۱۷۷۳ء کو قید کیے گئے۔ نجف خاں اور جاٹ سردار نول سنگھ کا مقابلہ ۳۰ اکتوبر ۱۷۷۳ء کو ہوا۔ جنوری ۱۷۷۶ء میں نول سنگھ مرگیا۔ اب سورج مل کے چوتھے بیٹے رنجیت سنگھ نے مقابلہ

---

[1] اس سے تاریخ یوں برآمد ہوگی کہ "غوث گڑ" کے اعداد ۱۲۶۶ء میں سے شرم کے اعداد ۵۴۰ گھٹا دیے جائیں۔ [2] E. BARBE : L' Nabob Rene Madec

کیا اُس کی ماں کشوری نے فروری ۱۷۷۸ء میں صلح کرلی۔

غرض اِن سب وقائع کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ آخر کتاب میں میرؔ نے تقریباً (۲۰) برس کے حوادث کو (۲۰) ہی صفحات میں بیان کردیا ہے لیکن ان اشاروں میں بھی بہت سی کام کی باتیں آگئی ہیں۔

ذکرِ میر کا فارسی متن (۷۰) سال کے بعد دوبارہ چھپ رہا ہے تو یہ اُردو ترجمہ ۴۴ سال کے بعد۔ اِس تاخیر کے اسباب و عوامل اگر تفصیل سے لکھوں تو ایک اور "ذکرِ میر" تیار ہو جائے گی۔ میں نے اِس کا مقدمہ بہت تفصیل سے لکھا تھا، اسی طرح فرہنگ بھی سخت تلاش و جستجو سے کئی ماہ کی محنت سے تیار کی تھی، افسوس کہ یہ دونوں ضائع ہوگئیں۔ اب یہ مقدمہ صرف تکمیلِ رسم کے لیے چند روز کی کاوش سے لکھا گیا ہے، اِسی طرح فرہنگ بھی۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو آئندہ ایڈیشن میں اسے اور سنوارنے کی کوشش کی جائے گی۔ وماتوفیقی الّا باللہ العلی القدیر۔

اِس کتاب کی اشاعت پر پہلا حق انجمن ترقی اُردو (ہند) ہی کا تھا مجھے خوشی ہے کہ انجمن کی ادبی کمیٹی نے اِس کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ میرے عزیز دوست اور انجمن کے نہایت فعال جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لی اور بار بار تقاضا کرتے رہے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نثار احمد فاروقی

دہلی یونیورسٹی دہلی،

۱۵ رجون ۱۹۹۶ء

عرضِ حال

کئی سال ہوئے میں نے متعدد لغاتِ فارسی خصوصاً لغت نامۂ دہخدا کو سامنے رکھ کر زیرِ نظر کی فرہنگ پوری وضاحت اور حوالوں کے ساتھ تیار کی تھی، اِس طرح کتاب کی طباعتِ ثانی کا مقدمہ بھی تفصیل سے لکھا تھا اور اس کتاب کے ادبی، تاریخی، سیاسی اور لسانی ہر پہلو سے گفتگو کی تھی لیکن ہوا یہ کہ جس ناشر سے اِس کی اشاعت کا معاملہ تھا اُن کا انتقال ہوگیا اور یہ دن دیکھنا پڑا کہ :

چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

بہت ہی حیلہ و تدبیر سے کتاب کے کتابت شدہ اوراق تو حاصل کر لیے گئے مگر مقدمہ کا مسودہ اور فرہنگ کے تقریباً ۱۴ صفحات جان بوجھ کر دبا لیے گئے۔ میں نے یہ مختصر سی فرہنگ چند روز محنت کر کے دوبارہ تیار کی ہے، مگر اس میں متعدد الفاظ شامل ہونے سے رہ بھی گئے ہیں۔ لغت نامۂ دہخدا سے استفادے کا اب وقت نہیں تھا اِس لیے اُسے بہ شرطِ توفیقِ الٰہی آیندہ ایڈیشن کے لیے موقوف رکھا ہے۔ مقدمہ بھی مختصر کر دیا ہے۔

کسی کتاب کا مسودہ دوبارہ لکھنا مصنف کے لیے بڑی آزمایش ہوتا ہے۔ میں نے اس کا اظہار اس لیے ضروری سمجھا کہ قارئین کرام ہمارے معاشرے کے غیر علمی مزاج کو دیکھیں اور اس میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہے تو مجھے معذور جان کر معاف رکھیں۔

نثار احمد فاروقی

دیباچہ

بے حد تعریف اُس سخن ور کی ہے جس کی یکتائی کا شاہ بیت سارے عالم میں مشہور ہوا اور بے حساب حمد اُس صنعت گر کی، جس نے معانی کے موتیوں کو نظم و نثر کی لڑی میں پرویا۔ وہ قادرِ سخن جو زبان کو کلام کے ہزار رنگ تعلیم کرتا ہے، وہ معلم کہ ہر عاجزِ سخن انسان کو زبان دیتا ہے، وہ پیدا کرنے والا، کہ تمام مخلوقاتِ عالم کو نوازتا ہے، وہ صانع کہ خاک کو انسان بنا دیتا ہے، وہ رکھوالا جس کے بغیر ہماری سلامتی محال ہے، وہ فن کار جس کی نقل اُڑانے کی کس کو مجال ہے، وہ علیم جس کے دائرۂ علم میں ہیں تمام مرکب اور بسیط۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْط (یقیناً خدا تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے)۔ وہ حکمت والا جو سب بھید جانتا ہے، وہ قدیم کہ ہستی صرف اُسی کی ہستی ہے، وہ رزّاق جو رزق دیتا ہے، وہ مالک جو زندگی بخشتا ہے، وہ رحیم کہ گنہ گاروں کی توبہ سُنتا ہے، وہ کریم جو عطائیں کرتا اور خطائیں ڈھکتا ہے۔ سورج اُس کے ظہور کا ایک ذرہ ہے اور چاند اُس کے نور کا ایک شمّہ۔ کوئی شے اُس کے نور سے خالی نہیں، غرض کہ "اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے"۔
چونکہ اُس کا ناز، نیازمندی کو پسند کرتا ہے، اس لیے جو سر جُھکاتا ہے وہ اُسے نااُمید نہیں کرتا۔ وہ کرتار ہے اور اُس نے کیا کیا پیدا کیا ہے، وہ دیکھنے والا ہے جو سب کی ڈھکی چُھپی باتوں کو دیکھتا ہے۔ اگرچہ فلکِ کج رفتار مجھ سے کج بازی کرتا ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ بے آبرو نہ ہونے دے گا۔ کونسی زبان ہے جو اُس کا نام نہیں جپتی اور کونسی جان ہے جو اُس کے اوصاف کے گیت نہیں گاتی۔

وہ خبیر جو ہر شخص کے حال کی خبر رکھتا ہے، وہ بصیر جو سب پر نگاہ رکھتا ہے اُس کے گُل ہائے ناز چُننے کے لیے نیاز کی ضرورت ہے اور اُس کی تازہ کاری کا تماشا کرنے کے لیے آنکھ درکار ہے، وہ یکتا جو صفتِ یکتائی سے موصوف ہے، وہ احد جو اپنی وحدانیت سے معروف ہے، وہ رفیع جس کی بارگاہ تک فرشتے بھی نہیں جاسکتے، وہ سمیع جو ہر عاجز کی التجا سُنتا ہے قلم و زبان کی یہ مجال کہاں کہ اُس کے کمالات کو ایک ایک کر کے لکھ سکے، ہاں وہ خود اپنی تعریف کرے تو اپنے کمالات (کے بیان) سے عہدہ برآ ہو جائے!

نعت بے حد درود اُس فصیح پر جس نے فصاحت کا میدان جیت لیا اور بے شمار سلام اُس بلیغ پر جو خدا تک پہنچا اور مغرور نہ ہوا۔ وہ بادشاہ جو سراپا جلال و جبروت ہے، وہ روشن چاند جو کفر و گمراہی کی تاریکی کا مٹانے والا ہے، وہ پیشوا جس کی قیادت کے بغیر کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکتی، وہ رہنما جس کی رہبری نہ ہو تو کوئی راستہ نہیں سُوجھ سکتا۔ وہ امیر جس کے فرمان کو ہم دل و جان سے قبول کرتے ہیں، وہ دستگیر کہ توفیق ہو تو اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ صبیح جس کی صباحت آئینۂ عالم کو روشن کرنے والی ہے، وہ ملیح جس کی ملاحت نوعِ انسان کے رُخساروں کا نمک بن گئی ہے۔ وہ نگار جس کے پاؤں تلے کی خاک جانوں کا فدیہ ہے، وہ بہار جس کے سبز جھنڈے کے سائے میں ایک زمانہ چل رہا ہے، وہ مددگار کہ حشر والوں کی نگاہیں اُس کی شفاعت پر لگی ہوئی ہیں نہیں نہیں بلکہ دونوں عالم کا کام اُس کی عنایت سے چل رہا ہے۔ خدا کی رحمت اور درود و سلام ہوں اُس پر اُس کی پاک اور طیب و طاہر اولاد پر جن میں سے ہر ایک مومنوں کا امام اور گناہ گاروں کا شفاعت کرنے والا ہے۔

عرضِ مصنّف تمام موجودات کے معبود اور خالقِ وَدُوْد کی تعریف، نیز اُس صاحبِ مقامِ محمود یعنی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) پر بے شمار درود اور بے حساب سلام بھیجنے کے بعد، فقیر میر محمد تقی المتخلص بہ میرؔ کہتا ہے کہ میں ان دنوں بیکار تھا اور کسی مونس کے بغیر گوشۂ تنہائی میں پڑا ہوا تھا، اپنا یہ احوال جس میں زمانے کے حوادث، سوانح نیز حکایتیں و روایتیں بھی آگئی ہیں میں نے لکھ ڈالا، اور یہ کتاب جس کا نام ذکرِ میرؔ ہے، کچھ لطیفوں پر ختم کی۔ دوستوں سے اُمید ہے کہ اگر کوئی غلطی پائیں تو از راہِ عنایت چشم پوشی کریں اور اصلاح کر دیں۔

میرے بزرگ میرے بزرگ اپنی قوم و قبیلے کے ساتھ زمانے کی نامُساعدت کے باعث کہ اِن اوقات میں صبح بھی شام نظر آتی ہے، ملکِ حجاز سے رختِ سفر باندھ کر دکن کی سرحد پر پہنچے (راہ میں) اُنھوں نے بڑی کڑیاں جھیلیں اور پاپڑ بیلے، اور وہاں سے احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے۔ بعضوں نے جی چھوڑ کر وہیں ڈیرے ڈال دیے اور کچھ نے آگے بڑھ کر روزگار تلاش کرنے کی ہمت کی۔ چنانچہ میرے جدِ کلاں نے مستقرِ خلافت اکبر آباد (آگرہ) میں اِقامت اختیار کی۔ یہاں آب و ہوا کی تبدیلی سے بیمار پڑ گئے اور جہانِ آب و گِل کو خیرباد کہا۔ اُن سے ایک لڑکا یادگار رہا جو میرے دادا تھے۔

میرے دادا کمرِ ہمت کس کر تلاشِ روزگار میں نکلے، بڑی تگ و دو کے بعد "فوجداریِ گردِ اکبر آباد"، پر فائز ہو گئے۔ وہ آدمیانہ بسر کرتے تھے، جب اُن کا سنِ شریف پچاس کے قریب پہنچا تو مزاج اعتدال سے منحرف ہو گیا، کچھ دنوں علاج کیا ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے کہ گوالیار[۱] جانا ہوا، (راستے کے) اِن جھٹکوں سے، جو نقاہت میں زہر کا اثر رکھتے ہیں، پھر بیمار پڑے اور انتقال کر گئے۔ اُن کے دو لڑکے تھے۔ بڑے تو خللِ دماغ سے خالی نہ تھے، جوانی میں مَرے اور بِسَر گئے۔ اُن سے چھوٹے

---

[۱] "گوالیار نامی قلعہ ہے، آب و ہوا اس کی نہایت خوب۔ اُستواری مضبوطی بھی نپٹ مشہور، با اسلوب۔ سلطنت کے جو زندانی قابلِ حفظ کے ہوتے تھے اُن کا ٹھکانا وہیں تھا۔ باشندے وہاں کے بمرتبہ زبان آور اور گویّے نہایت با اثر اور محبوب، دلرُبائی میں خوب، چالاک اور قیامت کے بے باک ہوتے ہیں۔ مزار شیخ محمد غوث کا بھی وہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ شیخ مذکور اپنے عہد کے صاحب کمالوں میں ممتاز تھا اور تسخیر مریخ اُس کے عمل میں تھی۔" (شیر علی افسوس: آرائشِ محفل / ۸۷-۸۸)

میرے والد تھے، انھوں نے ترکِ لباس کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ علمِ ظاہری کی تحصیل جس کے بغیر عالمِ معنی تک پہنچنا دشوار ہے، شاہ کلیم اللہ[۱] اکبر آبادی سے کی جو وہاں (آگرے) کے اولیائے کاملین میں سے تھے اور کڑی ریاضت کر کے دولتِ باطنی حاصل کر لی۔ انھوں نے ترک و تجرید کی کوشش میں بڑے مجاہدے کیے اور ان بزرگ کی رہنمائی سے درویشی کی منزل تک پہنچ گئے :

پس از خرابیِ بسیار دل بدست افتاد

والد کا عقیدہ وہ جوانِ صالح اور عاشق پیشہ تھے، دل میں عشق کی گرمی رکھتے تھے۔ علی متقی کے خطاب[۲] سے ممتاز ہوئے۔ نقل ہے کہ ایک دن انھوں نے شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے اپنے عقائد جیسا کچھ درست کر لیے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے لیکن حاکمِ شام[۳] کے

۱۔ شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی کے وقائع، حالات اور ملفوظات نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے یہ اتنے بڑے آدمی نہ تھے کہ ان پر کوئی مستقل کتاب لکھی جاتی۔ البتہ تاریخ محمدی مصنفہ مرزا حارثی بدخشی میں سنہ ۱۰۶۱ھ کے مرنے والوں میں اُن کا ذکر اس طرح ملتا ہے: "شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی، جامع المعقول والمنقول در اکبر آباد فوت شد۔" (صفحہ ۱۰۱۳)

مصنف تاریخ محمدی نے، کوئی کتاب ہے 'اُفق المبین' اُس کے حوالے سے اُن کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ اسی کتاب میں متعدد اہلِ ظاہر و باطن بزرگوں کی تاریخ وفات لکھتے ہوئے اُفق المبین کا نام لکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مصنف کون ہے؟" (اقتباس از مکتوب مولانا امتیاز علی خاں عرشی، موسومہ مترجم)

۲۔ میر کی ایک تحریر سے، جو اسی کتاب میں آگے آئے گی، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اُن کے والد کا نام میر محمد علی تھا اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے وہ "علی متقی" مشہور ہو گئے تھے، لیکن یہ "خطاب" دیا کس نے تھا؟ میر نے نہیں بتایا۔ عجب نہیں پیر و مرشد کے دربار سے ملا ہو۔

۳۔ مولوی عبدالحق، مرتب ذکرِ میر نے اس موقع پر سرخی قائم کی ہے "باپ کی، اپنے پیر سے گفتگو دربارۂ یزید" لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں "حاکمِ شام" سے مراد حضرت امیر معاویہؓ ہیں وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت (۱۳ھ/۶۳۴ء تا ۲۳ھ/۶۴۴ء) میں چار سال اور حضرت عثمانؓ کے عہد (۲۳ھ/۶۴۴ء تا ۳۵ھ/۶۵۵ء) تک شام کے حاکم رہے تھے۔ ۴۱ھ/۶۶۱ء میں خود خلیفہ ہوئے اور ۶۰ھ/۶۸۰ء میں انتقال فرمایا۔

یہاں "عقائد کو درست کرنے کی بات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ پہلے میر کے والد سنّی تھے اور شیخ کلیم اللہ کی صحبت میں رہ کر تشیع یا تفضیلیت کی طرف مائل ہوئے۔ امیر معاویہؓ کے سیاسی کردار سے متعلق بہت سے (باقی حاشیہ ص آیندہ)

بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟" شاہ صاحب نے فرمایا: "بتادیں گے!"

مدّت کے بعد ایک دن منھ اندھیرے، محرم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے ملازم شیخ کے وضو کے لیے پانی فراہم کرنے کو دوڑے مگر والد خود اُٹھے اور لوٹا ہاتھ میں لے لیا، (شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے) اُس وقت شاہ صاحب نے ہاتھ منھ پر پانی ڈال کر فرمایا: "میاں علی متقی! تمام عمر اُس کا نام میری زبان پر نہیں آیا' میرا منھ نہیں کہ اس کے لیے خدا کا شکر ادا کروں!" میرے والد کہتے تھے: "خدا کا شکر ہے پھر میں نے بھی کبھی اُس کا نام نہیں لیا"[۵۱]

تعلیمِ عشق

وہ روز و شب خدا کی یاد میں رہتے تھے۔ خدا نے کبھی انھیں شرمندہ نہیں کیا۔ کبھی موج میں آتے تو فرماتے: "بیٹا[۵۲] عشق کرو، عشق ہی اِس کارخانے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اہلِ سنّت والجماعت حضرات کو بھی شبہ رہتا ہے' یزید بن معاویہ کی سیاسی غلطیوں پر اکثر اتفاق رائے رہا ہے' اس لیے علی متقی کا یزید بن معاویہ کے بارے میں استفسار کرنا اتنا قرینِ قیاس نہیں جتنا یہ کہ انھوں نے حضرت معاویہؓ کے متعلق اپنا عقیدہ درست کرنے کے لیے سوال کیا ہو۔

۵۱ علی متقی کے پوتے محسن نے محاکمات الشعرار کے مقدمے میں (کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور میں صرف مقدمہ ہے) اپنے متعلّق لکھا ہے کہ میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے پاس جا کر کتب تفسیر و حدیث مثل کشّاف و بیضاوی و جلالین و مدارک و تفسیر کبیر و صحیح بخاری و صحیح مسلم و صحیح ترمذی و مُسند امام حنبل و مسند امام مالک وغیرہ سے متعلق تحقیق کرتا تھا۔ اس نے کسی شیعہ عالم کے پاس جانے یا شیعوں کی مذہبی کتابوں کے بارے میں تحقیق کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اُس کے سنّی ہونے پر مشعر ہے اور اس خیال کو کہ علی متقی سنّی تھے اِس سے تقویت پہنچتی ہے۔"

محسن، حبیب اللہ پسر شاہ کلیم اللہ کا مرید تھا، وہ لکھتا ہے کہ شاہ صاحب، اپنے وقت کے قطب تھے اور ان کے خلیفہ و جانشین، عماد الدین مشہور بہ درویش محمد تھے۔ (معاصر ۱۴/۳۴-۳۵)

۵۲ عشق کا بڑا وصف یہ ہے کہ تمام رذیل اخلاق شریفانہ اخلاق سے بدل جاتے ہیں۔ بغض، کینہ، حسد، خود پرستی، فخر، غرور فنا ہو جاتے ہیں۔ طبیعت میں رقّت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے اور انسان ایک عام محبت اور کشش سے لبریز ہو جاتا ہے۔ حضراتِ صوفیہ جب طالب کو تزکیۂ نفس کی تعلیم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے عشق و محبت کی تعلیم دیتے ہیں۔ کہ یہ صیقل تمام زنگ کو پاک کر دے گا۔ اس مضمون کو نظیری اس طرح ادا کرتا ہے:-

ہیچ اکسیر بتاثیرِ محبّت نرسد　　　　کفر آوردم و در عشقِ تو ایماں کردم

(شبلی شعر العجم ۵/۷۳-۷۴، طبع ۱۹۴۴ء)

یہ اور بات ہے کہ میر کے سیرت نگار کو یہ سارے اوصاف اُن کی سیرت میں نہ مل سکیں۔

میں متصرّف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظمِ کُل قائم نہیں رہ سکتا تھا[۵۱]۔ بے عشق زندگی وبال ہے، عشق میں جی کی بازی لگا دینا کمال ہے عشق بناتا ہے، عشق ہی کُندن کر دیتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ عشق کی سوزش ہے، پانی عشق کی رفتار ہے، خاک عشق کا قرار ہے، ہوا اُس کا اِضطرار ہے، موت عشق کی مستی، زندگی عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب اور دن عشق کی بیداری ہے مسلمان عشق کا جمال ہے، کافر عشق کا جلال ہے، نیکی عشق کا قرُب ہے، گناہ عشق کی دُوری ہے، جنّت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام عبودیت و عارفیت وزاہدیت وصدیقیت و خلوصیت ومُشتاقیت وخلیت وحبیبیّت سے بہت بلند ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ آسمانوں کی گردش بھی 'حرکتِ عشقی' ہے، یعنی وہ اپنے مطلوب تک نہیں پہنچتے اور سرگرداں ہیں ؎

بے عشق نباید بودٗ بے عشق نباید زیست　　پیغمبر کنعانی، عشقِ پسرے دارد[۵۲]

وہ دن بھر عالمِ حیرت میں رہتے اور راتوں کو جاگتے۔ اکثر جبینِ نیاز جُھکی رہتی۔ ہمیشہ شرابِ شوق سے سرشار اور دامن پاک۔ اُن کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کا رونق افزا تھا۔ وہ اِک آفتاب تھے، مگر اپنے سائے سے بھی گریزاں۔ کبھی آپ میں آتے تو کہتے: "بیٹے دنیا اک ہنگامے سے زیادہ نہیں، تمھیں چاہیے کہ اس سے ترکِ تعلّق کر لو اور اپنے دامن پر علائق کی گرد نہ جمنے دو، عشقِ الٰہی کو اپنا پیشہ کرو، عاقبت کا دن درپیش ہے، اپنا اندیشہ کرو، جو اہل ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا سہل (حقیر) ہے، زندگی ایک وہم ہے، وہم کی بُنیاد پر (اُمیدوں کے محل) بنانا پانی کو رسّی سے باندھنا ہے، اور طولِ اَمل میں پھنس جانا چاندنی کو گزوں سے ناپنا ہے۔ آہ بے خبر نہ رہنا کہ چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ زادِ راہ کی فکر کرتے رہیو تاکہ راہ میں کام نہ آجاؤ، ارے اُس کی طرف دیکھو عالم کو جس کا آئینہ کہتے ہیں، اپنی ذات کو اُسے

---

۵۱ یہ نہ ہووے تو نظمِ کُل اُٹھ جائے　　سچے ہیں عاشقاں خدا ہے عشق　　(دیوان اول)

۵۲ (مطلب) عشق کے بغیر (قائم) نہیں رہا جا سکتا، نہ بغیر عشق زندہ رہ سکتے ہیں۔ (دیکھو پیغمبر کنعانی (حضرت یعقوب علیہ السلام) بھی اپنے بیٹے سے عشق کرتے تھے۔

سونپ دو جسے دل میں تلاش کرتے ہیں، مقصود کا ملنا یقینی ہے بہ شرطیکہ ذوقِ طلب سچا ہو، اگرچہ ہر شے میں اُسی کا جلوہ ہے مگر ہمیں اس کے اظہار میں شرطِ ادب ضروری ہے۔
(نکتہ) خدا کا اپنے بندوں سے وہی تعلق ہے، جو روح کا جسم سے ہے، یعنی تمہارا وجود بغیر اُس کے اور اُس کی نمود بغیر تمہارے نہیں۔ کائنات ظہور میں آنے سے پہلے عینِ ذات تھی، اور نمودِ صُوری کے بعد وہی ذات عینِ کائنات ہے! ؎

مشکل حکایتے ست کہ، ہر ذرّہ عینِ اوست
امّا نمی تُوان کہ اِشارت، بدُو کنند[۱]

وہ درویش اور درویش پرست تھے، شکستہ دل اور شکستگی کے مشتاق، عجب نیازمند مسافر در وطن، وسیع المشرب فقیرِ کامل اور پانی کی طرح ہر رنگ میں شامل، جب کبھی مجھے گود میں اُٹھا لیتے اور پیار کی نظروں سے میرا کاہی رنگ دیکھتے تو کہتے: "اے سرمایۂ جان، یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں چھُپی ہے، یہ کیسی جلن ہے جو تیری جان کو لگی ہے"، میں ہنستا جاتا اور وہ روتے رہتے۔ افسوس میں نے اُن کی زندگی میں اُن کی قدر نہ جانی، وہ اِک انسان تھے اپنے مقامات میں گُم، کبھی کسی کے لیے بارِ دوش نہ بنتے تھے۔
ایک دن اِشراق کی نماز کے بعد میری طرف توجّہ فرمائی، اور مجھے کھیل کود میں محو پایا بولے: بیٹے زمانہ بہتا ہوا وقت ہے، یعنی بہت کم فرصت، اپنی تربیت سے غافل

---

[۱] مشکل بات تو یہ ہے کہ ہر ذرّہ عین ذاتِ خداوندی ہے، پھر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ اُس (ذاتِ خداوندی) کی نشان دہی کر سکیں؛ (یعنی کسی چیز کو لے کر کہہ سکیں کہ یہ خدا ہے، حالانکہ ہر شے کا ظہور خدا کی ذات سے قائم ہے) یہ شعر فغانی کا ہے اور اُس نے عطّار کے اس مضمون سے استفادہ کیا ہے۔

پُر شد از دوست ہر دو کون ولیک   سُوے او زہرۂ اشارت نیست   (شعر العجم ۲/۱۳)

میر کہتا ہے:۔ پایا نہ یوں کہ کریے اُس کی طرف اشارت   یوں تو جہاں میں ہم نے اُس کو کہاں نہ پایا (دیوان اوّل)

فغانی کا وطن شیراز ہے، یہ سلطان یعقوب فرماں روائے تبریز کے دربار سے وابستہ تھا۔ ۹۲۵ھ میں مشہد میں وفات پائی۔ ایک طرزِ نو کا موجد سمجھا جاتا ہے۔
(شعر العجم ۳/۲۴)

نہ رہو، اِس راستے میں بڑے نشیب و فراز ہیں دیکھ بھال کر چلو۔

نشانِ پائے تو فردِ حسابِ زندگی است
قدم شمردہ، درین کہنہ خاک دان بردار[۱]

یہ کیا کھیل رہے ہو، کس واہیات میں پھنسے ہو، ارے اُس سے لو لگاؤ آسمان جس کی رنگین خرامی کی بَلائیں لیتا ہے، اُس کو دل دو جس کی ہر آن پر دل اور جانیں واری ہوں، اُس گل کی بُلبل بنو جو ہمیشہ بہار ہے۔ اُس سادہ پر مٹو جو سَدا سُہاگ ہے، آسمانِ دو رنگ کی چال کسی کے لیے بدلتی نہیں، جلدی کرو، فرصت کو غنیمت جانو اور اپنے تئیں پہچان لو۔

اُن کی متبرک صورت اِس تمام عالمِ اجسام میں معنیٰ مجسّم تھی، وہ ایسے متین آدمی تھے کہ اُنھوں نے عنانِ اختیار کبھی اپنے ہاتھوں سے نہیں جانے دی۔ ایسے پرہیزگار کہ کسی نامحرم کی آنکھ کبھی اُن کے ہاتھ پاؤں پر نہیں پڑی۔ اگر تم دیکھتے تو کہتے کہ شاید فرشتہ اور یہ عزیز ایک ہی صورت کے دو رُوپ ہیں۔ اگلوں نے بھی ایسی خوبی سے استقامت کا ثبوت کم ہی دیا ہے۔ اخلاق حمیدہ، اوصاف ستودہ، طبع مشکل پسند، جان دردمند، آنکھیں نَم اور حال دَرہَم۔

لاہور کا سفر

نقل ہے: ایک دن گھر میں پریشان حال داخل ہوئے؛ بوڑھی ماما بیٹھی تھی اُس سے کہا: "بڑی بی، آج میں بہت بھوکا ہوں۔ صبر کی تاب نہیں ہے۔ اگر ذرا سا روٹی کا ٹکڑا مل جائے تو جان میں جان آجائے۔" ماما نے کہا: "گھر میں تو کچھ ہے نہیں۔" اِنھوں نے پھر کہا: "بھوکا ہوں" ماما اُٹھ کر گئی، اور بنیے سے آٹا اور گھی لائی تاکہ روٹی پکائے۔ اِس بار پھر اُنھوں نے بھوک میں بے صبری کا اظہار کیا۔ ماما جھنجھلا اُٹھی، تڑخ کر بولی: "میاں یہ فقیری ہے اس میں ناز نخرے نہیں

[۱] تمھارے نقشِ پا بھی زندگی کے حساب کی کھتونی ہیں، اِس دنیا میں قدم بھی گن گن کر رکھنے چاہئیں۔ (یعنی زندگی کو بے مصرف و بے مقصد نہیں گنوانا چاہیے۔)

چلتے،، والد صاحب نے کہا: "اچھا بڑی بی تم اطمینان سے روٹی پکاؤ، میں ایک فقیر کو دیکھنے لاہور جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اپنا رومال اُٹھایا جو گریہ شبی سے بھیگ کر بادل کا گالا بن گیا تھا، اور چل پڑے۔ جب ماما نے دیکھا یہ رُوٹھ کر جا رہے ہیں تو دوڑی اور رو کر دامن سے لٹک گئی، مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا، مجبوراً آئینے پر پانی ڈال کر شگون پورا کیا[۵۱]۔ وہ جہاں منزل کرتے خدائے کریم کی شانِ رزّاقی کام کرتی تھی۔ کچھ دنوں میں لاہور پہنچ گئے اور اُس مکّار درویش کو دیکھا جو ایک دریا کے کنارے جسے راوی کہتے ہیں، بیٹھا رہتا تھا اور دنیا کو فریب دیتا تھا، وہ "خفشان نمود[۵۲]" کے نام سے مشہور تھا۔ فارسی کے کچھ الفاظ

---

۵۱ یہ سفر کا شگون ہے اور ایرانی رسم ہے۔ ہندوستان میں نہیں سُنی گئی۔ فارسی میں آب برآئینہ ریختن وزدن آتا ہے، مگر اردو میں بھی استعمال ہوا ہے:-

اشکوں سے شگون کیا نرالا   آئینۂ رُخ پہ پانی ڈالا   (گلزارِ نسیم)

غالباً نرالا کا لفظ خود اس رسم کے عام نہ ہونے کی غمازی کر رہا ہے۔

۵۲ خفشان نمود کا تعلق میر محمد حسین مشہدی کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے جس نے عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء کے بعد ایک نئے مسلک کی بنیاد ڈالی تھی، وہ اپنے تئیں "بیگوک" کہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر نبی کے ۹ بیگوک ہوتے ہیں اور میں دینِ محمدی کا آخری بیگوک ہوں۔ میر محمد حسین، عمدۃ الملک امیر خاں صوبیدار کابل کی لے پالک کا شوہر اور امیر خاں کا داروغہ خوشبوخانہ تھا۔ وہ علومِ متداولہ میں کافی دستگاہ رکھتا تھا اور نہایت شیریں بیان و نغز گفتار تھا۔ اس نے عمدۃ الملک امیر خاں اور عالمگیر کی وفات کے بعد بہادر شاہ اوّل کے عہد میں نیا ڈھونگ رچایا، اپنا نام 'نمود وانمود' یا 'نمود اللہ' رکھا اور اپنا مرتبہ نبوّت وولایت کے درمیان ظاہر کیا۔ ایک کتاب "اقوزۂ مقدسہ" کے نام سے تصنیف کی اور اسے الہامی ظاہر کیا۔ اس نے ایسے الفاظ اور فقرے وضع کر رکھے تھے جو قطعاً مہمل تھے اور جن کا مطلب خود اُسے بھی معلوم نہ تھا۔ اس کے مرید "فرلود" کہلاتے تھے اور سلام کی جگہ "نمود بودال" کہتے تھے۔ ۹ ذی الحجہ اُن کا مذہبی جشن کا دن تھا اور نماز بھی سب سے علیحدہ تھی جسے وہ "دید" کہتے تھے۔ نما نمود، خفا را اور دیدا اُس کے بیٹے تھے اور دو بیٹیاں نمانہ خورد و نمانہ کلاں تھیں۔ فرخ سیر کے زمانے میں اُس کے فریب کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ چنانچہ ایک دن فرخ سیر خود نیازمندانہ اُس کے حجرے میں آیا اور قدم بوس ہوا۔ بادشاہ کی عقیدت دیکھ کر عوام جہلا میں میر محمد حسین کا مرتبہ اور بھی بڑھ گیا۔ محمد شاہ کے زمانے میں قمرالدین خاں وزیر کے والد نواب محمد امین خاں نے اُسے گرفتار کرنا چاہا مگر وہ خود اُس کے دامِ فریب میں آگیا۔ اتفاق سے محمد امین خاں بیمار پڑ گیا اور اُسے یہ گمان ہوا کہ محمد حسین کی بددعا سے میری شامت آئی ہے، وہ اُلٹا معافی کا خواستگار ہوا اور پانچ ہزار روپے نذر بھیجے، مگر محمد حسین اکڑ گیا اور اس سے عوام میں اُس کی ساکھ بڑھ گئی۔ اس کی موت کے بعد بڑا بیٹا نما نمود سجادہ نشین ہوا لیکن اس نے باپ کے خلیفۂ اوّل شریکِ کار اور رازدار

(باقی آگے)

اُس نے رَٹ لیے تھے۔ گھامڑ لوگ جو اُن الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ پاتے تھے اُس کے آگے ناک سے لکیریں کھینچتے تھے۔ بولا "میں حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دین کی تائید کر رہا ہوں، جاہل لوگ مجھے بہکانے والا سمجھتے ہیں۔" میرے والد یہ سُن کر بھڑک گئے اور کہنے لگے: "ابے او کمینے ہمارے پیغمبرؐ کا دین تجھ ایسوں کی تائید کا محتاج نہیں۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کر، یہاں تلوار درمیان ہے، ایسا نہ ہو مارا جائے۔"

غرض ملاقات کی ابتدا ہی میں بدمزگی ہو گئی۔ میرے والد بہت تُرش رُو ہو کر وہاں سے اُٹھے اور ایک فقیر کے تکیے میں رات بسر کی، جب صبح ہوئی تو وہ ریاکار معذرت خواہی کے لیے آیا۔ میرے والد نے فرمایا کہ: "اب معافی مانگنا بے فائدہ ہے، کل تو کیا کھری کھری سُنائی تھیں جو آج سُناؤں گا۔ جب تیری عیّاری کا پردہ چاک ہو گیا تو معذرت کیسی؟ جا اپنا راستہ ناپ، ایسا نہ ہو کہ سب میں رُسوا ہو جائے۔" اس پر تو وہ شرم سے پانی پانی ہوا، مگر بڑی حد تک اُس کی اصلاح ہو گئی۔ جب یہ صحبت بے مزہ ختم ہوئی تو[۵۱]

لاہور سے واپسی

یکایک اُس عزیز (والد) نے، بارِ سفر جو کچھ بھی نہ تھا اللہ کے توکّل پر، باندھ دیا، اور دس بارہ دن سفر میں رہ کر شاہجہان آباد دہلی پہنچے۔ یہاں شیخ عبدالعزیز عزت[۵۲] کے بیٹے قمرالدین خاں کے مکان میں اُترے، جو صوبے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "دوجی بار" کو خوش نہ رکھا اُس نے پردۂ فریب چاک کر دیا۔ اِس طرح احمد شاہ کے زمانۂ حکومت میں یہ پُرفریب تحریک ختم ہو گئی۔

میر محمد حسین کے پیروکار خلیفہ اور مرید ساری سلطنت میں پھیل گئے اور اُنھیں "نشان" یا خطاب عطا کیے گئے تھے۔ "شفقشاں نمود" بھی اسی سلسلے کا مکّار پیروکار تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرالمتاخرین جلد ۳)

۵۱ اِس سفر کا فائدہ کیا ہوا، اور یہ "مناظرہ" کیسا تھا، محمد علی نے کیا خدمتِ دین کی انجام دی، وہ فقیر قائل کب ہوا اور اُس کی اصلاح کہاں تک ہوئی، اِن ساری باتوں پر غور کرنا شاید کسی نتیجے پر نہ پہنچا سکے۔

۵۲ میر سے اُن کی قرابت کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ۔

ئے دیوان تھے اور اُن سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے۔ وہاں عزیزانِ شہر کا ہجوم ہوگیا اور بڑی عقیدت کے ساتھ سب اُن کی خدمت کرنے لگے۔ اُس مردِ خدا کو شرابِ عشق نے مست کر رکھا تھا، بیٹھتا تو بے خودانہ اور اُٹھتا تو مستِ سر انداز کی طرح، عالمِ مستی و بے خودی میں باتیں کرتا تھا، اُس کا ہر جاں سوز سانس شوق کی آگ بھڑکانے والا تھا، بہتوں نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کی، بہت سے اُس کی تاثیرِ نگاہ سے ہوش کھو بیٹھے، اس کے وضو کا پانی بڑی عقیدت سے لے جاتے اور شہر کے بیماروں کو دیتے تھے جو اُسے پیتا تھا اچھا ہو جاتا تھا۔

وہ اتنا روتے تھے کہ ہچکی بندھ جاتی تھی، جو نالہ اُن کے دل سے نکلتا تھا آسمان سے گذر جاتا تھا۔ غلغلہ مچ گیا کہ ایک ایسا درویش شہر میں آیا ہوا۔ اُمرا نے ملاقات کے لیے التماس کیا آپ نے قبول نہ کیا، کہا کہ میں فقیر ہوں، آپ امیر، میرا آپ کا کیا واسطہ؟ امیرالامرا صمصام الدولہ[1] نے حقوقِ سابق کا واسطہ دے کر دوبارہ کہلوایا کہ مجھے دولتِ دیدار سے محروم نہ فرمایئے اگر زراہِ لطف ایسا ہوجائے تو یہ رُوسیاہ بھی سُرخ رُو بندوں کی صحبت میں بار پائے۔ مُسکرائے اور کہا: "ملاقات کے واسطے مناسبت ضروری ہے۔ اُمید ہے آپ مجھے معذور جان کر میرے حال پر چھوڑ دیں گے"۔ جب کثرتِ خلق سے تنگ آگئے تو آدھی رات کو اُٹھے اور تہجّد کی نماز کے بعد شہر سے نکل گئے۔ لوگوں نے اُن کی تلاش میں بہتیرا سر مارا مگر اُن کی گرد بھی نہ پا سکے اور ایسا نشانِ قدم بھی نہ ملا جو اُن کا پتا دیتا۔ (مصنّف)

بہ پاکان کار کے گیرد فلک تنگ　　　　کہ عیسیٰ از سرِ سوزن بُرون شد[2]

---

[1] یہ وہی امیرالامرا ہیں بعد میں جن کی سرکار سے میر کو ایک روپیہ یومیہ وظیفہ ملتا تھا۔ ان کا تعارف آیندہ اوراق میں اسی موقع پر پیش کیا جائے گا۔ [2] (مطلب، پاک دل لوگوں پر آسمان کب سختی کرتا ہے، دیکھو، کہ حضرتِ عیسیٰ کیسی مشکل میں پھنسے تھے مگر کتنی آسانی سے نکل گئے)! اس میں یہ تلمیح ہے کہ حضرت عیسیٰ جب آسمان کی طرف اُٹھائے گئے تو اُن کے دامن میں ایک سوئی اٹکی ہوئی رہ گئی تھی کیونکہ یہ علائقِ دنیوی کی یادگار تھی اس لیے فلکِ چہارم سے اوپر نہ جا سکے۔ انشا کا شعر ہے ؎

سوزنِ عیسیٰ سے رم کرنے لگے قدوسیاں　　　　یہ ضمیمہ رہ گیا تھا عالمِ اسباب کا

دو تین دن میں اکبر آباد (آگرہ) سے تین منزل اُس طرف بیانہ[1] میں مسافرانہ وارد ہوئے جو شرفا کی پرانی بستی ہے۔ یہاں ایک مسجد کے دروازے پر بے کسانہ بیٹھ گئے۔

ایک سیدزادے سے ملاقات

(حکایت) یہیں ایک نوجوان خوش اندام لالہ رُخسار سید زادہ نظر سے گذرا۔ آپ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور جذبِ کامل سے اپنی طرف کھینچ بُلایا۔ اُس غیرتِ پری کی ایسی حالت بدلی کہ دیوانہ وار بے ہوش ہو کر اس مست کے قدموں میں گر پڑا۔ لوگ سمجھ گئے کہ لڑکے کی حالت درویش کی نظروں کے اثر سے دگرگوں ہوئی ہے۔ اُن سے التجا کی کہ اس نوجوان کی حالت پر رحم فرمائیے۔ آپ نے تھوڑا سا پانی منگایا اور کچھ دُعا پڑھ کر اس پر دم کیا۔ جیسے ہی پانی حلق سے نیچے اُترا وہ لڑکا ہوش میں آ گیا اور نہایت ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور عرض کی: "اگر آپ کچھ دن میرے مہمان رہیں اور اس نیازمند کو خدمت گذاری کا موقع دیں تو عین بندہ نوازی ہو گی، ورنہ جس عالم میں آپ ہیں وہاں ناز کا تو گذر بھی نہیں۔ کہ بے نیازی ہی بے نیازی ہے۔" والد صاحب نے فرمایا: کہ "دوستی کی راہ سے (دعوت قبول کرنے میں) کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن میں پابرکاب ہوں۔ کل یہاں سے کوچ کا ارادہ ہے۔" حاضرین نے کہا: "ہم آپ کی مرضی کے تابع ہیں۔ اصرار کرنا تو بے ادبی ہو گی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر آپ اس لڑکے کے گھر تشریف لے چلیں اور کچھ تناول فرمائیں تو یہ آپ کی عنایت سے بعید نہ ہو گا۔"

چونکہ اُس شہر کے عمائد کی بات رکھنی منظور تھی فرمایا: "اچھا، منظور ہے لیکن فقیر کا دل کبھی شاد رہتا ہے کبھی ملول، کوئی ہمارے حال سے تعرض نہ کرے۔" لوگوں نے کہا:

---

[1] بیانہ قدیم زمانے میں ایک بڑا شہر تھا اور قلعہ بھی اس کا نہایت مضبوط بنا ہوا تھا۔ اگلے وقتوں میں گنہگار بندی وانوں کو وہیں رکھتے تھے۔ جہتہ ہی وہاں کی نیٹ رنگین اور آم بھی بہت بڑا وزن میں قریب ایک سیر کے۔ (افسوس: آرائش محفل ۸۹)

"ہماری کیا مجال ہے اور یہ بھلا کیسے گوارا ہوگا کہ حضور کے خلاف مزاج کوئی بات ظہور میں آئے اور یہ سعادت شقاوت میں بدل جائے"۔ غرض وہ لوگ انھیں اپنے ساتھ لڑکے کے گھرلے گئے اور درویش نے بھی وہاں کچھ تناول فرمایا۔

شادی کی مذمّت

اتفاق سے وہ رات اُس لڑکے کی شادی کی رات تھی۔ تھوڑی رات گئے وہ شہر کے معزز لوگوں کو ساتھ لے کر حاضر ہوا اور عرض کی کہ "اگر حضرت بھی قدم رنجہ فرما کر محفلِ شادی کی رونق افزائی کریں تو ہمارے لیے فخر کا باعث ہوگا"۔ فرمایا: "مبارک ہو۔ مگر افسوس کہ شادی خدا پرستی کو مانع ہے"۔

(فائدہ) اے عزیز تو نہیں جانتا کہ لفظِ "داماد" 'دام' اور کلمہ 'آد' سے مرکب ہے۔ جو اہلِ ایران نسبت کے لیے لاتے ہیں: جیسے آباد[1] اور نوشاد میں۔ یعنی جس کی شادی ہوئی وہ اسیر

---

[1] آباد اور نوشاد میں 'آد' کلمۂ نسبت ہے چونکہ ؎ ہرکجا چشمۂ بود شیریں مردم و مرغ و مور گرد آیند اسی لیے آباد رونق کی جگہ کو کہتے ہیں اور آب کے معنی رونق کے بھی ہوئے۔ "نوش" کے معنی فریفتہ کرنے کے ہیں۔ نوشاد ایک شہر کا نام ہے جو حسینوں اور خوب رویوں کی سرزمین مشہور ہے۔ آباد لغت قدیم میں بمعنی ستایش، آفرین، بارک اللہ ہے اور مقابل ویران اور خوش اور خوب اور نیک ہے اور پیغمبرانِ عجم میں سے پہلے پیغمبر کا نام آباد تھا۔ مرکب ہے آب آد سے۔ آد حرفِ نسبت ہے جیسے پیادہ (پے + آدہ) وغیرہ میں۔ چونکہ آب خمیر مایۂ رحمتِ الٰہی کا ہے اور اس کے معنی رونق اور قدر و منزلت کے بھی ہیں اس لیے شہروں اور بسے ہوئے مقاموں کا نام آباد ہوا۔ کہ بارونق ہیں اور اسی واسطے اِن معنی کے لیے مظہر ہیں رحمت و برکات کے بلکہ محرک ہیں ستایش اور نیایشِ الٰہی کے اور مورد میں تحسین و آفرین کے۔ یہ لفظ مستعمل ہوا۔ اور طریق تمدن گواہی دیتا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں جبکہ اولادِ آدم بڑھی ہوگی اور بسبب کثرت کے اطراف عالم میں پھیلی ہوگی [illegible] زمینوں میں سکونت اختیار کی ہوگی اسی بنیاد پر مکانات معمور نے آباد نام پایا ہوگا اور اسی سے ہے بیاباں (بے آبان) یعنی بے آب و گیاہ اور غیر آباد جنگل۔ اسی طرح بنیاد اور پیادہ وغیرہ۔ محمد حسین آزاد: سخن دان فارس ۳۰۸ طبع ۱۸۸۷ء۔

خان آرزو چراغ ہدایت میں لکھتے ہیں: "باید دانست کہ آباد نیز کلمہ مرکب است از آب و آد کہ کلمۂ نسبت است از عالم نوشاد کہ مرکب است از نوش و کلمۂ مذکور، ہمچنیں داماد کہ مرکب است از دام و آد کہ برائے نسبت است بمعنی گرفتار چہ ہر کس کہ کد خدا شد گرفتار گردید و آباد ہم بریں قیاس چرا کہ بے آب معموری محال است پس لفظ آباد و داماد در اصل مجاز باشد کہ حقیقت آنہا مہجور گشتہ"۔ چراغ ہدایت بر حاشیۂ غیاث اللغات، مطبع انوار محمدی۔

صاحبِ غیاث اللغات کا خیال ہے کہ یہ کلمۂ دعائیہ ہے یعنی دائم آباد کا مخفف ہے۔

دامِ بلا ہوا۔ میں تو آزادمنش انسان ہوں اور اس جال سے برق کی طرح نکل گیا ہوں[۵]۔ مجھے اِن باتوں سے کیا سروکار۔ جاؤ، آدمی اس معاملے میں مجبور ہے، میں بھی ابتدائے جوانی میں شرابِ عیش سے سرشار تھا۔ آخر سوائے زحمتِ خمار کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ جب خدا رسیدہ بزرگ نے مجھے اِس گرفتاری سے نجات دی تو میں نے استقامت پیدا کی اور شمع وار ایک پانو پر جلنے لگا۔ — اب تو راکھ کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں ہوں، وہ دل ہی نہیں جس میں ہوس پیدا ہو، نہ وہ دماغ ہے جو فقیر سیر تماشے کی طرف مائل ہو۔ یہ مشعلیں جو تمھارے ساتھ ہیں خطرے کا نشان ہیں، حیرت ہے تم کیسے غزالِ رعنا ہو کہ رَم نہیں کرتے۔ اگر عقلِ سلیم ہو تو اس نکتے کی تہ کو پہنچ جاؤ کہ: "اللہ بس باقی ہوس!"

غرض وہ لڑکا دُلہن کے گھر گیا، اور یہ درویشِ بے نیاز اس شہر سے نکل کھڑے ہوئے، ڈیڑھ دن میں اکبر آباد پہنچے اور اطمینان سے اپنے گھر آن اُترے۔

نوجوان کی سَرگردانی

(حکایتِ شوق) جب اُس نوجوان گل رُخسار و سَرو قد کبک خرام کو معلوم ہوا کہ درویشِ دل آگاہ جا چکے تو وہ بی بی کو اپنے گھر لایا اور خود پانی تک نہیں پیا یعنی اُسی وقت گرتا پڑتا آنسو بہاتا ان کی تلاش میں جنگل کی طرف چل دیا، جو کوئی راستے میں ملتا اُس سے درویش کا اَتا پتا پوچھتا، کبھی اِدھر دوڑتا کبھی اُدھر۔ مگر کوئی راہبر اُن کا نشان بتانے والا نہ ملا۔ مایوس ہو کر اُس نے ایک آہِ جگر خراش بلند کی اور کہا: "اے خضر! چونکہ میں نادان آپ کی رہبری کے بغیر

---

[۵] اس جملے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد علی کی بیوی، یعنی میرؔ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں علائق میں پھنس کر بھی 'ترک' حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ خود بدولت دو شادیاں کرنے کے بعد مرید کو یہ تعلیم دے رہے ہیں۔ نیز یہ تعلیمات اسلامی کے سراسر خلاف بھی ہے، قرآن کا حکم تو یہ ہے: فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۝ (اور تم نکاح کرو جتنی عورتوں سے چاہو، دو دو، تین تین، چار چار) ۴: ۳۔ عملِ رسول، اُسوۂ صحابہ اور بیشتر صوفیہ کا طریق بھی اس کی تائید نہیں کرتا۔ میرؔ کے والد شاید عجمی تصوف سے متاثر تھے جس کا میلان کلبیت کی طرف ہے۔ ورنہ یہ صریح تضاد ہے۔

ہر طرف سرگرداں ہوں، کہیں سے آجایئے۔ آپ مجھے خاک سے اٹھالیں گے اگر اس مصیبت میں میری دست گیری فرمائیں۔ اگر اس ویرانے میں آپ نظر آجائیں تو گویا مجھے خزانہ مل جائے گا۔ وہ دامن جسے میں پھولوں سے بھرا کرتا تھا، چاک چاک ہے، وہ سر جو کبھی تکیۂ ناز پر رکھا رہتا تھا اب اُس پر خاک ہے، رحم کیجیے کہ پانْو چلنے سے رہ گئے ہیں، کرم کیجیے کہ سوائے آوارگی کے راستے کا کوئی ساتھی نہیں۔ یہی وقت ہے کہ آپ کا لطفِ بے پایاں مجھے پالے، آپ خورشید ہیں، اِس حقیر ذرے کو بھی روشنی سے نوازیے۔ آخر مجھے کیا ہوا کہ آسودگی نے مجھ سے مُنھ موڑ لیا اور کیا پیش آیا کہ آوارگی نے مجھے پالیا (لمصنفہ) ہ

سخت در کارِ خویش حیرانم　　　چہ بدل خوردمن نمی دانم[۱]

بگولے کی طرح وحشت آمادہ ہوں، شاید آپ نے مجھے فراموش کر دیا ہے۔ ہر چند کم پائی سے آزار اُٹھا رہا ہوں، لیکن ابھی آس نہیں ٹوٹی ہے، دشت میں ہوں تو آوارہ اور کہسار میں ہوں تو مثل مجنوں۔ میرے رُخسار جو گلِ تر کو شرماتے تھے دھوپ کی تمازت سے تونْس گئے ہیں۔ میری آنکھیں جن پر ہرن رشک کرتے تھے، سفید ہوتی جارہی ہیں۔ آپ آفتاب ہیں اور میں سایۂ اُفتادہ۔ آپ سوارِ دولت (بااختیار) ہیں، اور میں پاپیادہ؛ جو بھی غبار اُٹھتا ہے مجھے آپ کی آمد کا گمان ہوتا ہے، لیکن جب آپ نظر نہیں آتے تو ناچار رو رو کر اپنا گلا پھاڑتا ہوں، آپ تمام اجزاء ہیں یعنی کامل ہیں پھر ہم غافلوں کے حال سے کیوں غافل ہیں؟" (نوجوان اسی طرح) روتا دھوتا چلا جارہا تھا، کبھی کھڑا ہو جاتا، کبھی چلنے لگتا کہ اچانک[۲] ایک بزرگ پیٹھ پیچھے سے نمودار ہوئے اور اُنھوں نے بڑے لُطف و نرمی سے فرمایا: "اے نوجوان! کسے ڈھونڈھتا ہے اور یہ کیا کہہ رہا ہے، جا گھبرا مت، علی متقی اکبر آباد میں ملیں گے"، یہ مژدہ سُن کر اُس

---

[۱] (مطلب) میں اپنے معاملے میں سخت حیران ہوں، سمجھ میں نہیں آتا میرے دل کو کیا ہوگیا؟
[۲] نظر بہ ظاہر خضر علیہ السلام مراد ہیں۔

کے دل بے قرار کو قرار آیا۔ اب وہ دل جمعی سے چلنے لگا اور خدا کا شکر ادا کیا، آدھی رات کو شہر (اکبر آباد) میں داخل ہوا، راستہ تلاش کرتا، نام و نشان پوچھتا ہوا آیا اور سعادت قدم بوس حاصل کی۔ مارے خوشی کے اس کے مہتابی رنگ رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے۔ ناکامی کا رنج حصولِ مراد کی خوشی سے، جو اُس کے خیال میں بھی نہیں تھی دور ہوا۔ درویشِ جگر ریش نے اُس کے جمال پر ایک نظر کی اور اُسی پاک نظر نے اُسے صاحب کمال بنا دیا، اتنی محبّت سے پیش آئے کہ تحریر میں نہیں سما سکتی، ایسی دالداری کی کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اُس کا سر چھاتی سے لگایا اور بے حد محبّت سے فرمایا " اے میر امان اللہ تم نے بڑے مصائب جھیلے، زمانے کے سرد و گرم دیکھے۔ مگر اب تمہیں رشتہ داروں سے جدائی کا رنج نہیں ہوگا۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ میں اور میرے نوکر چاکر سب تمہارے ہیں خوش ہو جاؤ کہ تم نے اپنی نہر کو ایک عجیب دریا سے جوڑ لیا ہے، شکر کرو سرو کے مانند تم دامن بچا کر نکل گئے ہو۔ اب دل جمع ہو جاؤ اور دروازہ بند کر کے بیٹھو تھوڑے دنوں اپنے میں گم رہو تاکہ خدا کو اپنی طرف کھینچ سکو۔

سیدزادے کو تلقین

(فائدہ) سُن رکھو یہ مناسب وقت ہے اور یہ پتے کی باتیں ہیں۔ یہ لباسِ وجود جسے جسم کہتے ہیں مستعار ہے، مستعار لباس کو پاک و صاف رکھنا چاہیئے۔ اور روح جو تمہاری ذات پر دلالت کرتی ہے اُسے این و آں کے علائق میں نہ اُلجھانا چاہیئے۔ (لمصنّفہٖ) ؎

پاسِ جان کن تن ندارد اعتبار　　قالبِ خاکی مزارے بیش نیست [1]

خودی سے گذرو اور اپنے اندر دیکھو، خدا پر نظر رکھو اور توکّل کرو۔ نیاز پیدا کرو، کہ نماز ہی ہمیشہ کام نہیں آتی، گداز پیدا کرو، کیونکہ بے گداز دل کسی مصرف کا نہیں ہوتا۔ غُرور کرنا عیب ہے اپنے کام خدا کو سونپ دو، جو تم سے زبُوں حال ہے اُسے بھی ہلکی

[1] (مطلب) جان (روح) کی احتیاط کرو، جسم کا تو کوئی اعتبار نہیں ہے یہ مٹی کا قالب ایک مزار سے زیادہ نہیں۔

نظر سے نہ دیکھو، غرور بڑا عیب ہے۔ خبردار اِس سے مُنھ پھیر لو۔ نیاز مندی کی عادت ڈالو تاکہ دل سے ربط پیدا کر سکو۔ جہاں تک بن پڑے بکھیڑوں سے بچو، بے کار اپنے اُوپر یہ بوجھ مت رکھو۔ دل کو نقشِ غیر سے پاک کرو، جب تک گھر صاف سُتھرا نہ کرو گے مہمان کے قابل نہیں ہوگا۔ ہر موافق و ناموافق سے نبھاؤ جب تک آدمی اخلاق پیدا نہ کرے انسان نہیں بنتا۔ ہر شخص سے سلوک کرو۔ یہی فقیر کا مذہب ہے۔ پردیسی کی طرح رہو کیونکہ سفر درپیش ہے۔ یہ عالم عزا خانہ ہے۔ یہاں دیر تک ٹھہرنے کی رسم نہیں۔ دنیا والے ماتمی ہیں، اِن کی تسلّی کے لیے کوئی دم ٹھہر جاؤ۔ یہ ایک خوفناک جنگل ہے، جہاں سانپ اور چیونٹی بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ زادِ راہ کی فکر کرو کیونکہ قافلہ اچانک چل دیتا ہے، اگر چاہتے ہو کہ اس بیمار خانے سے صحیح سالم نکل جاؤ تو حکیمانہ پانی پیو، پرہیزی کھانا کھاؤ۔"

(نکتہ) فقیر وہ ہے کہ جن چیزوں کا محتاج ہو وہ بھی نہ رکھتا ہو اور غنی وہ کہ اس نے مملکتِ عدم اپنے غیر کے لیے چھوڑ دی ہو۔ ہمیں فقیری ملی ہے:
اَللّٰهُ غَنِیٌّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (اللہ غنی ہے اور تم سب فقیر ہو) جان لو اِس چمن میں ایک ہی گلِ تر ہے جو ہزار رنگ میں جلوہ گر ہے۔ یعنی معشوق ایک ہی ہے، لیکن اُس کے جلوے بے شمار ہیں ؎

معشوق در حقیقت، اگر بنگری یکے است — ہر کس بجلوۂ دلِ خود شادی کند[۱]
یکے را ببین و یکے را بدان — یکے را بجو و یکے را بخوان[۲]
دوئی کجاست، ز نیرنگِ احولی بگزر — کہ یک نگاہ، میانِ دو چشم مشترک است[۳]

[۱] اگر تو غور سے دیکھے حقیقت میں معشوق ایک ہی ہے (مگر اُس کے جلوے بے شمار ہیں) ہر شخص اپنے مذاق اور رجحان کے موافق کسی جلوے سے اپنا دل خوش کر لیتا ہے۔ [۲] اس کائنات میں ایک ہی خدا کو دیکھ اور ایک ہی کو جان، ایک ہی کی تلاش کر اور ایک ہی کو آواز دے۔ [۳] دوئی کہاں ہے؟ یہ تو ایسا ہے جیسے بھینگے آدمی کو ایک کے دو نظر آتے ہیں، حالانکہ ایک ہی نگاہ دو آنکھوں کے درمیان مشترک ہے۔

جاؤ کچھ کھاپی کر سو رہو، سفر سے تھکے ماندے آرہے ہو ذرا دیر کو پاؤں پھیلا کر لیٹ جاؤ تم نے بہت زحمت اٹھائی ہے۔" ایک نوکر کو اشارہ کیا کہ اُن کے آرام کا بہت خیال رکھے، اور کسی وقت اُن کی خدمت سے دریغ نہ کرے۔

امان اللہ کی بی بی کا انتقال

غرض کہ وہ عزیز دلجمعی سے رہتے اور میرے والد اُنھیں "برادرِ عزیز" کہتے تھے۔ صبح و شام درویش کی خدمت میں آتے اور کسبِ کمال کرتے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے اُن کی دل جوئی سے غافل نہ رہتے تھے، ہر روز مقاماتِ درویشی کا ایک نیا باب اُن پر کھول دیتے تھے۔ تھوڑی ہی مدت میں درویش کامل ہو گئے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ پلک جھپکاتے تو عجائبات دکھاتے، اور آستین جھٹکتے تو کرامات ظاہر ہوتی جب اُن کے رشتہ داروں تک یہ خبر پہنچی، وطن سے بڑے اشتیاق کے ساتھ دوڑے۔ اُن کی بی بی دق میں گرفتار ہو کر کچھ دنوں بعد اس دنیا سے گذر گئیں[1]

القصہ اُن کی درویشی کا چرچا ہوا تو عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا اُنھوں نے لوگوں سے ملاقات کرنے میں مصلحت نہ دیکھی اور گوشہ گیر ہو گئے۔ جب ایک سال بیت گیا تو میرے والد نے کہلا بھیجا کہ اب دُنیا والوں پر فیض کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔ ایک شام کو اپنے حجرے سے برآمد ہوئے ایسے کہ فرشتوں کو بھی رشک آئے۔ درویش کو سلام کر کے قدموں میں گر گئے۔ فرمایا: "اے سیّد بڑے کھرے انسان ہو تم نے اپنا سکّہ بٹھا دیا ہے، ہوس، آدمی کو پیرِ علی بلّی کی طرح مضطرب رکھتی ہے اور نفسِ فتنہ انگیز سرکش بناتا ہے تم نے قناعت کا پتھر پیٹ سے باندھ کر خواہشوں کو زیر کر لیا ہے:

این کار از تو آید و مردان چنین کنند"

---

[1] درویشی اور کرامت تو برحق، مگر یہ کس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی؟

میں اُن دنوں سات[1] سال کا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اپنے سے مانوس کر کے گود لے لیا تھا یعنی مجھے میرے ماں باپ کے ساتھ نہ چھوڑتے تھے، اپنا فرزند بنا لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے پاس سے جُدا نہ کرتے، اور بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش کرتے تھے، چنانچہ میں دن رات اُنھیں کے ساتھ رہتا تھا اور اُن کی خدمت میں قرآن شریف پڑھتا تھا۔

عشق (نقل) ایک دن وہ جمعہ بازار کی سیر کو گئے تھے، وہاں اُن کی نظر ایک تیلی کے لڑکے پر پڑی وہ ایک دولت مند جوان تھا، یہ (اُس کی محبت میں) دل کھو بیٹھے اور ساری استقامت جو رکھتے تھے بھول گئے یعنی تاب نہ لاسکے اور بے قابو ہو گئے۔ جب اُس کی جانب سے التفات نہ دیکھا تو دل پکڑے واپس آ گئے۔ ہر چند ضبط کی کوشش کرتے تھے مگر دلِ بے تاب پر بس نہ چلتا تھا۔ نوکر کا کندھا پکڑ کر زمین پر قدم رکھتے تھے تب کہیں راستہ چلتے تھے، اپنے دل سے کہتے: "اے عزیز! ایسا واہیات کھیل کوئی بھی کھیلتا ہے جو تو نے کھیل کر اپنے تئیں کوچہ و بازار میں رُسوا کرایا۔ یا تو ضبط و استقامت کا وہ عالم تھا، یا یہ بے اختیاری ہے جو حرکت تو نے کی ہے، ایک بچّہ بھی نہیں کرے گا، جس راستے پر تو چلا ہے اُس پر اندھا بھی قدم نہیں دھرے گا۔ دل ایسی چیز تو نہ تھی کہ ایک بازاری لونڈے پر نچھاور کر دی جائے۔ تیرا دل ایسے کی محبّت میں جلا ہے جو کبھی دھوپ چڑھے گھر سے باہر بھی نہیں نکلا اور تو ایسے کا دیوانہ ہوا ہے جو کبھی دل کی راہ میں قدم بھر بھی نہیں چلا۔ یہ آنکھیں اور بھی رونے لگی ہیں گویا منتظر تھیں، جیسے ہی دیکھا ٹوٹ پڑیں، دل اور بھی زیادہ تڑپ رہا ہے جیسے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ آنکھ لڑی اور تڑپنے لگا۔ آنکھوں پر کہاں تک نظر رکھوں، دل کی کب تک خبر رکھوں، کبھی جوانی میں آنکھ نہ لگائی تھی۔ اب بوڑھے

[1] زمانہ ۱۱۴۲ھ/ ۳۰-۱۷۲۹ء

منھ مُہلے سے نکل رہے ہیں۔ اگر خود کو سنبھالتا ہوں تو دل تڑپ تڑپ کر قیامت ڈھاتا ہے، اور ضبط کی کوشش کرتا ہوں تو آنسوؤں کا سیلاب اُمڈا آتا ہے، حیران ہوں کہ کیا کروں، کون سی تدبیر سے یہ گتھی سُلجھے۔ اب پیر و مرشد کی توجّہ کے سوا چارہ نہیں پاتا ہوں جو کچھ بھی ہو، اُن کی خدمت میں جاتا ہوں۔

اُسی حالِ تباہ سے آنکھوں میں اشک اور لبوں پر آہیں لیے ہوئے، مغرب کی نماز کے قریب نوکر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر درویش کی خدمت میں آئے۔ حاضرین نے تعظیم کی، (درویش نے) اشارہ کیا، اُنھیں صدر میں جگہ دی گئی۔ (والد نے) کہا: "ارے بھائی کہاں تھے؟ آج بڑی دیر میں صورت دکھائی"۔ اِنھوں نے عرض کیا: "جمعہ بازار کی سیر کرنے گیا تھا"! فرمایا: "تم نے شاید یہ نہیں سُنا؟ (لمصنّفہٖ) ؎

مستمندِ عشق می داند کہ سودا می کند ❊ دیدنِ طفلانِ تہ بازار رُسوامی کند[۱]

جاؤ، اپنی کوٹھری سے آٹھ دن رات تک باہر نہ نکلنا، اور اس واقعے کو ہرگز یاد نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کریم ہے شاید اُسے پہنچادے اور تمھاری لاج رکھ لے"!

اتفاق دیکھیے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ شام کے وقت وہ چودھویں کا چاند اپنے گھر سے نکلا اور بیتاب سا (اپنی) دکان پر بیٹھ گیا۔ ایک دلّال وہاں کھڑا تھا اُس نے پوچھا "کیا بات ہے؟ آج رات تمھارا رنگ ہی بدلا ہوا ہے، بہت بے چین نظر آتے ہو"۔ لڑکے نے کہا: "کیا بتاؤں جو مجھ پر گذر رہی ہے، زباں تک نہیں لاسکتا۔ مگر تجھے دوست جانتا ہوں تجھے بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں؛ آج چھٹا دن ہے ایک درویش اِس راستے سے گذر رہے تھے اُن کی نگاہ میری رعنائی پر پڑی، کچھ دیر کھوئے ہوئے سے کھڑے رہے، میں نے اپنی اکڑفوں میں اُن کی جانب التفات نہ کیا ناچار اُنھوں نے جلے ہوئے دل سے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور چلے گئے۔ اب نہ اُن کی صورت

---

[۱] (ترجمہ) عشق کا گرفتار ہی جانتا ہے کہ بازاری لڑکوں کا دیکھنا رسوائی کا سبب ہوتا ہے، اور جنون پیدا کرتا ہے۔

میری نظروں سے جدا ہوتی ہے نہ دل سے اُن کا خیال جاتا ہے' سوتے جاگتے اُنھیں کا تصوّر اور اُنھیں کی یاد ہے۔ کیا کروں؟ دل کو کیسے بہلاؤں؟ اُن کا نام کس سے پوچھوں؟ اتا پتا کہاں دریافت کروں، کدھر جاؤں، اپنا غم کسے سناؤں؟" (دلّال نے) کہا: "ارے وہ تو مشہور درویش ہیں، بڑے بے خویش ہیں، خلق اُن کے آستانے پر جھکتی ہے' عالم اُن کا مرید ہے۔ وہ علی متّقی کے چھوٹے بھائی ہیں جو مشہورِ آفاق ہیں اور اِس نیلی چھتری کے نیچے طاق ہیں۔ اُن کا آستانہ جس کی خاک بطورِ تبرّک لے جاتے ہیں، شہر پناہ سے باہر عیدگاہ کے قریب ہے' میرے ساتھ آؤ اور بندِ غم سے چھٹکارا پاؤ۔" غرض وہ مردِ فرومایہ جوان کو میرے والد کی خدمت میں لایا۔ انھوں نے حقیقت حال سُن کر فرمایا: "آخر عشقِ بے پروا نے تغافل کا انتقام لے ہی لیا۔" ایک نوکر کو اشارہ کیا کہ جاکر برادرِ عزیز سے کہہ دے کہ آؤ تمھارا مطلوب تمھیں ڈھونڈتا ہے۔" جب یہ حکم' اِس خوش خبری کے ساتھ اُس جگر خستہ گوشہ نشین نے پایا تو کلبۂ احزان سے دست افشاں و پاکوباں باہر آیا۔ پہلے پابوسی کے لیے پیر و مرشد کے قدموں میں سرِ نیاز جُھکایا پھر دستِ شوق لڑکے کی طرف بغل گیر ہونے کے لیے بڑھایا، یعنی دل کی خواہش کے مطابق اُسے سینے سے لگایا اور اپنی تمنّا کے موافق اُس نخلِ مراد کو پایا۔ پیر نے دونوں کو اجازت دی کہ علیحدہ بیٹھ کر بات چیت کرلیں۔ جب باتیں چھڑیں اور قصّہ نِکلا تو درویش (میر امان اللہ) نے کہا: "اے جوانِ رعنا۔ میں فقیر ہوں اور دلِ بے مدّعا رکھتا ہوں۔ مجھے اپنی زلف کا اسیر نہ جانیو۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ دل کہاں اٹکا ہوا ہے اور یہ سراپا خواہش جان کا ہے کی آرزومند ہے، خبردار اِس گھمنڈ میں نہ رہنا اور ناز نخرے نہ دکھانا ایسا نہ ہو کہ افسوس کرنا پڑے' درویش لوگ اگرچہ اس اَوندھے آسمان کے دائرے سے باہر ہیں (یعنی عام لوگوں سے مختلف ہیں) لیکن انھیں بھی ایک حال میں نہیں چھوڑا جاتا یعنی ہم لوگوں کا حال مختلف ہے۔ اچھا جاؤ' تم نے بہت رنج اُٹھایا ہوگا۔"

(لڑکے نے) کہا: "میں نے رنج تو اُٹھایا، مگر گنج بھی پایا۔ میں اس آستانے کی جاروب کشی کو سعادت جانتا ہوں، اُمید ہے کہ آپ مجھے محروم نہ فرمائیں گے اور میرے حال سے عنایت کی نظر نہ اُٹھائیں گے" وہ ہر روز صبح آکر بیٹھتا تھا اور دل و جان سے خدمت کرتا تھا۔

ایک دن درویش (میر امان اللہ) کسی خاص کیفیت میں بیٹھے تھے، ایسے میں وہ جوان آگیا۔ "جوانِ عزیز" کہہ کر بلایا اور اپنے پاس بٹھایا۔ اُس کے حال پر ایسی نظر فرمائی کہ اُس نے اپنا مقصودِ دلی پایا اور اِسی لقب سے عالم میں مشہور ہوا۔ شہر کے بڑے لوگ اُس کی عزّت کرتے تھے۔ دوسرے خاص مرید اُسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آخر اُس کا یہ حال ہوا کہ میدانِ طریقت میں بے مثال ہوا۔[۱] سچ ہے جب درویشوں کی نگاہ اثر کرتی ہے تو خاکِ ناچیز کو زر کرتی ہے۔

احسان اللہ

(حکایت) درویشِ جگر ریش، یعنی عمِّ بزرگوار (میر امان اللہ) ہفتے میں ایک بار، احسان اللہ نامی ایک فقیر سے، جو ایک مردِ آزاد تھے، ملاقات کرنے جایا کرتے تھے، اُن کا بڑی سُتھری لپی پُتی چار دیواری کا مکان جس کا دروازہ بند، دیواریں بلند، 'فقیر کا تکیہ' کر کے مشہور تھا، اُس دل جلے کے دروازے پر یہ شعر سُنہرے حرفوں میں لکھا ہوا تھا ؎

خاطرِ آسودہ خواہی، راہِ آمد شُد بہ بند چاک در پیراہنِ دیوار از دستِ در است[۲]

اگر کوئی اُن کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور آواز دیتا، تو وہ خود آتے اور جواب دیتے کہ "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے، بھاگ جاؤ، یہ گھر خالی ہے"۔ ایک بار میرے چچا نے اُن سے ملاقات

---

[۱] سب فقیروں سے بازی لے گیا اور عالم میں مشہور ہوا، مگر افسوس کہ میرؔ نے اُس کا اصلی نام تک ظاہر نہیں کیا، اور تو کسی کتاب میں خیر اُس کے پیر و مرشد بلکہ مرشد کے مرشد کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ [۲] (ترجمہ) اگر تجھے اطمینانِ قلب درکار ہے تو آمد و رفت کے راستے بند کر دے۔ (یعنی لوگوں سے ملنا جُلنا ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لے) دیوار کے پیراہن میں چاک دروازے ہی کی وجہ سے ہے (یعنی زیادہ میل جول یادِ الٰہی میں قلب کو یکسو نہیں ہونے دیتا)۔

کا ارادہ کیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔[1] جب دروازے پر پہنچے تو وہی جواب ملا کہ " احسان اللہ گھر میں نہیں ہے "۔ چچا نے کہا : " اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے "۔ ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ کیا دیکھتا ہوں، گٹھے ہوئے ہاڑ کا جوان ہے خورشید سوار! جس کی پیشانی سے ہیبتِ حق نمودار۔ اکہری یزدی چادر سر پر، ایک لنگی کمر پر، رعب دار سرخ آنکھیں! جیسے شیر عشقِ الٰہی سے سوگیا ہے اِس در پر۔ مصافحہ ہوا، پیلو کے سائے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کی مزاج پُرسی کی۔ فرمانے لگے : " میاں میر امان اللہ میں نے گوشہ نشینی اِس لیے اختیار کی ہے کہ ملنے کی گوں کا آدمی نہیں ملتا۔ تمھیں دل بہت چاہتا ہے جب تک نہیں آتے کُھلتا رہتا ہے۔ اور ہاں، یہ بچہ کس کا ہے ؟ " چچا نے کہا : " علی متقی کا بالا اور میرا گود پالا ہے "۔ فرمایا، اِس بچہ کے ابھی کلیاں نکل رہی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اچھی طرح پر نکل آئے (تربیت ڈھنگ سے ہو گئی) تو ایک ہی ٹری میں آسمان کے پار پہنچے گا۔ اِس بابا سے کہو درویشوں کی ملاقات کو معمول بنائے کہ فقیروں کی صحبت میں بڑی برکت ہوتی ہے "۔ پھر سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا پانی میں بھگو کر کھانے کے لیے مجھے دیا۔ میں نے ایسی لذّت کا کھانا کبھی نہیں کھایا تھا، ابھی تک میرا ذائقہ اُس کی یاد میں چٹخارے لے رہا ہے، وہ مزہ آج تک لطف دے رہا ہے۔

درویش کے ارشادات

(نکتہ) فرمانے لگے کہ " اے یارِ عزیز اللہ کی معرفت اس صحرائے پُرغبار (دنیا) میں ایک وحشی ہرن ہے، رُوح شہ سوار اور گھوڑا انسان کا بدن ہے۔ اگر یہ شکار مل جائے تو بلا سے گھوڑا (مٹی میں) رِل جائے، لیکن اگر گھوڑا مر گیا اور شکار بھی چھِن گیا تو انجام وہ حسرت ہے جس میں ہر عذاب سے زیادہ شدت ہے، عذابِ قبر بھی اِسی حال سے عبارت ہے۔

[1] زمانہ تقریباً ۱۱۲۲ھ / ۳۱-۱۷۳۰ء

(موعظت) آؤ، غرور و ہوس سے نکل جاؤ۔ نفسِ امارہ تو حریص کتا ہے، اگر اس کے کہے پر قطعِ راہ کروگے تو اپنے تئیں تباہ کروگے، ہاں اگر مجاہدہ کرکے خودی سے گذر گئے تو سمجھو انسانیت کی منزل سر کر گئے! بے سمجھ طولِ اَمل کی برائیوں کو نہیں سمجھ پاتا مگر عقلمند اپنے لیے پھانسی کا پھندا خود نہیں بناتا۔

(نکتہ) یہ آسمان ایک طلسماتی پردہ ہے جس پر عجیب و غریب شکلیں اور صورتیں نمودار ہوتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ یہ آنا اور جانا شکل و صورت کے اختیار میں نہیں اِس کی ڈور کسی اَور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھو دنیا کو دل نہ دیجیو کہ یہ بے شرم قحبہ ہے جب باپ اُٹھ جاتا ہے تو بیٹے سے ہم بستر ہو جاتی ہے۔ جو اہلِ سیرت اور صاحبِ غیرت ہیں اِس کی طرف مطلق توجّہ نہیں کرتے۔

(فقیرانہ باتیں) ریاکار لوگ از راہِ خود پسندی اِس بے حقیقت زندگی پر جو پلک جھپکاتے تمام ہوتی ہے، کیسے پھُولے ہوئے ہیں اور عناصر کی اِس چار دیواری میں جسے دنیا کہتے ہیں اور جس سے جلد ہی گذر جانا چاہیئے، اقامت کو جاودانی سمجھ کر کیسی فراغت سے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ وہ ظاہر میں (کتنے ہی) ہشیار (نظر آئیں) لیکن واقع میں بے خبر ہیں یعنی حقیقت کو بھُولے ہوئے ہیں، اُن کی خلوتِ باصفا سراسر کدورت ہے، ایسوں کی صحبت میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بابِ صحبت تو وہ بے نوا درویش ہیں جو درخت کے سائے کا بوجھ بھی اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہیں یا وہ برہنہ تن فقیر جو ہمہ اُوست کا دم بھرتے ہیں۔ یا وہ گدڑی پوش پہلوان جو نفسِ امّارہ سے جہاد کرتے ہیں یا وہ درویشانِ جگر ریش ہیں جو بے گانۂ یار و خویش ہیں، جن کی پیشانیاں آلودۂ خاک ہیں اور دل بہتے ہوئے پانی کی طرح پاک ہیں۔ یہ بیشۂ فقیری کے شیر خونِ دل پینے والے۔ بحرِ بے جوش اور طوفانِ بے خروش ہیں۔ کوچۂ محبت کی خاک اُڑانے والے، بیابانِ وحشت میں دھُونی رمانے والے، وہ بندے جو خدا سے

واصل ہیں۔ سب سے دور رہتے ہیں مگر نزدیکِ دل ہیں، جلوۂ یار کے دلدادہ، معشوق کے سایۂ دیوار کے خاک اُفتادہ، بحرِ حقیقت کے شناور اور بیشۂ طریقت کے رہبر ہیں۔ وہ آوارگانِ منزل رسیدہ جن کے سائے سے آفتاب ابھرتا ہے۔ وہ خاک نشین جو آسمان پر کمند ڈالے ہوئے ہیں، وہ گوشہ نشین جو نام نکالے ہوئے ہیں، وہ دشتِ مہر و وفا کے دیوانے اور گلشنِ حیا کی خوابیدہ کلی سخت پتّھر جن کی بالش ہے۔ اور علامتِ دیوانگی اُن کی پوشش۔ پیٹ سے پتّھر باندھتے ہیں، مگر شکایت نہیں کرتے حریص نہیں، لذیذ کھانا اگر مل بھی جائے تو اُس کی طرف رغبت نہیں کرتے، روکھی سوکھی کھالیتے ہیں۔

وہ عجب زرد رُخسار ہیں (عشق کے) پُرانے بیمار ہیں، مزاج کے ایسے غیور کہ جسے دیکھنے کے لیے مرتے ہیں اُسی سے صَرفِ نظر کرتے ہیں۔ سر میں وہ پندار رکھتے ہیں کہ جب تک معشوق کی تیغِ ناز ہی نہ بٹھادے خود نہیں بیٹھتے۔ محبوبِ حقیقی کو جس سے وہ اتحّاد رکھتے ہیں، کمالِ ذوق و شوق سے دن رات تلاش کرتے ہیں! وہ ایسے جنگ آور ہیں کہ اُنھوں نے بہتر فرقوں کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا دیا ہے اور ایسے کیمیاگر، کہ ناچیز خاک کو ہزار بار سونا بنا دیا ہے۔ درویش اِس کارخانۂ ہستی میں متصرّف ہیں، یعنی جو کچھ ہیں وہی وہ ہیں، جو چاہو دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر دے سکتے ہیں، یعنی حاصلِ ہر دو جہاں ہاتھ بڑھا کر دے سکتے ہیں! ایسے درویشوں کا ذکر کرو، اُن سے طلبِ ہمّت کی فکر کرو، بن سکو تو اُن جیسے بن جاؤ، یعنی درویش کہلاؤ۔ حقیقت کا دریاے عظیم جس کا راستہ بند ہے، اُس کی کنجی درویشوں کی زبان ہے۔ پانی پر جا نماز پھینکنا اور بے تکلف چلنا درویشوں کی شان ہے۔"

جب جھٹپٹا ہوا، تو فرمایا: "اے یارِ عزیز، مغرب کی نماز کا وقت آیا، اگرچہ تمھیں رخصت کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن طلوع و غروبِ آفتاب سے قبل خشوع وخضوع

کا وقت ہوتا ہے۔ اُس وقت بیٹھنا نہیں چاہیئے۔ جاؤ علی متقی سے میرا سلام کہہ دینا۔"
ہمیں رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا۔ چچا نے وہاں سے آکر فقیر کا سلام میرے والد کو پہنچایا۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر سلام لیا اور فرمایا کہ "احسان اللہ کی ملاقات کو اللہ کا احسان سمجھنا چاہیئے۔ جاتے رہو اور میرا بھی سلام پہنچاتے رہو۔" چوتھے دن چچا پھر اُن کے گھر گئے، مجھے بھی ساتھ لے کر گئے۔ دستک دی، وہی جواب ملا "گھر میں نہیں ہوں" چچا نے فرمایا: اگر تم نہیں ہو تو کون ہے جس نے میرے دوست کے گھر میں دھرنا دیا ہے۔" (احسان اللہ) ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ ہم عجب سعادت سے مالا مال ہوئے یعنی اُن کی پُر مغز باتیں سنیں اور عنایاتِ بے حد سے نہال ہوئے۔
فرمایا: "اے عزیز عشق نے جب سے مجھے ٹھکانے لگایا ہے اور محبت کا نقش اچھی طرح میرے دل پر بٹھایا ہے یہاں کی کوئی چیز میری نظروں میں نہیں سماتی اور یہ دنیا دل کو قطعاً نہیں بھاتی۔ تجرّد پیشہ ہوں، بے اندیشہ ہوں، اگر سارا عالم درہم برہم ہوجائے تو بھی میری جمعیتِ خاطر میں فرق نہ آئے، اگر آسمان زمین پر آپڑے تو بھی ممکن نہیں میرا دل کہیں جا پڑے۔ جب آنکھ بند کرتا ہوں تو اُس کے مکھڑے پر کھولتا ہوں جو سورج مکھی سے زیادہ نازک ہے۔ یعنی نگاہِ گرم کی تاب نہیں لاتا۔ جب سر بگریباں ہوتا ہوں تو اُس دلبر کا تماشائی بن جاتا ہوں جس کا جلوہ برق سے ہزار درجہ شوخ تر ہے۔ یعنی پل بھر کو میرے دل سے نہیں نبھاتا۔ میرا یارِ محشر خرام اگر رفتار میں آوے، عالم تہ و بالا ہوجاوے، میرا بلند بالا اُٹھ کھڑا ہو، تو فتنۂ قیامت اُٹھاوے، اُس کے کوچے کی خاک ہوجاؤ تاکہ تم سروں کے تاج ہو جاؤ۔ اُس کے پایمال بنو تاکہ اہلِ نظر کی آنکھوں کا سُرمہ کہلاؤ۔ ایسا دل لاؤ جسے وہ پسند کرے ایسی جان پیدا کرو جو اُس سے پیوند کرے۔ کسی اپنے سے بہتر کے ہاتھوں میں ہاتھ دو، کہ اسی سے یہ منزلِ دشوار ہاتھ آتی ہے، خبردار ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھیو کہ ہاتھ پانو توڑ کر بیٹھ

رہنے سے راہ پست ہوجاتی ہے۔

(نکتہ) اے یارِ عزیز، موت ایک عجیب تبدیلی ہے جو پیش آتی ہے، اپنے احتساب سے غافل نہ رہو، یعنی اپنے تئیں دشمن کی نگاہ سے دیکھو کہ یہی دوستی جانی ہے، حالِ جانِ ہوشیار بدن سے مفارقت کے بعد ایسا ہے جیسے کوئی مست ہو معشوق در کنار۔ چونکہ اُس عالم میں تجدّدِ امثال نہیں ہے، ایک طویل مدت کے بعد جب وہ مستی جیسے دنیا کی لگاوٹ کہیئے زائل ہوجاتی ہے تو دفعتہً لذّتِ وصل حاصل ہوجاتی ہے۔ افسوس ہے اُس ناآگاہ کی جان پر جو اِس دنیا سے دُور ہوجائے اور اُس عالم سے کوئی نسبت قائم نہ کر پائے۔ پھر وہ متأسّف رہتا ہے اور (ملال و مسرّت کی) انہیں دو کیفیّتوں کو عارف بہشت دوزخ کہتا ہے۔"

(موعظۃ) "اے یارِ عزیز! دل اگر درد آشنا ہے تو بہتر ہے، غم اگر دل گداز ہے تو شایستہ تر ہے۔ (درویش) دلِ محزوں تلاش کرتے ہیں شایستۂ طرب نہیں! جانِ دردمند چاہتے ہیں درمان طلب نہیں۔ رُوے نیاز اُس کی طرف لاؤ جو بے نیاز ہے، سب کام اُسے سونپ دو جو کارساز ہے، گوشہ نشین ہوجاؤ اور توکّل کرو، اپنے اندر کھوجاؤ اور غور و تامّل کرو، اگر جان میں نیازمندی پیدا ہوجائے تو عنقا ہے۔ دل اگر گداز ہوجائے تو کیمیا ہے۔ (لمصنّفہٖ) ؎

مدّعا نایاب، وراہِ جستجو دُور و دراز　　پا بدامن ہم نشین، ناچاری باید کشید[1]

(نکتہ) اے یارِ عزیز، وہ یکتا پیرہن معشوق، جس رنگ میں چاہتا ہے نمودار ہوجاتا ہے، کبھی پھول ہے، کبھی رنگ، کہیں لعل ہے، کہیں سنگ۔ کچھ لوگ پھول سے جی خوش کرتے ہیں، بعض رنگ پر مرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے، دوسری پتھّر کو خدا مانتی ہے۔ خبردار! یہاں لغزش کا اندیشہ ہے، ایسی آنکھ چاہیئے جو

---

[1] (ترجمہ) ہمارا مدّعا نایاب اور راہِ جستجو بہت دراز ہے اس لیے اے ہم نشیں گوشہ گیر ہوجانا ناگزیر ہے۔

اُس کے غیر پر نہ کھلے، وہ دل ہو کہ کسی اور پر نہ ڈھلے۔ دشمن اور دوست سب اُسی سے ہیں، کیونکہ دل تصرّف میں اُسی کے ہیں۔ ہدایت اور گمراہی دونوں اُسی کے مظہر ہیں، مست اور ہوشیار سب اُسی کے رہ سپر ہیں، محراب اُس کی ابرو سے پیدا ہوئی ہے اور مے خانہ اُس کی آنکھ سے ہویدا۔ زاہدانِ مناجاتی عبادت و طاعت کا ثواب کماتے ہیں۔ زاہدانِ خراباتی جام لنڈھاتے ہیں۔ محراب میں سر نیہوڑا کر جاؤ، خرابات میں رندانہ وضع سے آؤ یعنی ہر موقع کی رعایت لازم رکھو اور ہر مرتبے کا پاس دکھاؤ۔

(نکتہ) اے یارِ عزیز، ہستیِ واجب (خدا) دلیل و بُرہان کی محتاج نہیں ؎

ہر کہ بر حق دلیل می گوید ۔۔۔ بچراغ آفتاب می جوید[1]

بس سورج نکلا اور دن پھیل گیا۔ اگر کوئی مالک نہ ہو تو آسمان گر پڑے اور پہاڑ کھڑا نہ رہ سکے، نہ سورج تابش کرے، نہ چاند گردش، نہ آگ جلائے، نہ ہوا بجھائے، نہ بادل برسے، نہ بجلی تڑپے، نہ پانی بہے، نہ گھاس اُگے، نہ پھول کھلے، نہ چمن ہنسے، نہ پھل پھلے، نہ پیڑ جمے۔

حق سبحانہ تعالیٰ جسے کریم کہتے ہیں، اِس صفت کے غلبے پر نظر کر کے سر رشتۂ بندگی ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے کہ وہاں تو صاحبی ہے، جب وہ نوازتا ہے تو خاک کو آدمی بنا دیتا ہے اور جب بے نیازی پر آتا ہے تو آدمی کو خاک میں ملا دیتا ہے! ہمارے پیغمبر (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جن کی شان میں ہے[2] "لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ" (اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا) تمام تمام رات نماز پڑھتے اور اتنا قیام فرماتے تھے کہ پائے مبارک سُوج جاتے تھے۔ دیکھنے والے کہتے تھے "یا رسول اللہ آپ اتنی ریاضت کیوں فرماتے ہیں، آپ نے تو سارے عالم کو بندِ غم سے نجات دلا دی ہے"

---

[1] (ترجمہ) جو خدا کے وجود پر دلیلیں بیان کرتا ہے وہ گویا سورج کو چراغ لے کر تلاش کرتا ہے۔ [2] میر نے "در شانِ اوست" لکھا ہے جس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ آیتِ قرآنی ہے، اِسے حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے لیکن اکثر علمائے حدیث نے اِسے موضوع بتایا ہے (الشوکانی : اللآلی المصنوعۃ)

(حضور اکرمؐ) تبسم فرماتے اور ارشاد ہوتا: "کیا کریں ہم تو بندے ہیں!" —— تو میرے عزیز! بندگی اور صاحبی کا رشتہ بڑا نازک ہے۔ بندگی لاؤ تاکہ اپنے آقا کے سامنے شرمندگی نہ اُٹھاؤ۔"

یہاں تک بات پہنچی تھی کہ شہر کے صوبہ دار کا چوبدار آیا اور اُس کا سلام پیش کر کے کہا کہ نصرت[1] یار خاں قدم بوس کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ درویش نے فرمایا: "خیر اچھا! ہر چند وہ فقیروں سے ملاقات کا منھ نہیں رکھتا لیکن مجھے اُس سے شرم آتی ہے کئی بار لَوٹ کر جا چکا ہے۔ اگر اِس بار بھی واپس جائے تو خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو پائے۔" جب (صوبہ دار) دروازے پر آیا تو ہاتھی سے اُتر کر دوڑا، شرفِ پا بوسی سے سرفراز ہو کر پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ (احسان اللہ نے) فرمایا: "خوب آئے، خوش رہو۔" (صوبہ دار نے) عرض کیا: "زہے قسمت کہ میں نے آپ کی خدمت میں بار پایا اور خواہشِ دل کے مطابق دیدار پایا۔" درویش کا التفات دیکھا تو التجا کی کہ "کبھی کبھی اِس روسیاہ کو نوازتے رہا کیجیے۔" فرمایا: "دل قوی رکھو، تمھیں اعتبار ملا ہے، یعنی خدائے عزوجل کی طرف سے اِقتدار ملا ہے۔ اغلب کہ وہاں سُرخرو پہنچو۔ اِس نعمت کے شکر میں بےکسوں کو نوازیو، یعنی بے مروت نہ بنیو، اور اُنھیں ذلیل نہ کریو، خدا سے شَرم کرتے رہیو، اینڈیو مت، غریبوں کے کام میں کسی کا منھ مت دیکھیو، خبردار بےکسوں سے منھ نہ موڑیو، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن منھ نہ دکھا سکو۔ اچھا اب

---

[1] سیّد نصرت یار خاں ساداتِ بارہہ میں سے تھا۔ عہدِ محمد شاہی کا ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ ہدایت اللہ نام اور رکن الدولہ خطاب تھا۔ یہ سیّد قاسم بارہہ (شہامت خاں) کا برادر زادہ تھا (مآثر الامرا)۔ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۲۲؍رمضان ١١٤٤ھ کی شب کو دہلی میں انتقال کیا (تاریخ محمّدی قلمی نسخہ رام پور)۔ کامور خاں کی تاریخ (نسخہ پٹنہ) میں بھی یہی تاریخ ہے اور یہ لکھا ہے کہ اُس کی نعش پٹنہ بھیجی گئی تھی۔ اِس میں عظیم آباد کی صوبہ داری کا بھی ذکر ہے۔ (بحوالہ معاصر ۸/۲۰۹)

نصرت یار خاں میرؔ کی ولادت سے ایک سال پہلے مر چکا تھا، اور اُس کے صوبہ دارِ آگرہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ میر یہ واقعہ تقریباً ١١٤٢ھ کا لکھ رہے ہیں۔ یا تو اُنھیں صوبے دار کا نام یاد رکھنے میں تسامح ہوا، ورنہ "حافظہ نباشد" والا معاملہ ہے۔

جاؤ کیوں کہ یہ یارِ عزیز (میر امان اللہ کی طرف اشارہ) شیشہ جان اور نازک مزاج ہیں اور میں اِن کی پاس داری کرنے میں لاعلاج۔" صوبہ دار نے غریبانِ خاکسار کی طرح اپنا چہرہ زمین پر مَلا اور فقیر کی چوکھٹ کو بڑے اعتقاد سے چوم کر چلا۔

احسانُ اللہ کی وَفات

اتنے میں ایک گویّے کا لڑکا، گھونگھریالے بال، کتابی چہرہ، عُودی رنگ، خوش گلو، کندھے پر طنبورہ، کانوں میں سونے کے بالے، اُس راہ سے گذرا، فقیر کی نظر اُس پر پڑی، بے اختیار دل دے بیٹھے۔ میرے چچا سے فرمایا: "اِسے بلاؤ اور بٹھاؤ۔" جب وہ لڑکا آکر بیٹھا تو خود بخود آمدی قبلان کا یہ شعر بھیرویں میں، جو ایک راگنی ہے، اور بے وقت اَلاپی جاتی ہے، گانے لگا:

بیا کہ عمرِ عزیزم بہ جستجوے تو رفت زدل نہ رفتی و جانم در آرزوے تو رفت[1]

درویش کو وجد آگیا اور بہت محظوظ ہوئے۔ اُس سے کہا: "اے عزیز آج رات فقیر کے ہاں رہ جاؤ اور جو چیزیں تمھیں آتی ہوں بطورِ خود سناؤ۔" لڑکے نے عرض کیا: "یہ تو میرے لیے سعادت اور مجھ پر منّت ہے۔"

چونکہ شام ہو چلی تھی، ہمیں رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا اور یادِ الٰہی میں بیٹھ گئے۔

پھر سُنا گیا، کہ جب فقیر نے عشار کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو اشرفیوں کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اُس سیاہ دل گویّے نے تاڑ لیا، تھوڑی دیر کے بعد بازار گیا، وہاں سے ایک پیالہ دودھ میں زہر ملا کر لایا اور سر ہو کر درویش کو پینے کے لیے دیا، دودھ کا پینا تھا کہ درویش کی حالت دگرگوں ہو گئی، اُنھوں نے ہاتھ پانْو پھینکنے شروع کیے، یعنی زہر اپنا کام کر گیا! وہ سنگ دل ناہنجار اشرفیاں اُٹھا کر چلتا بنا۔ آدھی رات کو درویش کی دل خراش آہ آہ نے ہمسایوں کی نیندیں اُڑا دیں۔ گھبرا کر دوڑے تو (درویش کو) جاں بلب پایا۔ کچھ لوگوں نے اُس عیّار کو بہت ڈھونڈھا مگر وہ رات کی تاریکی میں ایسا چھپ

---

[1] (ترجمہ) اے محبوب آجا، کہ میری عمرِ عزیز تیری جستجو میں گذر گئی، میری جان بھی تیری تمنا میں نکل گئی مگر تیری یاد دل سے نہ نکلی!

گیا کہ کسی کو نظر نہ آیا۔ جب رات آخر ہونے آئی تو درویش نے دنیا سے آنکھ چرائی اور جانِ شیریں بڑی تلخی سے سپرد کی۔ شہر کے سرکردہ لوگ انتہائی رنج و ملال کے ساتھ اُن کے جنازے میں شریک ہوئے اور اُن کی وصیت کے مطابق فقیر کے تکیے میں دفن کر دیا۔ اب تک وہ جگہ زیارت گاہ عزیزاں ہے[۱]۔ (لمصنّفہٖ) ؎

فلک زین گونہ خون بسیار کردست عزیزان را بسے آزار کردست[۲]

اِس اوچھے آسمان کے غمزے نئے نئے ہیں اور نخرے نرالے! آئے دن خاک نشینوں کو ستاتا ہے، ہر شب نیا فتنہ اُٹھاتا ہے، کسی کی زہر ہلاہل سے جان گنواتا ہے، تو کسی کو تیغِ ستم سے گھایل کر کے خاک میں لٹاتا ہے۔ محبّت کے متوالوں کو چاہیے کہ اُس کی گردش سے نچنت نہ رہیں تاکہ سختی نہ اُٹھائیں اور اپنی راہ سے بھٹک نہ جائیں۔

بایزیدؒ

(حکایت) میرے چچا کو درویشوں کی صحبت میں جانے کا ذوق اور ان جگر ریشوں سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ ایک دن کسی سے سُنا کہ بایزید نامی ایک فقیر سرائے گیلانی کے قریب، جس کی عمارت سیلاب نے بہادی تھی، ایک حجرے میں جو عاشقوں کے دل کی طرح ہزار رخنے رکھتا تھا، پڑے رہتے ہیں اور وہ قابلِ زیارت ہیں۔ جب اُس فقیر کا پتا مل گیا تو دل کا اشتیاق بڑھا اور ہر چیز سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ مجھے چھوڑ کر، بھاگم بھاگ گئے۔ دیکھا ایک جوان ہے، بلند بالا، نہایت بے پروا، گویا فرشتہ اس دنیا میں اُترا ہے، نہیں نہیں بلکہ جانِ آدم اُس کے آگے کیا ہے، پتھر کا تکیہ، خاک کا بچھونا، ہر وقت ہلاک ہونا، شکستہ دل، کشادہ رُو، سوختہ جاں، فتیلہ مُو، دلدادہ، خاک اُفتادہ، توکّل پسند، اور مقصودِ دلی سے بہرہ مند۔ اگر کوئی خوش چشم اُن کے سامنے سے نکلتا تو آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے، کسی سے نہ ملتے، بے کسانہ جیتے تھے۔ اکثر اوقات آنکھیں مُوندے رکھتے، دل کو خدا کے دھیان بِن نہ چھوڑتے، روٹی سے مُنھ موڑتے اور حلق پر پانی کی بندش

---

[۱] لیکن اب اس جگہ کا کچھ نشان نہیں ملتا نہ کسی اور کتاب میں حوالہ دیکھا گیا۔ [۲] (ترجمہ) آسمان نے ایسے کتنے ہی خون کیے ہیں اور (خدا کے) پیاروں کو تکلیفیں پہنچائی ہیں۔

رکھتے تھے، سخت کوش اور باریک بین تھے۔ قلندرانہ پوشش رکھتے تھے۔ (چچا سے) پوچھا "کیا نام ہے؟ اور کہاں کے ہو؟ دردمند اور عاشق پیشہ دکھائی دیتے ہو۔" (چچا نے) کہا: "اسی شہر میں رہتا ہوں، مجھے میر امان اللہ کہتے ہیں۔" فرمایا: "بیٹھ جاؤ، کچھ دیر خوش وقتی کرلیں۔" چچا کہتے تھے جب بات چلی تو (بایزید) بولے کہ "اے عزیز، میں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں، بہت رنج جھیلے ہیں، اپنے تئیں رمایا ہے، بہت کوچوں میں گھمایا ہے، ابر کی طرح گھرا ہوں، برق کے مانند گرا ہوں، ایک عمر سرگرداں رہا، ایک مدت دل پریشاں رہا، کچھ دن باچشمِ تر پھرا، آوارۂ دشت و در پھرا، کتنی راتوں کو نہ سویا، کتنے دنوں کسی سے بات نہ کی، کبھی ہاتھ امیروں کے دامن پر مارا کبھی سر فقیروں کے مسکن پر، تب کہیں اس شوخ چشم کا مجھ پر گذار ہوا، اور وہ میرے حالِ تباہ سے خبردار ہوا ؎

دیر بر سر آن غزالِ دوٗر گرد آمد مرا
از طپیدن ہائے دل پہلو بدرد آمد مرا[۱]

اگر تم چاہتے ہو کہ اُس کی راہ میں سختی جھیلنے والے شمار کیے جاؤ تو چاہیئے کہ فولاد کا دل اور پتھر کا کلیجا لاؤ۔

(سخنانِ غریب) اے عزیز اگر وہ بانکا چھب والا آنکھوں کے سامنے ہے، تو یہی بہشتِ جاوید کا عالم ہے، اگر وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو یہی عاشقِ ناامید کا جہنم

۱؎ (ترجمہ) بڑی دیر کے بعد وہ غزالِ رمیدہ (محبوب) میرے پاس آیا، کہ دل کے تڑپنے سے میرا پہلو بھی درد کرنے لگا تھا۔ (میرزا رضی دانش) میر رضی بن میر ابو تراب رضوی مشہدی شاہ جہاں کے عہد میں ہندستان آیا اور دربار میں باریاب ہوا۔ داراشکوہ نے ایک بار صرف اِس شعر پر ایک لاکھ روپیہ دیا تھا:-

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیساں در بہار　　قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

پھر بنگالہ میں شہزادہ محمد شجاع کے ساتھ رہا وہاں سے دکن کو ہجرت کی اور عبداللہ قطب شاہ کا مقرب رہا۔ رضی کے والد میر ابو تُراب بھی شاعر تھے۔ فطرت تخلص تھا۔ سن ۱۰۶۰ھ میں حیدرآباد جاکر انتقال کیا اور دائرہ میر محمد مومن میں مدفون ہوئے۔ سن ۱۰۷۲ھ میں عبداللہ قطب شاہ نے میر رضی کو اپنی طرف سے زیارتِ عتبات کے لیے مشہد کو رخصت کیا۔ میر رضی نے سن ۱۰۷۶ھ میں انتقال کیا۔ (سروِ آزاد/ ۸۷-۸۸ و خزانۂ عامرہ/۲۱۷)

ہے۔ جان رکھو حقیقت کا اُور چھور نہیں ملتا۔ یعنی ہمیں کچھ پتا نہیں۔ کیا جانے زاہدانِ ریاضت پیشہ کیا ٹھانے ہوئے ہیں۔ اور اُس مستِ سر انداز کے متوالے کیا جانے ہوئے ہیں! ایک جماعت کو خواہش کی خلش ہے تو دوسری کو کاہش کی کاوش۔ مگر جو حق شناس ہیں، وارستۂ امید و یاس ہیں۔ وہ عزیز جو خدا کے ہو گئے، اُس کی رضا میں کھو گئے۔ عاشقوں کی جان کو تلخیوں سے ضرور پالا پڑا ہے، مگر اُن کا خون میٹھا بڑا ہے (یعنی وہی لذّت اندوز بھی ہیں) رنج کو گوارا کرو کہ اپنے تئیں شایانِ راحت بنا سکو۔ کڑیاں جھیلو کہ بفراغت یہاں سے جا سکو۔ اِس دنیا سے دل اُٹھانا اچھا ہے، اگر معرفتِ حق میسّر نہ ہو تب بھی یہ کیا بُرا ہے؟ دنیا کی عمارت ڈھے جانے والی ہے۔ اِس کی بنیاد وہم پر مطلق ہے۔ یہ نیلے گنبد والا آسمان گر جانے والا ہے کیونکہ ہوا میں مُعلق ہے۔ اگر مقصود تک پہنچنا چاہو تو کسی دل میں راہ کرو اور جو کچھ خدمت تمھارے دستِ کوتہ سے بن پڑے، للہ کرو۔ اگر تم دریا کے شناور ہو، تہہ تک نہیں پہنچ سکتے، تو خیر کنارے پر رہو، یعنی اگر اک دم اپنے ہلاک پر قادر نہیں ہو تو جان دینے کو آمادہ اشارے پر رہو! خود کو دیر و مسجد کی قید سے بچاؤ یعنی خدا کے بنو اور سب جگہ جاؤ!

(فائدہ) عارفوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک جماعت کے لوگ نقشِ دیوار ہیں گویا بے زبان ہیں، یعنی اُس پُرکار کی صنعت گری و تازہ کاری کے حیران ہیں، جو کچھ اُنھوں نے دیکھا ہے، دیکھا ہے، جو سمجھا ہے، سمجھا ہے! ـــ دوسری جماعت کے لوگ بادام کی طرح زبانِ مغز دار رکھتے ہیں یعنی معشوق کی چشمِ سخن گو کے اشارے پَرکھتے ہیں جب وہ اُس کے انکھڑیاں لڑانے کے طور دکھاتے ہیں، ہزار رنگ سخن زبان پر لاتے ہیں اور یار کے پلک جھپکانے کی ادا سو سو طرح بتاتے ہیں۔ چنانچہ اُس مستِ ناز کے کمالات حدِ شمار سے بڑھ کر ہیں تو اس بے خود کے کلمات بھی دائرۂ بیان سے باہر ہیں!

پہلی ملاقات تھی، جلد ہی ختم ہو گئی۔ فقیر کو اِس سے زیادہ زحمت دینا مناسب

نہ سمجھا، (چچا نے) میرے والد کی خدمت میں آ کر، اُن کا سارا احوال بیان کیا۔

انھوں نے کہا ع "ہر گُلے را رنگ و بُوے دیگر است"۔ ہم مشرب درویش کہاں میّسر آتے ہیں، اُنھیں دیکھنے کے لیے اکثر جایا کرو۔"

دوسری مُلاقات

ایک دن عصر کی نماز کے بعد اُن سے ملنے گئے، اور مجھے بھی لیتے گئے۔ درویش نے بڑی شفقت سے مجھے بلایا، اور عزّت سے اپنے سامنے بٹھایا، میں تو کم سن تھا، چچا سے مُخاطِب ہوئے اور میرے بارے میں دریافت کیا۔ چچا نے بتایا: "یہ علی متّقی کا فرزند ہے"۔ فرمانے لگے: "اُوہ پھر تم سے کیا پوچھنا، اِس بچّے کا باپ تو بڑا دانائے اسرار ہے۔ خورشیدِ آسمانِ درویشی مشہورِ جہاں، بلکہ جانِ درویشی جس کی تہ سے موتی نکلتے ہیں، ایسا دریا ہے۔ ہم تو پھکّڑ ہیں ہم فقیروں کے پاس کیا دھرا ہے۔ صاحبزادے میری طرف سے سلامِ نیاز کے بعد کہنا کہ یہ شوقِ بے پایاں کی کوتاہی نہیں، (جواب تک خدمت میں حاضر نہ ہو سکا) بلکہ شکستہ پائی نکلنے نہیں دیتی اور قسمت بھی کچھ ہیٹی ہے جو چاہتی ہے کہ اِس خرابے سے قدم باہر نہ نکالوں، آپ بڑے پورے قلندر ہیں ہم آپ کی نسبت کمتر ہیں، اِس بے سروپا کے لیے، کبھی وقت مُساعد ہوگا تو ہاتھ اُٹھائیے دعا کے لیے۔

پھر بات کا رُخ بدل دیا اور عمّ بزرگوار کو مخاطَب کیا کہ "اے عزیز! ہمہ تن گوش ہو جاؤ فقیروں کی بات پر دھیان جماؤ"۔

(نکتہ) "ہماری عبادت ہمارے ہی لیے ہے، وہاں تو خدائی ہے کسے پَروا ہے؟ ہماری بندگی یہی نہیں کہ اپنے اُوپر پھول جائیں اور خدا پر بھروسا کر کے بھُول جائیں کہ اگر قبول کر لیں تو گراں بارِ احسان ہیں۔ ارے ہم تو بندے ہیں، اگر کوئی نہ پوچھے تب بھی اس کے سوا نہیں کہہ سکتے کہ پشیمان ہیں۔ یہ جو نفس نے تمھیں بہکا رکھا ہے کہ تم بھی کچھ ہو محض شُومی ہے اور جب اپنی حقیقت کو خوب جانو گے تو نِری محرومی!

وہ سروِ ناز اپنی ہی خوش خرامی پر قربان ہے اور اُس کی تجلّیاں ہزار رنگ میں پیدا و پنہاں، تم نے کیا پُوچھا ہے، کیا ٹھہرایا ہے، کیا سوچا ہے، کس سے دل لگایا ہے؟ کبھی وہ فتنے جگاتا ہے، کبھی عزّت دلاتا ہے۔ زینہار! کسی دل کو ٹھیس نہ لگائیو، جفا کاری اپنا شعار نہ بنائیو، دل کا عرش اس لیے نام ہے کہ وہ خاص اُس ماہ کا مقام ہے ؎

نیازارم زخود، ہرگز دلے را　　کہ می ترسم درو جائے تو باشد[۱]

(نکتہ) اے عزیز، وہ محبوب، محبّت پسند ہے یعنی عاشقوں کا دوست دار —— اور اتنی بے نیازی کے باوجود، اُن کے حال سے خبردار۔ وہ جب مراقب ہوتے ہیں تو دل میں جلوہ گر ہے، جب آنکھیں مُوندتے ہیں تو پیشِ نظر ہے، جس در سے یہ چاہتے ہیں وہ آتا ہے، جس رنگ میں یہ ڈھونڈھتے ہیں وہ جلوہ دکھاتا ہے۔ رنج اور خوشی اُن کے احوال کی تابع ہے، اگر خوش ہوتے ہیں تو گرفتگی اِس چمن سے دُور ہو جاتی ہے، کُڑھتے ہیں تو کلی بھی نہیں مسکراتی ہے۔ مگر اُن کی باتیں جگ سے نرالی ہیں، کہ معشوق پہلو میں اور دل خوشی سے خالی ہیں۔ کبھی کھوج میں ہیں کبھی سوچ میں۔ قرار نہیں پکڑتے تسلّی نہیں ہوتے خدا ہی جانے کہ وہ خدا سے کیا چاہتے ہیں، کوئی خواہش نہیں اور گھُلے جاتے ہیں!

(حکایتِ تمثیلی) کیا تم نے نہیں سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں کال پڑا جانیں ضائع ہونے لگیں۔ لوگوں نے کہا: "اے موسیٰ جنابِ باری میں عرض کیجیے کہ بارش نہیں آتی اور خلق خدا مصیبت جھیلنے کی تاب نہیں لاتی، مفت ہلاک ہوتی ہے اپنی جان کھوتی ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام کوہِ طور پر گئے اور التجا کی۔ جواب ملا: "فلاں گھُورے پر ایک مجذوب پڑا ہے، میں اُس کی بڑ پسند کرتا ہوں، لیکن کچھ دنوں سے وہ

---

[۱] (ترجمہ) میں اپنی جانب سے کسی کے دل کو آزار نہیں پہنچاتا، ڈرتا ہوں کہ اُس میں تیرا مسکن ہوگا! یہ شعر نظیری نیشاپوری کا ہے۔ شبلی کا کہنا ہے کہ نظیری کے قیامِ کاشان کے زمانے میں طرحی مشاعرے ہوتے تھے جن میں ایک بار طرح دی گئی تھی: جائے تو باشد، آرائے تو باشد اور 'جائے' کے قافیے میں سب سے بہتر شعر نظیری کا ہوا تھا (محولہ بالا) نظیری اُن دنوں نوجوان تھا۔ (شعر العجم ۳/۱۳۰)

آسمان کی طرف رُو نہیں کرتا، اور پہلے جیسی گفتگو نہیں کرتا، پانی برسنا اُس کے بولنے پر موقوف ہے۔

جب اُس بارگاہ سے یہ جواب سُنا تو اُسی گھورے کی طرف لپکے اور اُس گدڑی پوش کو پالیا۔ دیکھا کہ ایک مرد مٹّی کے ڈھیے پر لیٹا ہوا ہے، بدن سے اُس نے سیاہ کمبل لپیٹا ہوا ہے۔ سراپا ذوق، مستغرقِ دریائے شوق، دیوانِ تجرید کا شعر یکتا، جریدۂ تفرید کا فردِ بے ہمتا (حضرتِ موسیٰ سے) دوچار ہوتے ہی حرف زن یُوں ہُوا: "اے موسیٰ اس گھورے پر تمھارا گذر کیوں ہوا؟ کاہے سے دل لگانا ہوا جو اِدھر آنا ہوا۔" (حضرت موسیٰ نے) فرمایا: "پانی بند ہے، کسی کی دعا کارگر نہیں ہوتی اور خلق سے زندگی بسر نہیں ہوتی، میں نے جنابِ باری میں التجا کی تھی، معلوم ہوا کہ تم نے سکوت اختیار کر لیا ہے اِس لیے انقباض ہے۔ جب تک عادتِ قدیم کے موافق باتیں نہ کرو گے، بادلوں کو ہوا نہ لائے گی اور یارانِ رحمت نہ برسائے گی، خدا کے لیے ذرا آسمان کی طرف منھ اُٹھا لو اور اس بلا کو ٹالو۔"

(اُس مجذوب نے) کہا: "اے موسیٰ وہ فریبی آپ کی سمجھ میں نہیں آیا ہے اور آپ نے میری طرح اُس کی محبّت میں دل نہیں گنوایا ہے، اُس عیّار کی باتیں پہلو دار ہوتی ہیں اور اُس کی اشارتیں دل کو سو جگہ ڈبوتی ہیں، استغفراللہ میں اُس کے بہکائے میں کیوں آؤں گا، ہاں اُس کے رسولؐ کا پاس نہ کروں تو کافر ہو جاؤں گا، اِس لیے کہ کہتے ہیں:

باخدا دیوانہ باش و بانبی ہُشیار باش!"

غرض کہ اُس عشقِ مطلق کے گرفتار، اور کمالاتِ حق کے حیران کار نے آسمان کی طرف مُنھ اُٹھایا، اور حسبِ عادت بڑبڑایا کہ: "اے سراپا فریب، اے دشمنِ شکیب! پہلے تو بادل، ہوا، بارش سب تیرے اِشارے پر تھے، اب یہ میرے فرماں بردار ہو گئے! کہ میں کہوں گا تو ہوا چلے گی، بادل آئیں گے، بارش ہو گی! ہاں تو سچّا ہے، بھلا تیرا کیا اختیار ہے،

اس کارخانے کا چلانے والا تو میں ہوں! یہ فریب چھوڑ دے جا مخلوق پر رحم کھا!" دو تین بار ایسی ہی بڑ ہانکی ہوگی، کہ ناگاہ ہوا کے جھونکے آئے اور خوب گھنے بادل چھائے، پھر تو ٹوٹ کے برسے۔

اے عزیز، کون معشوق اپنے عاشق کا اتنا پاس کرتا ہے؟ افسوس ہے اگر تم اُس سے تعلق پیدا نہ کرو، اور اُس سرمایۂ جان کی طلب میں نہ مرو۔ دل اگر اُس کے لیے خون ہو جائے تو اچھا، اور جان اُس کی طلب میں کھو جائے تو اچھا۔ اپنے تئیں اس کے رنگ میں یوں رچاؤ کہ تم وہ بن جاؤ اور ایسے کھو جاؤ کہ پھر نظر نہ آؤ۔ رباعی

نَے دل بخیالِ زلف و رُو باید داد　　　نَے جاں بہوائے رنگ و بُو باید داد

این جا دل راچہ قدر و جان راچہ محل　　　خود را ہمہ اُو کردہ باُو باید داد[1]

اتنے میں عصر[2] کا وقت ہو گیا، ہم اُٹھے اور اُن کے ساتھ نماز پڑھی، نماز سے فراغت کے بعد مشرق کی طرف منہ کرکے بیٹھے اور فرمایا: "اے میر امان اللہ، آج میں نے وہ چیز کھائی ہے جو کبھی نہیں کھائی تھی اور اتنی لذیذ غذا کبھی ہاتھ نہیں آئی تھی۔" میرے چچا کچھ بے تکلف ہو گئے تھے کہنے لگے: "شاہ صاحب مبالغے کی بھی حد اور تکلف کی انتہا ہے، آپ کا جسم تو فاقوں کے بوجھ سے خم ہے، پیٹ سے قناعت کا پتھر بندھا ہے، ایک گھونٹ پانی سو جتن سے ملتا ہے، انتہائی افلاس کا عالم ہے، ہر روز مرنے کو کھڑے ہو، اس حالِ تباہ سے اِس ویرانے میں پڑے ہو، کہاں لذیذ کھانا، کہاں آپ! جائیے زیادہ باتیں نہ بنائیے!"

(درویش نے) کہا: "واللہ کہ میں بڑ بولا اور زیٹ ہانکنے والا نہیں ہوں، جہاں

---

[1] (ترجمہ) نہ تو دل زلف و رخ کی یاد میں دینا چاہیئے، نہ جان، رنگ و بو کی ہوس میں گنوانی چاہیئے یہاں دل کی کیا قدر اور جان کا کیا موقع ہے؟ خود کو سراپا محبوب (عینِ ذات) بنا کر اُسی کو سونپ دینا چاہیئے (یعنی ہستیٔ محبوب میں ضم ہو جانا ہی عشق کا کمال ہے۔) [2] عصر کی نماز تو پڑھ کر گئے تھے، دوبارہ کیسی؟ نسخۂ لاہور میں 'نمازِ مغرب' ہے، اور یہی صحیح ہے۔

جھوٹ کا احتمال ہو وہاں جھانکنے والا نہیں ہوں۔ سنو! صبح سے بھوک کی دَوْں لگ رہی تھی اور نفسِ شُوم بیسرِ جَلی بلّی کی طرح بے قرار تھا، یعنی چاہتا تھا کہ شہر جاؤں، اور کس و ناکس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں، لیکن میں پتھر سرہانے دھرے لیٹا رہا اور غیرت کی حفاظت میں دل پر جبر سہا۔ کہ اتنے میں ایک چوہا آدھی سوکھی روٹی منھ میں دبا کر لایا اور اِس حجرے میں جو دلِ عاشق سے زیادہ شکستہ ہے، آیا، میں بظاہر تو فاقہ کشی سے گربۂ مسکیں ہوں، لیکن باطن میں شیر ہوں، ایسا نہیں ہوں، اُس نے مجھے دیکھا تو وہ آدھی روٹی چھوڑ کر بھاگ گیا، میں نصف دل خوش اُٹھا، اور وہ ٹکڑا لے آیا۔ لیکن پانی نہ تھا کہ اُسے پاک کرتا۔ کسی خضر کے انتظار میں بیٹھ گیا، ذرا دیر بعد سقّے کی آواز میرے کان میں آئی، اپنا بے ہتھے کا کوزہ لے کر گیا، اور پانی لایا، اس آدھی سوکھی روٹی کو دھو کر پانی میں بھگویا اور کھایا۔ خدا شاہد ہے کہ اُس نے جنّت کی نعمتوں کا مزہ یاد دلایا۔ میرے عزیز، فقیروں کی باتوں میں بناوٹ یا مبالغہ نہیں ہوتا، وہ شیخی خورے آسمان کے شاگرد نہیں ہیں جو بے پیندے کے بدھنے بناتا ہے۔ اِس گروہ کی صحبت میں پھبتی کسنا، اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارنا ہے، زبان کو لگام دے کر رکھو، کیونکہ درویشوں کی شکر رنجی بے ادبوں کا شربتِ شہادت بن جاتی ہے۔"

چچا کو اس خطاب سے ندامت ہوئی اور اپنی بکواس کی معذرت چاہی، جب تنبیہ ہوگئی تو اُسی عنایت سے فرمانے لگے: "اے عزیز، میں تمھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، لیکن یہ تنبیہ ضروری تھی کیونکہ گستاخانہ بات منھ سے نکالنا آدابِ درویشی کے خلاف ہے۔" اِنھیں باتوں میں رات ہوگئی، ہم نے اجازت چاہی، فرمایا: "خدا حافظ!" وہاں سے آکر ہم والد صاحب کی خدمت میں گئے اور درویش کا سلام و پیام پہنچایا، فرمایا: اُن کی عنایت ہے، اب اپنے چچا کے ساتھ جاؤ تو میرا اسلام ضرور کہہ دینا۔"

بایزیدؒ کی وفات (تیسری ملاقات) ہم اُن کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ بیمار ہیں، اور

ایک پہلو سے پڑے ہوئے کراہ رہے ہیں، جب میرے چچا پر نظر کی تو ایک ٹھنڈی آہ سَرکی، اپنے سامنے بلایا اور شفائیؔ[1] کا یہ شعر سنایا ؎

پرستارے نہ دارم بر سرِ بالینِ بیمارے   مگر آہے، ازین پہلو، بآن پہلو بگرداند[2]

(چچا نے) دریافت کیا: "کیا حال ہے؟ جو اتنا ملال ہے؟" کہنے لگے: "اے عزیز میرا سینہ ایسے پُھنکا جارہا ہے جیسے اندر کوئی آگ بھڑکا رہا ہے، جو نالہ کر رہا ہوں اسی آگ کی لپٹ ہے جو آہ بھر رہا ہوں اُسی شعلے کی لپک ہے۔

من نمی دانم کہ دِل می سوزد از غم یا جگر
آتش افتادہ است در جائے و دودے می کند[3]

اگر موت میری فریاد سُن لے تو اِسے جنّت سمجھو، ورنہ یہ دوزخ ہے، جیسے بداعمالیوں کی عقوبت سمجھو، اب تو جان کا نکل جانا ہی فتوح ہے کیونکہ سانس کی آمد و شد بھی سوہانِ رُوح ہے۔ رات کو بے خواب رہتا ہوں، دن کو بے تاب، کیا کروں کس میں دل دھروں کہ مرجاؤں اور چین حاصل کر جاؤں ؎

روزے بشب کنم بصد اندوہِ سینہ سوز
شب را سحر کنم، باُمیدِ کدام روز؟[4]

ہوا چلتی ہے تو اِس آگ کو بھڑکاتی ہے، پانی پیتا ہوں تو تیل کا کام کرتا ہے، کوئی دَوا موافق نہیں آتی، کوئی تدبیر پیش نہیں جاتی، اگر مجھے چمن میں لے جاؤ گے

---

[1] شرف الدین حسین شفائی حکیم ملا کے فرزند اور مشہور طبیب تھے شاہ عباس صفوی کے دربار میں مراتبِ قُرب پر فائز تھے۔ اُن سے ایک قرابادین بھی یادگار ہے۔ رمضان ۱۰۳۷ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان اور چند مثنویاں شعری تصانیف میں ہیں۔ (سروآزاد/ ۴۷)

[2] (ترجمہ) بیماری میں میرا کوئی خدمت گار بھی نہیں ہے، بس اک آہ ہے جو اس پہلو سے اُس پہلو کو لٹا دیتی ہے! (حکیم شرف الدین شفائی) [3] (ترجمہ) میں نہیں جانتا کہ دل غم سے پُھنک رہا ہے یا جگر، بس ایسا ہے جیسے کسی جگہ آگ جا پڑی ہے اور وہ دُھواں دے رہی ہے! (سائر مشہدی) [4] (ترجمہ) دن کو تو ایسی جاں سوز مصیبت کے ساتھ رات کرتا ہوں، اب رات کو کس دن کی اُمید پر صبح کروں؟

تب بھی اِس کُڑھن سے ہاتھ ملتا رہوں گا، عمّان میں پھینک دوگے تو بھی یُوہیں جلتا رہوں گا۔ کاش میرا سینہ چیر کر دل و جگر جلدی سے نکال دیں، یا مجھے یہاں سے لے جائیں اور زندہ ہی قبر میں ڈال دیں۔"

القصہ، اُس دل سوختہ و جگر کباب کا احوال زوالِ آفتاب تک اِسی طور رہا، کبھی دیوار کے سہارے کھڑا ہوجاتا، کبھی بیٹھتا اور گر جاتا، کبھی آنکھیں کھول کر مایوسی سے دیکھتا، کبھی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا۔

ناگاہ میں نے کہا: "ظہر کا وقت ہوگیا۔" (درویش نے) بڑے خُشوع و خضُوع سے نماز ادا کی، سجدے میں سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعْلیٰ کہا اور قضا کی ؎

آتشِ عشقش بسے را سوختست
لیک زین سان کم کسے را سوختست[1]

عمِ بزرگوار نے چند نوکروں کے ساتھ اُن کی تجہیز و تکفین کا سب انتظام کرایا، حجرے میں جو دلِ عاشق سے زیادہ شکستہ تھا، دفنایا، یہ خبر سُن کر میرے والد نے نہایت افسوس کیا اور فرمایا کہ: "ایسا انسان صفت دیر میں پیدا ہوتا ہے، افسوس اُنھوں نے جانے میں جلدی کی۔"

(نقل) وہ دل سوختہ مرحوم ایک رات کو میرے چچا کے خواب میں آتے ہیں اور کہتے ہیں: "تم نے دیکھا؟ عشق نے مجھ میں کیسی آگ لگائی اور کیسا پھونکا۔ اب موت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ جب انھوں نے میری جان کی بے تابی دیکھی تو مجھے رحمت کے بے پایاں سمندر میں ڈال دیا، اور گوہرِ مراد سے ہم کنار کردیا، یعنی مجھے کَل پڑگئی، آرام مل گیا، دل کی مُراد کے مطابق اس نگار بہشت رُو کا وصالِ دوام مل گیا۔"

یہ واقعہ دیکھ کر میرے چچا کے دل میں وحشت سی پیدا ہوگئی، مدّت تک کسی شے

---

[1] (ترجمہ) اُس کے عشق کی آگ نے بہتوں کو جلایا ہے، لیکن ایسا کسی کو کم جلایا ہوگا۔

سے مانوس نہ ہوئے۔ اکثر فرماتے: "بایزید عجب سوختہ جاں تھے، اُن کی جُدائی کا داغ میری چھاتی پر ہے جب تک زندہ ہوں، مٹ نہیں سکتا۔"

بر سبیلِ حکایت اُنھوں نے یہ خواب میرے والد سے بیان کیا، انھوں نے فرمایا: "کیا تعجّب ہے؟ خداوند تعالیٰ کریمِ مطلق ہے۔ تم نے یہ قصہ نہیں سنا؟

بایزید بسطامی کا قصہ

(حکایتِ تمثیلی) مشہور عارف، حضرت بایزید بسطامی[1] (رحمۃ اللہ علیہ) کا گھر ایک آتش پرست کے گھر سے ملا ہوا تھا، اور وہ اُسے چالیس سال سے جانتے تھے۔ وہ ہر صبح سویرے تختے پیٹ کر پوجا کیا کرتا تھا، اور یہ اُس سے فرماتے تھے کہ "اے ترسا، اِس تختہ بجانے سے تیرے اُوپر جنّت کا دروازہ نہیں کھلے گا، اگر نجات کی خواہش ہے تو آ اسلام قبول کرلے۔"

ایک دن اُس کو خیال آیا کہ بایزید" سنکی آدمی نہیں ہیں، چالیس سال سے (مجھے) اِسلام (قبول کرنے) کی دعوت دے رہے ہیں، (یہ بات) کسی فائدے سے خالی نہیں ہو سکتی، (یہ سوچ کر) سیدھا اُن کی مجلس میں آیا اور کہنے لگا: "اے شیخ، تم جو ہر صبح کہتے ہو کہ مسلمان ہو جا، میری نجات کی ضمانت بھی کر سکتے ہو؟" شیخ کو اُس وقت حالتِ سُکر تھی، کاغذ گر سے ایک کاغذ طلب فرمایا اور اُس کو نجات کی ضمانت لکھ کر دے دی، وہ چلا گیا، اور مسلمان ہو گیا۔

اتفاق سے اُسی ہفتے وہ اچانک مر گیا، اُس کے وارثوں نے شیخ کی تحریر کو کفن کے گریبان سے ٹانک کر اُسے دفن کر دیا۔ جب شیخ عالمِ صحو میں آئے تو بہت حیران ہوئے، ایک مرید نے تشویش کا باعث پوچھا، فرمایا: "عالمِ بے خودی میں ایک ایسا

---

[1] ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن آدم معروف بہ بایزید بسطامی بسطام کے معروف صوفی ہیں ۲۶۱ھ (۸۷۵ء یا) ۲۶۴ھ (۸۷۷-۸۷۸ء) میں انتقال فرمایا۔ تصوّف میں 'نظریۂ فنا' سب سے پہلے آپ ہی نے پیش کیا تھا۔ اور سلسلہ طیفوریہ یا بسطامیہ کے بانی بھی ہیں۔

(داراشکوہ: مجمع البحرین مرتبہ محفوظ الحق طبع کلکتہ ۱۹۲۹ء)

کام کر بیٹھا ہوں، جس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا!"

مرید نے کہا: "جی ہاں، اُس وقت وہ آپ کا واقف آتش پرست شیخ سے اپنی نجات کی ضمانت لکھوا کر لے گیا تھا، کہتے ہیں وہ مسلمان ہوا اور مر گیا۔" یہ سن کر شیخ کو غش آگیا، اُن کے منہ پر پانی کے بہت چھینٹے دیے تب کہیں ہوش آیا۔ فرمانے لگے: "مجھے اپنی ہی نجات میں تردد تھا، یہ جگر کہاں سے لایا کہ دوسرے کی ذمہ داری بھی اپنے سر منڈھ لی!" گرتے پڑتے اُس نومسلم کی قبر تک پہنچے اور متوجہ باطن ہوئے۔ اُس کے معاملے میں دیکھا کہ وہی کاغذ ہاتھ میں ہے اور کہہ رہا ہے: "اے بایزید، تمھاری تحریر میرے کچھ کام نہ آئی، اِس پرچے کے دکھانے سے پہلے ہی، جسے میں اپنی نجات کا پروانہ سمجھے بیٹھا تھا، اُس کریم نے مجھے اِس طور سے اپنے قریب بلایا کہ مقرب فرشتوں کی نظریں بھی میرے معاملے کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں، تم اپنا دل پریشان نہ کرو، تو یہ رہی تمھاری تحریر، اِسے لیتے جاؤ!"

جب ایسے بدوں کو، اُس کا کرم، اِس طرح پالیتا ہے، تو وہ درویش (جنھیں میر امان اللہ نے خواب میں دیکھا تھا) پھر خوبانِ روزگار میں تھے، اگر وہ دریائے رحمت میں غوطہ زن نہ ہوتے تو یہ سارا ماجرا (بایزید کی بیماری) بے کار ہی جاتا؟

والد کے کلماتِ معرفت

(سخنانِ نغز) اے برادرِ عزیز، جب تم جانتے ہو کہ وہ سدا گلاب، ہزار رنگ میں جلوہ گری کرتا ہے، اور یہ چمن اُسی کا سنوارا ہوا، اور یہ رنگ اُسی کے بھرے ہوئے ہیں تو اگر دیکھتے ہو، غور سے دیکھو، قدم اٹھاتے ہو تو دیکھ بھال کر اُٹھاؤ، کائنات کے تمام ذرّوں میں اُسی آفتاب کا عکس ہے، اگر تم اُس کی ادا پہچان گئے تو تمھارا دل کامیاب ہے۔ جس کا دل زندہ اور آنکھیں روشن ہیں، جانتا ہے کہ حباب اور موج دریا ہی سے ہیں۔ غافل بھی سچا ہے، اگر وہ غفلت میں ہے، ساحل پر پڑا ہوا دریا کی کیا جانے آؤ چلو کہ ہم بیچ سے نکل جائیں،

شاید جان کی تمنا کے مطابق ہمہ اُد بن جائیں۔

موسمِ جوانی گیا، لطفِ زندگانی گیا، عمر ساٹھ سال کی ہوگئی، بڑھاپا آن پہنچا، قامت خم ہوئی طاقت کم ہوئی، دماغ ضعیف، طبیعت سے روانی گئی اور مزاج سے جولانی، آنکھوں سے بصارت گئی، کانوں سے سماعت۔ ذوق، بے ذوق، دانت کمزور، پانو ناتواں، سر بے شور، بال سفید، دل نا اُمید، یہ زنگ و زنجیر کمر سے نکال دو، آرایشِ فقیری کے زمانے کھو گئے، اور سر کی زنجیر پیر میں ڈال دو، زینتِ قلندری کے دن ہَوا ہو گئے۔"

(نکتہ) "زندگی میں شہرت کا لحاظ کرو (یعنی جیسے کہلاؤ ویسے بنو) اور آخرت کے لیے عقل کی روشنی میں کام کرو۔ یعنی ظاہر کو باطن جیسا بناؤ اور باطن کو عقل کے مطابق دکھاؤ۔ اگر یار حرم میں جلوہ گر ہے تو مسلمان ہونا ہُنر ہے، مقصودِ دل کا وہی ہے چاہے جس دَر سے آئے۔ اور اگر اُس کا جلوہ یقیناً بُت خانے میں ہے، تو کیا حرج کافر بن جانے میں ہے؟ آنکھوں کا منظور تو وہی ہے جہاں کہیں بھی نظر آئے! ؎

بَدیر و کعبہ، می گردیم، گاہ این جا و گاہ آن جا
کہ مطلبِ جستجوے اوست، خواہ این جا و خواہ آن جا[۱]

(نصیحتِ درویشانہ) چاہیئے کہ گوشہ نشیں رہو، اور کچھ دن تنہا نشین رہو، آنکھوں میں الوپ انجن لگاؤ، اور سب کی نگاہوں سے اُدجھل ہو جاؤ، کسی چیز سے التفات نہ کرو، خدا پر نظر رکھو اور ہرگز کسی سے ملاقات نہ کرو، بوالہوسوں کی صحبت بہت اُٹھائی اب وہ وقت ہے کہ ذرا پلک جھپکی اور مَوت آئی، کب تک اُونگھو گے؟ غفلت سے باز آؤ، اگر نکتہ رَس ہو تو اِس شعر کا مفہوم سمجھ جاؤ ؎

---

[۱] (ترجمہ) ہم دیر و کعبے میں بھٹک رہے ہیں، کبھی یہاں ہیں کبھی وہاں ہیں کیونکہ اُس (محبوبِ حقیقی) کی جستجو سے مطلب ہے خواہ وہ یہاں ملے یا وہاں!

دیدہ ام، در علمِ صحبت ہائے رنگیں صد کتاب
کردہ ام، یک مصرعۂ تنہا نشینی انتخاب [۱]

نہ جانے کیا سوچ رہے ہو جو اپنا مداوا نہیں کرتے، بس اب ہوا و ہوس کی سرگرانی دور کرو، سر کو یادِ حق کے نشے میں چور کرو، اپنی سفید داڑھی کا پاس کر کے فریب اور چاپلوسی چھوڑ دیجیو، خرقِ عادت کا قصد نہ کیجیو، خدا کے کھلیان میں اپنی گائے نہ باندھیو، خدائی کا دم بھرنا اپنے گدھے پن کا شہر میں شہرہ کرنا ہے اگر بے ارادہ کوئی کرامت ظاہر ہو بھی جائے تو اِترائیو مت کہ غرور کا نتیجہ پشیمانی ہے۔ اکڑفوں کو درویش عیب جانتے ہیں اور گھمنڈی کو آدمی نہیں مانتے۔"

جب (چچا) رخصت ہوئے تو دل میں عہد کیا کہ آیندہ کہیں نہ جاؤں گا، اور دن میں دو بار (پیر و مرشد کی خدمت میں) آؤں گا۔

ایک دن میرے والد نے کہا: "اے برادرِ عزیز، دماغ نمٹ رہا ہے، یعنی ہر روز گھٹ رہا ہے، اگر یہ قرآن کے حفظ کرنے میں لگایا جائے، تو کیسا ہے؟ عرض کیا "اچھی بات آپ کے خیال میں آئی!" چنانچہ ڈیڑھ سال کی مدت میں (دونوں نے) مصحفِ مجید کو یاد کر لیا۔

اسد اللہ کی آمد

(نقلِ عجیب) ایک دن دونوں بیٹھے (قرآن شریف کا) دورہ کر رہے تھے، کہ اسد اللہ نامی ایک درویش، نیلا لباس پہنے اور نمدی ٹوپی اوڑھے وارد ہوئے، جب میرے والد کے سامنے آئے، انھوں نے فرمایا: "اے کبود جامہ کے سیرابۂ پز (نہاری فروش) تم نے اتنا دور و دراز کا سفر کیوں اختیار کیا اور ایسے ویران راستے کے شدائد کو اپنے اوپر کیوں ہموار کیا؟" وہ عزیز سامنے

---

[۱] (ترجمہ) میں نے رنگین صحبتوں کے علم میں سینکڑوں کتابیں دیکھی ہیں اور اُن میں سے ایک مصرعہ انتخاب کیا ہے وہ ہے تنہا نشینی!

آکر قدموں پر گر گیا، (والد نے) اُس کا سر چھاتی سے لگایا اور اپنے پاس بٹھایا، میرے چچا نے اِس گرم جوشی پر حیران ہو کر پوچھا: "یہ بزرگ کون ہیں؟" (والد نے) کہا: "میرے پُرانے دوست ہیں!" (چچا) اور بھی حیرت زدہ ہوئے اور کہا: "اتنی گہری دوستی کے لیے تو ملاقات کی کثرت ضروری ہے، مگر میں نے اِن کو (آج سے پہلے) کبھی نہیں دیکھا۔" (والد نے) فرمایا: "میں اور یہ ایک ہی پیر کے مرید ہیں، یہ دو سال میں ایک بار پیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ایک دن میں نے (پیر و مرشد کی خدمت میں) سوال کیا، کیا ہو، جو موت کے آثار (پہلے سے) مجھ پر ظاہر ہو جائیں، تاکہ میں آخرت کی تیاری میں مشغول ہو جاؤں اور دوسری باتوں میں دل نہ لگاؤں۔ ارشاد ہوا جب تم کبود جامہ کے اِس نہاری فروش کو دیکھو تو جان لینا کہ اگلے سال تک زندہ نہ رہو گے۔" لہٰذا یقین کر لو کہ اب میری عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔

بزرگوار چچا یہ الفاظ سُن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے: "اِن شاءَ اللہ میں یہ واقعہ نہیں دیکھوں گا، یعنی اُس (منحوس) دن تک دنیا ہی میں نہ رہوں گا اور یہ صدمہ نہ اُٹھاؤں گا!" جب اُس تازہ وارد (درویش) سے بات چیت شروع ہوئی تو (اُس نے) بیان کیا کہ "کچھ دنوں سے میری دُکان نہیں چل رہی تھی، یعنی میری نہاری کا کوئی گاہک نہ تھا، رات کو بناتا تھا صبح کو اونڈھاتا تھا، جو کچھ جمع پونجی تھی سب گھاٹے میں چلی گئی، ناچار مایوس ہو کر بالبِ خشک و چشمِ تر زمین پر لیٹا تھا اچانک نیند کا جھونکا آیا (اور سو گیا)، دیکھا کہ پیر و مُرشد میرے سرہانے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اے اسد اللہ، ہر چند سفر میں بڑی دشواریاں ہیں اور راستے کی مسافت بھی بڑی پُوری ہے، لیکن ایک بار ملی متقی سے تمھارا ملنا ضروری ہے، میرے اور اُن کے درمیان ایک اشارہ ہے، جیسے ہی تم پہنچو گے وہ سمجھ جائیں گے۔ تمھیں چاہیئے کہ فوراً روانہ ہو جاؤ اور کساد بازاری کا غم نہ کھاؤ کہ جب وہاں سے واپس آؤ گے تو

تمھاری دُکان ایسی چلے گی کہ نہاری تبرّک ہو جائے گی"۔ میں نے بیدار ہو کر دُکان شاگرد کے سپرد کی، زادِ راہ کے لیے آدھی سوکھی روٹی لی اور چل پڑا، تھوڑی مدت میں ایک دنیا سے دوسری میں پہنچ گیا، یعنی 'کبود جامہ'، سے آگرے آیا اور تمھیں اپنے دلی اشتیاق کے مطابق پایا۔ اب میری واپسی تمھارے اختیار میں ہے، جب اجازت دو گے اُدھر کا قصد کروں گا۔ میرے والد مُسکرائے اور کہا: "اے اسد اللہ ایسے کیوں ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟ نہاری خراب نہیں ہوگی جو اتنے بے قرار ہو، تھکے ماندے آئے ہو، اتنی زحمت اُٹھائی ہے، اگر ہم فقیروں کے مشتاق نہیں ہو، تو اپنے ہی آرام کے لیے کچھ دن رہو، جلدی کیا ہے؟ واپسی بھی ہو جائے گی"۔ ایک ملازم کو حکم دیا کہ اُن کا بستر میرے چچا کے حجرے میں بچھا دے اور اُن کی خدمت کرے۔ غرض کہ (والد) ذرا دیر کو بھی اُن سے جدا نہ ہوتے اور دل جوئی و مزاح گوئی میں اُنھیں لگائے رکھتے۔

(فائدہ) ایک دن اُس مہمانِ عزیز نے سوال کیا کہ "مجھے (خدا کی) رُویت کے مسئلے میں کچھ تردّد ہے، درویشوں کی دو جماعتیں ہیں، ایک کا خیال ہے کہ ایک دن ہم اُس غیرتِ ماہ (خدا) کو بدرِ کامل کی طرح (عیان و برملا) دیکھیں گے اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اُس آفتاب کو دیکھنا انسان کی بصارت کے بس کا نہیں"۔ (والد نے) فرمایا کہ "ہم فقیروں کو تو کچھ تردّد نہیں، جب یہ قرار پاگیا کہ وہ عینِ کائنات ہے، تو ہم جدھر بھی نظر ڈالتے ہیں وہی نظر آتا ہے اور جس شے میں دیکھتے ہیں اپنی چھب دکھاتا ہے، وہ معنی ہر صورت میں جلوہ گر ہے اور بشرطِ نظر اُس کا دیدار میسّر ہے"۔

القصہ ایک ہفتے کے بعد (اسد اللہ) رخصت ہوئے اور بعُجلت ہوئے۔

چچا کی وفات

(حکایتِ جاں سوز) عید کی صبح، میرے چچا، نئے کپڑے پہن کر نماز کو گئے، جب واپس آئے، تو اُن کے سینے میں درد

ظاہر ہوا اور ایسی شدت سے کہ چہرے کا رنگ اُڑ گیا، اور دل کا سکون جاتا رہا، میرے والد کو بلایا اور کہنے لگے: "میرے (سینے میں) نہایت شدید درد ہے، ایسا دھیان پڑتا ہے، کہ اب خیریت نہیں اور ایسی گڑھن ہے کہ دم گُھٹا جا رہا ہے، غالباً جانِ ناتواں میں طاقت نہیں۔ میری عبا بدن سے نوچ لو کہ اب یہ نہیں بھاتی ہے، اور میری ٹوپی اُتار پھینکو کہ یہ سر پر بوجھ بنی جاتی ہے، جان میری ناتواں ہے اور یہ بیماری گراں ہے۔ جب وقتِ شام ہوا، وہ درد اور عام ہوا، اُن کی آہ آہ کا شور بلند ہوا، اور وہ سراپا اک دلِ دردمند۔ جب ضبط کرتے تو غنچے کی طرح سمٹ جاتے اور درد سے آہ و فریاد کرتے تو پھول کے مانند بکھر جاتے جب دل بہت گرفتہ ہوتا تو ایسی آتش ناک آہ بھرتے کہ جگرِ سوختہ کا دھواں آسمان پر پہنچتا، اگر بات کرتے تو یہ رباعی پڑھتے۔ (لمصنّفہ)

وقت است کہ رُو بہ مرگ یک بارہ کنیم
آن درد نداریم کہ ما چارہ کنیم
بیماریِ صَعبِ عشق دارد دلِ ما
گر جامہ گزاریم ، کفن پارہ کنیم[1]

جب گھڑی بھر رات گذری تو ناطاقتی حد سے بڑھ گئی، پیر و مرشد سے کہنے لگے کہ "آخر میرے دل نے سختی اُٹھائی اور آنکھیں (شدتِ غم سے) پتھرا گئیں، آپ تو اِس میخانے کے دانائے راز ہیں، اگر میری عمر کے پیمانے میں ابھی کچھ تلچھٹ رہ گئی ہے، تو وہ کسی اور کو دے دیجیے کیوں کہ اِس شدید درد میں دُرد (تلچھٹ) پینے کو جگر چاہیئے! میں موت کی تلخی کو اِس جانِ شیریں کے مقابلے میں سو درجے گوارا تر سمجھتا ہوں"

[1] (ترجمہ)، (اب وہ) وقت ہے کہ بس یک لخت جان نکل جائے (کیوں کہ) ہم وہ درد نہیں رکھتے جس کا علاج ہو سکے ہمارے دل کو عشق کی جان لیوا بیماری ہے اور اس میں ہمارا جان سے گذر جانا ہی شفایاب ہو جانا ہے۔

توجہ فرمائیے کہ چین سے مرجاؤں، رحم کیجیے تاکہ مجھے کل پڑجائے۔ رات گئے اپنی کلاہِ شب پوش مجھے عنایت فرمائی اور غلبۂ ناتوانی سے آنکھیں مُوند لیں، جب رات کٹی یعنی صبح کی پَو پھٹی تو اُن کی الم ناک روح لبوں پر آگئی۔ اُدھر مؤذن نے "اللہ اکبر" کی بانگ سُنائی، اِدھر اس بیمارِ شب زندہ دار کو نیند آئی۔ یعنی دل پر ہاتھ رکھا اور جان جاں آفریں کے سُپرد کی۔

اُن کے پیر و مرشد (میرے والد) نے پگڑی زمین پر دے ماری، گریباں چاک کرلیا اور اس جاں کاہ صدمے سے چھاتی پیٹنے لگے؛ اُن کے مریدوں نے، سروں میں خاک اور جگر پر داغ لیے، اِسی رنجوری کے عالم میں میّت کی رسوم ادا کیں، اور اُس دردمند کا جنازہ تیار کیا ؎

عشق دردِ بے دوائے بودہ است
بہرِ جان و دل بلائے بودہ است[۱]

جب لوگ نماز (جنازہ) کے لیے کھڑے ہوئے تو اکثر فرش پر گر پڑے۔ میرے والد نے کہا: "اے ناواقفِ پاسِ آشنائی، دیر میں کُھلا کہ تو بے وفا ہے، ایسا شتاب رخصت ہوا کہ میری چھاتی پھونک گیا ہے، دوست یوں رخصت نہیں ہوا کرتے، غم خوار ایسے بے مروّت نہیں ہوا کرتے!" ؎

چہ شد آن وفا و عہدے کہ تو وعدہ ہا نمودی
بتو من چہ گفتہ بودم، تو بمن چہ گفتہ بودی؟[۲]

بزرگوں نے جنازے کو کندھا لگایا، یعنی اُسے پوری عزت سے اُٹھایا، پیر و مرشد (والد) کی آہ مُردے کے عَلم کی طرح جنازے کے آگے چل رہی تھی، اُن (چچا) کے

---

[۱] (ترجمہ) عشق ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں، یہ (ہمیشہ) جان و دل کے لیے ایک مصیبت رہا ہے۔ [۲] (ترجمہ) وہ وفا، اور عہد کیا ہوا؟ جب تو نے مجھ سے کچھ وعدے کیے تھے، میں نے تجھ سے کیا کہا تھا اور تو نے مجھ سے کیا کہا تھا؟

معتقد آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے میّت کو شہر سے باہر لے گئے، اور ایک باغ کے گوشے میں سپردِ خاک کر کے پھول برسائے اور فاتحہ پڑھی۔ نہایت صدمہ اُٹھایا اور سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ پایا!

تیجے کے دن جب شہر کے لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آئے تو میرے والد نے کہا کہ ”جس کا ایسا عزیز مر گیا ہو، اگر اُس کو ”عزیزِ مُردہ“ کہیں تو کیا بے جا ہو۔ آج سے مجھے ”عزیز مردہ“ کہا جائے۔“ چناں چہ وہ شہر میں اسی لقب سے مشہور ہو گئے، دن میں سو بار گریہ سر کرتے تھے اور مُردوں کے حال سے بسر کرتے تھے، میں جو اُن کا گود دوں پالا تھا اور اپنی ساری ضرورتوں کو اُن سے کہتا تھا، انھیں کے ساتھ سوتا اور کھاتا تھا، اب دن بھر انھیں یاد کرتا اور رات بھر فریاد کرتا۔ درویش ”عزیز مردہ“ (والد) میری دل جوئی کرتے، اور کبھی مجھے آزردہ نہ ہونے دیتے۔ کبھی کہتے کہ ”بیٹے! میں تمھیں بہت چاہتا ہوں، مگر اس غم میں گھُلا جاتا ہوں کہ میں خود چلنے ہار ہوں۔“ کبھی فرماتے: ”میرے چاند! اب تم گود کے بچّے نہیں ہو، خدا کا شکر ہے، دسؔ سال کے ہو گئے، کیوں جی کُڑھاتے ہو، آخر درویش زادے ہو، دل کو قوی رکھو، اپنے تئیں خدا کو سونپ دو، ہشّاش بشّاش رہو، اور مجھے اپنا ناز بردار سمجھو۔ میری جان، کیا تم دودھ پیتے بچّے ہو جو ہر وقت روتے ہو، اپنا غم کیوں کرتے ہو، خدا جیسا وارث رکھتے ہو! جانے والے کبھی نہیں آتے، گذرنے والے منھ نہیں دکھاتے، بیٹے دنیا میں چل چلاؤ لگ رہا ہے ہر کوئی آمادۂ سفر ہے۔ مت جانیو کہ دنیا تمھارے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ تو مجلسِ رواں نے گمان کر رکھا ہے، جو حاضر تھے چلے گئے، جو بیٹھے تھے اُٹھ گئے، دل مت کڑھاؤ، پھول کے مانند مُسکراؤ، اس چمن کی بہار اُجڑنے والی ہے، اپنے دل پر میل نہ لاؤ، دنیا کا یہ قمار خانہ ایسا بنایا ہے کہ یہاں تم جیسے بہتیروں نے اپنا دل گنوایا ہے۔ جب تک

یہاں کی راہ و رسم نہ جان جاؤ، ہرگز اس راستے پر نہ آؤ، پاکھنٹ کھلاڑیوں کی ایک کہاوت ہے "قمار و راہ قمار" یعنی اناڑی ہو تو نہ کھیلو۔ وہ ہر روز ایسی ہی باتیں کرتے اور بڑے لاڈ سے میری پرورش کرتے تھے۔

احمد بیگ

(نقل) ایک دن بڑی تلخ کامی کے ساتھ (چچا کی) موت کا حلوا تقسیم کر رہے تھے کہ ایک جوان سروِ اندام، احمد بیگ نام شکری رنگ آیا اور شکر انگور (ولایتی انگور) کے چند دانے ہاتھ پر رکھ کر نذر گذارے۔ اور کہا کہ "ولایت سے ابھی آیا ہوں اور حج کا ارادہ رکھتا ہوں جب شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سنا، مشتاق (دیدار) ہو کر خدمتِ سامی میں حاضر ہوا ہوں" والد نے فرمایا: "تم نے شاید یہ نہیں سنا [1]

چرا بہ پائے خود اے کعبہ رَو نمی اُفتی　　　ہمان توئی کہ بفرسنگ می نمایندت [2]

پہلے خود کو پاؤ، پھر کعبے جاؤ، کعبہ درویشوں کے دل ہائے خستہ کا نام ہے اور مقصود اِن جگر ریشوں کو حاصل تمام ہے، اگر ان کا دل ہاتھ میں لاؤ گے تو کعبۂ مراد بغیر سعی کے پاؤ گے، اِسی لیے تو کہا گیا ہے ؎

زکعبہ آیم و رشک آیدم بہ خون نابے
کہ از زیارتِ دل ہائے خستہ می آید [3]

درویشوں کا دل عجیب جا ہے، اِس ویرانے کی بڑی بھلی ہوا ہے، دل کو اِس

---

[1] (ترجمہ) اے کعبے کی طرف جانے والے، تو اپنے ہی قدموں پر کیوں نہیں جھکتا، وہ خود تو ہی ہے جسے فاصلے سے دکھایا جا رہا ہے (کعبہ تو خود تیری ذات ہے، اپنے نفس کا عرفان حاصل کر!) [2] وہاں میر امان اللہ سے بی بی کو چھڑایا اور وہ غریب دق میں گھل کر مری، یہاں ایک شخص کی راہ کھوٹی کی، حج کو جا رہا تھا اسے روک دیا۔ کیا خبر یہ کون سی تعلیم ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں سمجھا کہ یہ ولایتی کعبے کو ولایت سے چلا تھا تو ادھر "ترکستان" کی طرف کیوں آگیا۔ ایران سے کعبے کو جاتے ہوئے آگرہ تو بیچ میں نہیں پڑتا! [3] (ترجمہ) میں کعبے سے آرہا ہوں، مگر مجھے اس خونِ ناب پر رشک آتا ہے جو زخمی دلوں کی زیارت کر کے آتا ہے۔ (مطلب وہی کہ کعبے کی زیارت سے بہتر دل کی زیارت ہے!)

ماہ کی منزل کہتے ہیں، اسی در پہ مقصود کے تلاشی رہتے ہیں۔ایک سالک کعبے کے طواف کو گیا تھا مگر اُس گھر میں کسی کو نہ پایا، دلِ پُر آرزو لیے ناکام لوٹ آیا اِسی حال میں کہا:

کعبہ را دیدم دلم از دردِ تنہائی گداخت
مجلس آرائے کہ مارا خواند خود مہمانِ کیست[1]

جو تم کہتے ہو، حرم کا محرم بھی وہی کہتا ہے، جیسے تم ڈھونڈھتے ہو، کعبہ خود اُس کے کھوج میں رہتا ہے ؎

ہر کرا دیدم چو من گم گشتۂ تحقیق بود
کعبہ را ہم بے تکلف در بیابان یافتم[2]

دلوں کا طواف کرو، یہی کعبے کا طواف ہے، اپنے ہی جویا بنو، اچھا مقصد یہی ہے وجودِ غیر موجود نہیں، اور اُس بن کوئی مشہود نہیں ؎

گفتم بہ حرم، محرمِ این خانہ کدام است؟
آہستہ بمن گفت، کہ بے گانہ کدام است؟[3]

مجھے تمھاری جوانی پر ترس آتا ہے کہ بہت رنج اُٹھاؤ گے اور پھر بھی مقصود نہ پاؤ گے۔ درویشوں کی بات گوشِ جاں سے سنو، کچھ دن ٹھہرو اور یہاں سے نہ جاؤ، اُس جوان نے جب درویش کو ملتفت پایا تو حکم سے سرتابی نہ کی یعنی ٹھہر گیا اور سخت ریاضت میں مشغول ہوا، ذہنِ سلیم رکھتا تھا، اکتساب کیا اور سات مہینے کی مدت میں مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا۔ ایسی خوبی کا پیر اور ایسی محبوبی کا جوان، ایسی حالت کا پیر اور ایسی کیفیت کا جوان، ایسا باکمال پیر اور ایسا صاحبِ حال جوان، ایسی عنایت والا پیر اور اتنی ارادت

---

[1] (ترجمہ) میں نے کعبے کو دیکھا تو میرا دل دردِ تنہائی سے پگھل گیا، جس میزبان نے ہمیں بلایا تھا وہ خود کس کا مہمان ہے۔ [2] (ترجمہ) میں نے جسے بھی دیکھا، میری ہی طرح تحقیق میں سرگرداں تھا۔ کعبے کو بھی بیابان میں سرگرمِ جستجو پایا۔ [3] (ترجمہ) میں نے حرم سے سوال کیا کہ اِس گھر کا محرم کون ہے، اُس نے آہستہ سے مجھ سے کہاں کہ یہاں بے گانہ بھی کون ہے؟ (حکیم شرف الدین شفائیؔ)

والا جوان، ایسی نظر والا پیر اور ایسا اثر والا جوان دنیا کی آنکھوں نے کم دیکھا اور دنیا والوں کے کانوں نے کم سُنا ہے! رات دن شیر و شکر کی طرح (رہتے تھے)، بڑی یک جہتی تھی، اُسے پیر کو ایک دم کے لیے چھوڑنا نامنظور تھا اور "جوانِ عزیز" (کے لقب) سے مشہور تھا۔ اتفاقاً پیر کے پاس کہیں سے کچھ روپیہ بطورِ نذر آیا، (اُنھوں نے) جوان سے فرمایا کہ "اِسے اپنے خرچ میں لاؤ اور حجاز کے سفر پر جاؤ"۔ صبح کی نماز کے بعد دستار کا زیر پیچ اور سجّادۂ محرابی عنایت کیا، اور اُسے رخصت کیا۔

والد کی وفات
١١٤٦ھ

(حکایتِ جاں کاہ) ایک دن چلچلاتی دھوپ میں، "درویشِ عزیز مُردہ" (والد) برادرِ عزیز (میر امان اللہ) کے بھانجے محمد باعث نامی کی عیادت کے لیے، جو ایک عالم، فاضل، اور متصوّفِ کامل تھے، محلّہ عالم گنج میں گئے جو آگرے کا مشہور محلّہ ہے، جب جھٹپٹا ہونے لگا تو وہاں سے گھر آنے کا قصد کر کے چلے، عشائین (مغرب اور عشا کی دو نمازیں ملاکر) اپنی مسجد میں ادا کیں، جب سونے کے لیے بستر پر گئے اور میں حاضر ہوا تو فرمایا: "بیٹے! آج آفتاب[1] کی حرارت نے میرے مزاج پر اثر کیا ہے، سر میں درد ہے، آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخار چڑھے گا"۔ رات کا کھانا نہیں کھایا اور سو گئے، صبح کو بیدار ہوئے،

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب نے صحیح اعتراض فرمایا ہے کہ میرؔ کے والد کا انتقال رجب ١١٤٦ھ میں ہوا اور یہ مہینا دسمبر (١٧٣٣ء) کے مطابق پڑتا ہے، اُس زمانے میں لوہ لگ جانا کس طرح ممکن ہے؟ (معاصر حصّہ ٩)۔ میرؔ نے یہ الفاظ لکھے ہیں "... در آفتاب گرم رفت، ... گفت، اے پسر حرارتِ آفتاب در مزاجِ من تاثیرے کردہ است" (ذکر میر ص ٥٧) اس کے بعد کی عبارت اور اُن کے علاج کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ عملی متقی رجب سے ایک دو ماہ پہلے بیمار ہوئے تھے، "پس از ماہے مشخّص گردید کہ این تب متشبث بقلب است" (ذکر میر ص ٥٨) ظاہر ہے کہ مہینا بھر تو صحیح تشخیص بھی نہ ہو سکی تھی، اگر میر امان اللہ کا انتقال شوال (١١٤٥ھ مطابق مارچ ١٧٣٣ء) میں ہوا، اور میر امان اللہ کے انتقال کے بعد احمد بیگ کا آنا، اور سات ماہ تک رہ کر ریاضت کرنا بھی میرؔ کی تحریر سے ظاہر ہے (ص ٥٥ ذکر میر) اور شوال (١١٤٥ھ) سے ربیع الثانی (١١٤٦ھ) تک یہ ٧ ماہ پورے ہوتے ہیں تو عملی متقی جمادی الاوّل (١١٤٦ھ) میں بیمار پڑے ہوں گے لیکن یہ بھی مطابق ہے (ستمبر ١٧٣٣ء) کے۔ میں نے یہاں صرف لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔

تو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ ابوالفتح نامی طبیب، جو اُن کے پرانے معالج تھے آئے اور ٹھنڈائی پلائی، مگر کچھ افاقہ نہ ہوا، مُبرِّدات میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا، کچھ سود مند نہ ہوا، درویش کو بخار ٹھہر گیا، یعنی روز شام کو چڑھتا اور ساری رات رہتا، بخار توڑنے کی اَن گنت تدبیریں کرتے تھے، لیکن کسی سے یہ عقدۂ دشوار حل نہ ہوا، ایک مہینے کے بعد تشخیص ہوا کہ اس بخار نے قلب کو لپیٹ لیا ہے اور ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے، یعنی یہ درویشِ نحیف، جو مُٹھی بھر ہڈیوں سے زیادہ نہیں تپِ دِق میں مبتلا ہے۔

(ایک دن) مجھ سے بولے: "بیٹے، میری جان صرفِ نیاز ہے اور جسم وقفِ گداز غذا سے کوئی رغبت نہیں، کھاتا ہوں تو گرانی کرتی ہے۔ طبیب جو دوا صبح دیتا ہے وہ (معدے میں) اگلی صبح تک ویسی ہی دَھری رہتی ہے۔ یہ چاہتا ہوں کہ موت آنے تک غذا چھوڑ دوں، بازار سے نرگس کے پانچ چھ دستے لے آؤ کہ بشرطِ زندگی کبھی کبھی سونگھ لیا کروں۔" ارشاد کے بموجب میں نے منگوا لیے اور برابر اُن کے سامنے رکھتا تھا، جب آنکھ کھولتے، دستہ ہاتھ میں لے کر سُونگھتے اور فرماتے: "خدا کا شکر ہے، سیر ہو گیا!" جب اُنھوں نے غذا ترک کر دی تو ہم بے کسوں کو اپنی زندگی سے مایوس کر دیا۔ ہاتھ پانو کی طاقت جواب دے گئی، ضعف حد سے بڑھ گیا، بات بہت کم کرتے اور نماز اشاروں سے پڑھتے۔ ۱۲ رجب[1] کو حسبِ معمول، حکیم ٹھنڈائی کا پیالہ لایا تو درویش نے ناک بھوں چڑھائی اور پینے سے اِنکار کر دیا وہ دوا کا پیالہ زمین پر پٹک کر بولے: "ارے کم بخت دوا کی تاثیر تو اوّل دن سے ظاہر تھی، میں تیرا پاس کرتا تھا جو پی لیتا تھا، افسوس تو نے (اتنی سی بات کو) نہ سمجھا، جا، اب مجھ سے ہاتھ اُٹھا لے، ناقباحت فہمی وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں[2]۔"

---

[1] ۱۱۳۶ھ مطابق ۱۷ دسمبر ۱۷۲۳ء [2] یہ بھی ہم پر نہ کھلا کہ طبیب سے یہ سلوک کرنا کسی درویش کی شان کیسے ہو سکتی ہے۔؟

محمدؐ حسن

اُس وقت حافظ محمد حسن کو بلایا جو میرے بڑے اور علاتی بھائی تھے[1]، اور فرمایا کہ "میں فقیر ہوں کچھ نہیں رکھتا الاّتین سو جلد کتابیں، وہ میرے سامنے لے آؤ اور حصّہ، برادرانہ کرکے بانٹ لو۔" اُنھوں نے عرض کیا: "میں طالب علم ہوں اور مجھے اِس کام (پڑھنے) کی دُھن لگی ہوئی ہے اور یہ (دونوں) چھوٹے بھائی کتابوں سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ ورقوں کے کنارے نوچ لیں گے، ایک پتنگ بنا دے گا، دوسرا (ناؤ بنا کر) پانی میں بہا دے گا۔ اگر آپ میرے پاس امانت رکھ دیں تو اچھا ہے ورنہ آپ مختار ہیں[2]۔" والد کو اُن کے اَونڈھے مزاج کا اندازہ تھا، اُنھوں نے خبر لی اور کہنے لگے: کیا ہوا جو تو نے ترکِ لباس کر دیا ہے، تیری ٹیڑھ تو ابھی تک نکلی نہیں، تو چاہتا ہے کہ اِن بچّوں کو جُل دے اور میری آنکھیں بند ہونے کے بعد اِنھیں نقصان پہنچائے؟ یاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو دوست رکھتا ہے، غالب ہے کہ میر محمدؐ تقی تیرا دست نگر نہ ہو، اگر تو دوسری طرح پیش آئے گا تو تیرا بھانڈا پھوٹے گا اور تیری عزّت کا نقش اِس بچّے کے سامنے نہیں بیٹھے گا[3]۔ اگر تو اپنی مراد کو پہنچ گیا تو دیکھے گا کہ ایک جلد کتاب کے بدلے تیری کھال کھینچ لے گا۔ کم ظرف کسی اعتبار کے شایاں نہیں ذلیل ہے، اور بُخل و حسد، ذلّت و خواری کی دلیل ہے، ٹھیک ہے کتابیں تو ہی لے جا اور رکھ لے!" اس کے بعد میری طرف متوجّہ ہوئے اور فرمایا: "بیٹے میں بازار کے بنیوں کا تین سو رُپیوں کا مقروض ہوں، اُمید ہے جب تک ادا نہ کر دو گے

---

[1] حافظ محمد حسن کی والدہ خانِ آرزو (سراج الدین علی خاں) کی بہن تھیں، اُن کے انتقال کے بعد میر محمد علی (علی متقی) نے میرؔ کی والدہ سے نکاح کر لیا تھا۔ میرؔ نے صرف ایک جگہ (ذکر میر ص ۲۰) اپنی ماں کا تذکرہ کیا ہے "....، مادر و پدرم نگذاشت" اِس کے بعد کہیں اشارہ تک نہیں، میرا خیال ہے کہ علی متقی کی زندگی ہی میں میرؔ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ [2] میرؔ کے کسی بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محمد حسن نے جو کتابیں بطور امانت رکھ لی تھیں وہ پھر میرؔ کو ملیں یا نہیں۔ اور ترکے کی تقسیم میں بیٹی کا ذکر بھی نہیں ہے یا اُس زمانے میں بھی لڑکیاں محروم الارث رکھی جاتی تھیں؟ [3] میرا خیال ہے کہ یہ والد کی سجّادہ نشینی کا جھگڑا تھا، جس پر میرؔ، محمد حسن سے ناخوش ہیں۔

میرا جنازہ نہ اُٹھاؤ گے۔ کیوں کہ میں کھرا آدمی تھا میں نے تمام عمر کسی کو دھوکا نہیں دیا" میں نے عرض کیا کہ سوائے اُن کتابوں کے اور کوئی اثاثہ نظر نہیں آتا، وہ آپ نے بڑے بھائی کو سونپ دیں، میں قرض کیسے ادا کروں گا؟" والد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور فرمانے لگے "دل تنگ مت ہو، خدا کریم ہے، ہُنڈی راستے میں ہے پہنچا ہی چاہتی ہے، چاہتا تھا کہ روپیہ آنے تک زندہ رہوں، لیکن عمر کی فرصت کم ہے۔ ٹھیرنا ممکن نہیں۔" میرے حق میں دعا کی، اور خدا کے سپرد کیا، کچھ سانسیں اور آئیں گئیں آخر جاں بحق ہوئے۔

بھائی کی توتا چشمی

جب درویش نے آنکھیں موندیں تو عالم میری نظروں میں تاریک ہوگیا۔ بڑا حادثہ رونما ہوا، آسمان مجھ پر ٹوٹ پڑا دریا دریا روتا تھا، صبر و شکیب کھوتا تھا، پتھروں پر سر دے مارتا تھا، خاک پر لوٹتا تھا، بڑا ہنگامہ بپا ہوا گویا قیامت نمودار ہوگئی۔ میرے بڑے بھائی نے انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا تو توتا چشمی اختیار کرلی۔ جب دیکھا کہ باپ مفلس تھا اور بے کسی میں مرا ہے اور قرض خواہ میرے دامن گیر ہوں گے، تو پہلو تہی کی، کہنے لگے: "جن سے لاڈ پیار ہوتے تھے، وہ جانیں اُن کا کام جانے! میں باپ کی زندگی میں دخیلِ کار نہ ہوا اور وقفِ اولادی سے بھی درگذرا، اُن کے سجّادہ نشین سلامت رہیں جو سر پیٹ رہے ہیں اور منھ نوچ رہے ہیں، وہ جو مصلحتِ وقت ہوگی کریں گے!"

میں نے بیکسی کا تازہ صدمہ اُٹھایا تھا، جب اُن کی یہ چھچھوری باتیں سُنیں تو بہت غم و غصّہ کھایا، (مگر) اُن سے کوئی التجا نہ کی، ہمّت کو مضبوط رکھا اور خدا پر بھروسا کرکے بیٹھ گیا، بازار کے بنیے مزید دُو سو رُپے لائے اور بے حد خوشامد کی، مجھے درویش کی وصیّت کا پاس تھا، قبول نہ کیا سب کو باتوں میں گھماتا رہا۔ یعنی ملول نہ کیا۔ اِسی حال میں سیّد مکمّل خاں کا نوکر جو میرے عمّ بزرگوار کے مُرید تھے، پانچ سو رُپے

سکۂ حالی کی ہنڈی لے کر آیا اور میرا درد شریک ہوا۔ تین سو رُپے قرض خواہوں کو دے کر فارغ خطی حاصل کر لی اور سَو رُپے میں فقیر (کا جنازہ) کو اُٹھا کر لے گیا اور اُن کے پیر کے پہلو میں مدفون کر دیا۔

میری سرگذشت

(والد کی موت کے بعد میں نے) فلک کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے، نہیں نہیں، فلک یا زمانے کا کیا قصور؟ میرا ہی ستارا منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا، جو کچھ کیا میری قسمت نے کیا، اپنے ہی ہاتھ کے سوا کسی اور کا ہاتھ اپنے سر پر نہ پایا[1]، یعنی کسی کو سایہ گستر نہ پایا۔ میں نے اپنا اثاثہ غیرت (کی نگہداشت) کے لیے صرف کر دیا، اور ہرگز کسی کے دروازے پر (سائل بن کر) نہ گیا اور میرے ہونٹ حرفِ طلب سے آشنا نہ ہوئے، میری آنکھ کسی کی طرف نہیں اُٹھی نہ میں نے کسی سے مدد چاہی نہ کسی نے میری دستگیری کی۔ یعنی خدائے کریم نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ کیا، اور مجھے (سوتیلے) بھائی کا جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے، دست نگر نہ بنایا۔ میں نے درویش کی نیاز دلا کر تبرک تقسیم کیا اور تمام کام خدا کے آسرے پر چھوڑ دیے، چھوٹے بھائی کو اپنا قائم مقام بنا کر روزگار کی تلاش میں اطرافِ شہر میں گھومتا پھرا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، یعنی وطن میں چارۂ کار نہ پایا، ناچار غربت اختیار کی۔ راستے کی صعوبتیں اپنے اوپر گوارا کیں اور سفر کے شدائد اختیار کیے شاہ جہاں آباد دہلی میں پہنچا، یہاں بھی بہت گھوما (مگر کسی کو) شفیق نہ پایا!

---

[1] میرؔ: اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے، کوئی مہرباں نہیں

دہلی میں
۱۱۵۰ھ

خواجہ محمدؒ باسط نے جو امیر الاُمرا صمصام الدولہ[۱] کے بھتیجے تھے، میرے حال پر عنایت کی اور مجھے نواب کے سامنے لے گئے۔ (نواب نے) جب مجھے دیکھا تو پوچھا: "یہ کس کا لڑکا ہے؟" (خواجہ محمد باسط نے) کہا: "میر محمدؐ علی کا!" فرمانے لگے کہ "اِس کے (یہاں) آنے سے ظاہر ہے کہ وہ دنیا سے گذر چکے ہیں!" پھر بہت

---

[۱] خواجہ محمدؐ عاصم کے بزرگ بدخشاں سے ہجرت کرکے اکبر آباد میں آ بسے تھے۔ جن میں بعض نے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کیا اور کچھ فقر و درویشی کی طرف مائل ہوئے۔ خواجہ محمد عاصم کے بڑے بھائی خواجہ محمد جعفر باخدا صوفی تھے، خواجہ محمدؐ باسط جن کا انتقال ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں لکھنؤ میں ہوا، انھیں خواجہ جعفر کے فرزند اور مشائخ نقشبندیہ میں نام آور بزرگ تھے۔ (سفینۂ ہندی/۳۷)

خواجہ محمدؐ عاصم پہلے پہل قلیل منصب پر دربارِ شاہی سے منسلک ہوئے تھے، لیکن فرخ سیر کے زمانے میں ترقی کرکے دیوانِ خاص کے داروغہ ہوئے اور "اشرف خاں" خطاب پایا، پھر میر آتش بنائے گئے تو نقارہ و نشان کے ساتھ ہفت ہزاری منصب، ہفت ہزار سوار اور "صمصام الدولہ امیر الامراء خان دوراں بہادر منصور جنگ" کے خطاب سے سرفراز ہوئے، امیر الامرا حسین علی خاں دکن چلا گیا تو یہ میر بخشی بنائے گئے، پھر بخشی دوم ہوئے اور گجرات کی صوبہ داری اُن کے سپرد کی گئی، صوبہ مذکور کا انتظام ان کی نیابت میں حیدر قلی خاں کرتے تھے۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد انھیں امیر الامراء کا خطاب اور میر بخشی گری کا عہدہ ملا۔ خواجہ محمدؐ عاصم علم دوست، صوفی منش، متواضع اور سنجیدہ رئیس تھے، اکثر اہلِ علم اُن کے دربار سے وابستہ تھے۔ "اکثر اوقات ہنگام شب با علماء و شعرا صحبت می داشت و بہ تربیت اہل کمال بسیاری کوشید و احیاناً شعر ہم می گفت۔" (سفینۂ ہندی/۶۵) یہ شعر اُن کی طرف منسوب ہے۔

سحر خورشید لرزاں بر سرِ کوئے تو می آید　　　دل آئینہ دا نازم کہ بر رُوئے تو می آید

جو بروایت بھگوان داس ہندی فرخ سیر کے سامنے فی البدیہہ کہا تھا۔ اُن کے زمانے میں قلعہ دہلی ناپاک سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن وہ اِن ریشہ دوانیوں میں شریک نہیں ہوئے ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے چڑھائی کی تو محمد شاہ جنگ کرنے کے لیے کرنال تک گیا، تعاقب میں امیر الامرا افواج لے کر بطورِ کمک گئے، اور ۱۳ر فروری ۱۷۳۹ء-۱۵ر ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ) کے ہنگامے میں بُری طرح زخمی ہوئے۔ انھیں زخموں نے ۱۷ر فروری (۱۹ر ذی قعدہ) کو ۶۸ سال کی عمر میں اُن کی جان لی۔ نادر شاہی حملے میں اُن کے بھائی مظفر خاں (جو اجمیر کے صوبہ دار رہ چکے تھے) اور تین بیٹے بھی کام آئے، ایک بیٹے عاشوری خاں نادری فوج کے ہاتھوں قید کر لیے گئے۔ رہائی کے بعد انھیں محمد شاہ نے باپ کا خطاب دیا اور ۱۱۶۱ھ میں میر آتش کا عہدہ دیا۔ عاشوری خاں عالم گیر ثانی کے عہد میں امیر الامرا ہوئے اور کچھ دنوں بعد انتقال کیا۔ (مآثر الامراء ۱/ص ۸۱۹ تا ۸۲۳ تاریخ محمدی قلمی نسخہ رامپور۔ و معاصر حصہ ۸/۱۱۷) سفینۂ ہندی/۶۵ گل رعنا/ب ۳۷۱۔

اظہارِ افسوس کے بعد کہنے لگے کہ "اُن کے (علی متقی) مجھ پر بہت حقوق ہیں، ایک روپیہ روز میری سرکار سے اِس لڑکے کو دیا جائے۔" میں نے (خواجہ محمّد باسط سے) التماس کیا کہ نواب صاحب اتنی مہربانی فرمار ہے ہیں تو مجھے دستخط فرما کر بھی دے دیں تاکہ مُتصدیوں کو چُون و چرا کی گنجایش نہ رہے، درخواست جو میں نے لکھ رکھی تھی جیب سے نکالی، اچانک خواجۂ مذکور کی زبان سے نکلا کہ "یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے" یہ سُن کر میں نے قہقہہ مارا، نواب نے میرے منھ کو دیکھا اور ہنسی کا سبب پوچھا، میں نے عرض کیا کہ "یہ فقرہ میری سمجھ میں نہیں آیا، اگر یہ فرماتے کہ قلمدان بَردار حاضر نہیں، تو ایک بات تھی، یا یہ کہنا بھی ٹھیک تھا کہ یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت نہیں ــــ "قلمدان کا وقت نہیں" کہنا تو نئی ترکیب ہے، قلمدان ایک لکڑی سے زیادہ نہیں، وہ وقت اور غیر وقت نہیں جانتا، جس شخص کو بھی حکم دیا جائے اُٹھا لائے گا۔" نواب ہنسنے لگے اور بولے "معقول بات کہتا ہے۔" غرض میری درخواست کو ردّ نہ کیا، قلمدان منگوایا، اور اُس عرضی کو دستخط سے مشرّف کیا۔ وہ بادشاہ کے دربار کا دن تھا، (نواب) کمر کس کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے بڑی عنایت سے رخصت کیا۔

اُسی زمانے تک کہ، نادر شاہ[1] نے محمّد شاہ پر، جو اب فردوس آرام گاہ کے لقب سے مشہور ہیں، چڑھائی کی۔ اور نواب مذکور پیش جنگی کے سبب

---

[1] نادر شاہ دُرّانی، ۹ر مارچ ۱۷۳۹ء کو فتح و ظفر مندی کا نقارہ بجاتا ہوا، دہلی میں داخل ہوا، ۱۱ر۱۲ر۱۳ر مارچ (۱۷۳۹ء) کو دہلی میں قتل عام کیا۔ جس میں تیس ہزار سے زائد انسان قتل ہوئے، ۵ر مئی کو ۵۸ دن قیام کرنے کے بعد اس حالت میں رخصت ہوا کہ آٹھ مغل تاجداروں، کے جمع کیے ہوئے خزانے اُس کی مٹھی میں تھے اندازے کے مطابق ۷۰۔۸۰ کروڑ کے درمیان کی مالیت کا سونا، چاندی، ہیرے اور زرِ نقد وہ اپنے ساتھ لے گیا جو دس ہزار اونٹوں، دس ہزار گھوڑوں اور تین ہزار جنگی ہاتھیوں پر لادا گیا تھا۔

For details see;
Frazer: Nadir Shah, Sarkar: Fall of the Mughal Empire.

مارے[۱] گئے، وہ روزینہ مجھے ملتا رہا، (اسی سے) نان و نمک کھاکر گذارا کرتا تھا۔

پھر دہلی میں

اِس انقلاب[۲] (حملہ نادری) کے بعد پھر سنگ دل زمانے نے مجھے ستایا۔ اُن لوگوں نے جو درویش کی زندگی میں میری خاکِ کفِ پا کو سرمہ بناتے تھے اب مجھے نظروں سے گرادیا ناچار دوبارہ دہلی[۳] پہنچا اور (اپنے سوتیلے)

۱؎ مندرجہ ذیل اشخاص صمصام الدولہ کے ساتھ نادر شاہ کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے (۱۵ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ)

(۱) علی اسد خاں عرف میر کلّو "از کبارِ اُمرائے ہند"

(۲) علی حامد خاں بن شیخ جان محمد رمّال۔ از کبار امرائے ہند، عمر چہل و چند،

(۳) عاقل بیگ خاں کمل پوش بن ولی بیگ کمل پوش از اُمرائے ہند۔ عمر در عشرۂ سابعہ

(۴) احترام خاں بن صمصام الدّولہ۔ عمر بیست و چند

(۵) شہداد خاں خویشگی "از کبارِ اُمرائے ہند" عمر عشرۂ سابعہ

(۶) امیر بیگ مخاطب بیادگار خاں بن ضیا بیگ بلوچ۔ 'از امرائے ہند، عمر قریب ۶۰

(۷) اصلح علی خاں خواجہ سرائے ثابت خانی از اُمرائے ہند

(۸) رتن رائے بن رائے خوش حال چند کایتھ ماتھر" اَحد الاعیان"

(۹) عاقل بیگ بخشی مظفّر خاں (تاریخ محمّدی نسخہ رامپور بحوالہ معاصر ۸/۱۱۵)

۲؎ مندرجہ ذیل اشخاص یکم ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ کو نادر شاہ کے قتلِ عام میں کام آئے:

(۱) خوش حال رائے اکبر آبادی، طبیب حاذق عمر ۴۰

(۲) ثابت قدم خاں خویشگی "اَحد الاعیان" در عشرۂ سادسہ

(۳) عبدالرحیم خاں مخاطب بہ رحیم داد خاں "احد الاعیان" عمر پنجاہ و چند

(۴) قاسم حسین خاں بن قاسم حسین خاں بن میر کلاں "احد الاعیان"

(۵) جمال اللہ خاں عمر تخمیناً ۶۰ سال

(۶) میر مبارک خاں بن میر امام امام الدین خاں خوستی "احد الاعیان" عمر تقریباً ۵۰

(۷) سعید نبی خاں پوربی

(۸) بو علی خاں بن بو علی خاں شیرازی

(۹) شیخ محمدؐ عابد علوی لاہوری خوشنویس نستعلیق (تاریخ محمّدی بحوالہ معاصر ۸)

۳؎ قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں: میرؔ نے وفاتِ محمد علی کے بعد دہلی آنے اور یہاں روزینہ مقرّر ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ دہلی سے آگرہ کب واپس گئے وہاں سے دوسری بار دہلی آنے کا حال البتہ تحریر کیا ہے، میرؔ نے حملۂ نادری اور قتلِ عام کی کیفیت مطلقاً نہیں بیان کی، (باقی اگلے صفحہ پر)

بڑے بھائی کے ماموں، سراج الدین علی خاں[۱۵] آرزو کے احسانات کا بھاری بوجھ اٹھایا یعنی کچھ مدت اُن کے ساتھ رہا اور یارانِ شہر سے چند کتابیں پڑھیں۔ جب اس قابل ہوگیا کہ کسی کا مخاطبِ صحیح بن سکوں تو بھائی کا خط (اپنے ماموں کے نام) پہنچا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے اِس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیئے بلکہ دوستی کے پردے میں اِس کا کام تمام کر دینا چاہیئے۔" وہ عزیز (آرزو) پکّے دنیادار تھے، اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا بُرا چاہنے لگے، اگر میں سامنے پڑ جاتا تو پھٹکارنے لگتے، اور بچ بچ کر رہتا تو سیدھیاں سُناتے، ہر وقت اُن کی نگاہیں میرے پیچھے پڑی رہتیں اکثر دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے، کیا بیان کروں کہ میں نے اُن سے کیا پایا، کس طرح کہوں مجھ پر کیا حالت گذری، ہر چند اپنا منھ بند رکھتا، اور لاکھ احتیاج میں بھی اُن سے کبھی ایک رُپیہ تک نہ مانگتا، مگر وہ بُرا بھلا کہنے سے باز نہ آتے تھے۔ اُن کی دشمنی کا ماجرا اگر تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیٰحدہ دفتر درکار ہے۔ میرا دُکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہوگیا۔

جنون اور میں پاگل ہوگیا، میرا کُڑھا ہوا دل اور بھی کُڑھنے لگا۔ وحشت پیدا ہوگئی جس حجرے میں رہتا تھا اُس کا دروازہ بند کر لیتا اور اِس ہجومِ غم میں تنہا بیٹھ جاتا، جب چاند نکلتا تو (گویا) قیامت سر پر آتی تھی، اگرچہ اُس وقت سے

اگر ان اُمور کے شاہدِ عینی ہوتے تو معاملہ برعکس ہوتا۔ صمصام الدولہ کا وطن آگرہ تھا اور اُن کے لیے اس میں ذرا بھی دشواری نہ تھی کہ روزینہ آگرے ہی میں ملنے کا انتظام کر دیں، میرا خیال ہے کہ روزینہ مقرر ہونے کے بعد آگرے واپس گئے اور پھر نادرگردی ختم ہوگئی تو دہلی آئے۔" (معاصر حصّہ ۹)

[۱۵] میر اور خان آرزو کے تعلقات کی بحث مقدمہ کتاب میں کی گئی ہے۔ آرزو کے حالات و تصانیف کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ معاصر حصّہ ۹

میر نے "خالوے برادرِ کلاں" لکھا ہے (ذکرِ میر/۶۳) برادرِ کلاں سے مراد محمد حسن ہیں جو میر کے سوتیلے بھائی تھے، خالو ماموں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اُردو کے معروف معنوں (شوہرِ خالہ) میں نہیں۔

جب منھ دُھلاتے وقت دایہ "چاند چاند" کہتی اور میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا، چاند پر نظر کرتا تھا، لیکن نہ اِس حد تک کہ دیوانگی کی نوبت آجائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ (لوگ مجھ سے) ڈر کر میری کوٹھری کا دروازہ بند کر دیں اور میری صحبت سے دور بھاگنے لگیں!

(نقلِ تحفہ) چاندنی رات میں ایک پیکرِ خوش صورت، کمال خوبی کے ساتھ کُرۂ قمر سے میری طرف بڑھتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا، جدھر بھی میری آنکھ اُٹھتی اسی رشکِ پری پر پڑتی، جس طرف بھی دیکھتا تھا، اُسی غیرتِ حور کا تماشا کرتا تھا، میرے گھر کے در و بام اور صحن (گویا) ورقِ تصویر ہو گئے تھے۔ یعنی شش جہت میں وہی حیرت افزا (چہرہ) نظر آتا، کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے ہوتا، کبھی منزلِ دل اس کی سیرگاہ ہوتی اگر گلِ ماہتاب پر نظر پڑ جاتی تو گویا جانِ بے تاب میں آگ سی لگ جاتی۔ ہر رات اُس سے صحبت رہتی اور ہر صُبح اُس بن وحشت رہتی، جب سفیدۂ سحر نمودار ہوتا تو وہ جلے دل سے ٹھنڈی آہ بھرتی، یعنی ایک آہ بھر کر چاند کی طرف واپس ہو جاتی، میں تمام دن جنون کرتا اور اُس کی یاد میں دل کو خون کرتا، دیوانہ و مست کے مانند کف بر لب ہاتھوں میں پتھر لیے پھرتا؛ میں اُفتاں و خیزاں اور لوگ مجھ سے گُریزاں۔

چار مہینے تک وہ گلِ شب افروز نت نئے گُل کھلاتا رہا اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا۔ ناگاہ موسمِ بہار آیا، جنون کے داغ (اور بھی) ہرے ہو گئے یعنی میں آسیبی سا ہو گیا اور مطلق کسی کام کا نہ رہا۔ بس وہ خیالی صورت نظر میں اور اُس کی مُشکیں زلفوں کا دھیان سر میں؛ لائقِ کنارہ گیری ہو گیا، یعنی زندانی و زنجیری ہو گیا۔

فخر الدّین خاں کی بی بی نے جو درویش (والد) کی مُرید تھیں اور قریبی رشتہ بھی

رکھتی تھیں (میرے علاج میں) بہت رُپیہ خرچ کیا۔ سیانوں نے جھاڑ پھونک کی، طبیبوں نے فصد کھولی۔ طبیبوں کی تدبیر سے فائدہ ہوا، خریف کا موسم آیا، اور بہار رخصت ہوئی تو جنون بھی گھٹ گیا۔ وہ نقش جو وہم نے بٹھایا تھا صفحۂ دل سے مٹ گیا، جُنون سے جو سبق پڑھا تھا فراموش ہوگیا۔ اب زبان سکوت سے آشنا ہوگئی یعنی پریشاں گوئی موقوف ہوگئی۔ دماغ کو مرطوب کیا گیا تو نیند بھی آگئی، گئی ہوئی طاقت پھر لوٹ آئی یعنی میں (اصلی) حالت میں آگیا اور بدخوابی جاتی رہی اور وہ چہرۂ مہتابی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہوگیا۔ کچھ مدّت بعد پوری طرح صحت یاب ہوگیا اور "ترسُّل" پڑھنا شروع کر دیا۔

میر جعفر

(نقل) میں ایک دن سرِ بازار، ایک کتاب کا جُزو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا، میر جعفر نامی ایک جوان اُدھر سے گذرے اُن کی نظر مجھ پر پڑی تو تشریف لائے اور ذرا توقف کر کے کہنے لگے: "اے عزیز معلوم ہوتا ہے تمھیں پڑھنے کا شوق ہے، میں بھی کتاب کا کیڑا ہوں، لیکن کوئی مخاطَب نہیں ملتا، اگر تمھیں شوق ہو تو کبھی کبھی آجایا کروں"۔ میں نے کہا: "میں کسی خدمت کی استطاعت تو نہیں رکھتا اگر محض خدا واسطے آپ یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہے"۔ کہنے لگے "اتنا ہے کہ جب تک تھوڑا سا ناشتا نہ مِل جائے میں گھر سے قدم نہیں نکالتا"۔ میں نے کہا: "(یہ مشکل) خدائے کریم آسان کر دے گا، اگرچہ میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے"۔ اُنھوں نے اُس نسخۂ پریشاں کے پاورق کو اگلے سرِ صفحوں کے مطابق کر کے مجھے دیا اور چلے گئے۔ اُس دن سے اکثر اُس آدم صورت، فرشتہ سیرت انسان سے ملاقات ہوتی وہ نہایت مہربانی سے مجھے پڑھاتے، یعنی اپنا دماغ کھپاتے اور مجھے کچھ سکھاتے، میں بھی تا بہ مقدور اُن کی خدمت کرتا یعنی جو کچھ میسّر تھا اُن کے لیے خرچ کرتا، ناگاہ اُن کے وطن یعنی عظیم آباد سے ایک خط آیا اور وہ بادل ناخواستہ

اُدھر چلے گئے۔

سیّد سعادت علی
قبل ۱۱۵۷ھ

پھر کچھ مدت بعد میں سعادت علی نامی ایک سید سے ملا جو امروہہ کے تھے اُس عزیز نے مجھے ریختہ موزوں کرنے کی تکلیف کی، جو شعر ہے، شعرِ فارسی کی طرح "اُردوے معلّاے بادشاہ ہندوستان کی زبان میں، اور اُس وقت رواج پا رہا تھا، میں نے سخت محنت کی اور اپنی مشق اِس درجے تک پہنچا دی کہ موزونانِ شہر کے لیے مستند ہو گیا۔ میرے شعر تمام شہر میں مشہور ہو گئے اور خُرد و بزرگ کے کانوں تک پہنچ گئے!

رعایت خاں کی ملازمت
۱۱۶۰ھ

ایک دن ماموں نے مجھے کھانے پر بُلایا، اُن سے میں نے ایک تلخ بات سُنی اور بے مزہ ہو گیا کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اُٹھ گیا، چوں کہ اُن سے مجھے کوئی منفعت تو پہنچ نہیں رہی تھی شام کو اُن کے گھر سے نکلا اور سیدھا جامع مسجد کا راستہ لیا، اتّفاق سے راستہ بھول گیا اور حوض قاضی پر آنکلا، جو وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے، یہاں میں نے پانی پیا۔ اِس جگہ علیم اللہ نامی ایک شخص میرے سامنے آیا اور بولا: "تم میر محمد تقی میرؔ ہو نا؟" میں نے کہا: "تم نے کیسے پہچانا؟" بولا: "تمھارا سودائیانہ انداز تو مشہور ہے!" رعایت خاںؔ[۱] جو عظیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کا بھانجا ہے، جب سے تمھاری طبعِ نکتہ انگیز کی کاوشیں اُس تک پہنچی ہیں تم سے ملاقات کا بہت مشتاق ہے

---

[۱] "نواب رعایت خاں ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں صوبیدار مالوہ کا بیٹا تھا، جو بعد ازاں وہاں کا صوبیدار مقرر ہوا۔ یہ عظیم اللہ خاں، رعایت خاں برادر محمد امین خاں کا بیٹا تھا۔ رعایت خاں کی ماں نور النسا بیگم ہمشیرہ اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کی تھی۔ رعایت خاں نے قمر الدین خاں کی بیٹی سے شادی کی تھی۔"

(تاریخ فرخ آباد، از اروین ص ۹۸، اردو ترجمہ)

اگر تم میرے ساتھ چل کر اُس سے ملو، تو میرے لیے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے گا!" میں جا کر ملا۔ وہ آدمیت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا۔ اُس (کی ملازمت) سے میں نے تمتّع کیا اور تنگ دستی کی قید سے چھوٹ گیا۔

دُرّانی کا حملہ
۱۱۶۱ھ

جس زمانے میں (احمد شاہ) دُرّانی لاہور[۵۱] آیا اور زکریا خاں کا لڑکا شاہ نواز خاں جو وہاں کا صوبیدار تھا بھاگ گیا، تو وزیر (قمر الدین خاں) اور صفدر جنگ اور راجا جے سنگھ، جو ایک بڑا زمیندار تھا، اس کا بیٹا

---

[۵۱] احمد شاہ دُرّانی ہندوستان میں پہلی بار نادر شاہ کے ساتھ آیا تھا (۱۷۳۹ء) اور اُس نے مغل حکومت کی زوال آمادگی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اب اُسے لاہور سے شاہ نواز خاں نے دعوت نامہ بھیجا کہ اگر آپ ہندوستان پر حملہ کریں تو میں اس شرط پر آپ کی امداد کروں گا کہ بعد حصولِ فتح مجھے عہدۂ وزارت دیا جائے۔ احمد شاہ دُرّانی یہ دعوت نامہ پاتے ہی وسطِ دسمبر (۱۷۴۷ء) میں پشاور سے چل پڑا، اور ۸ر جنوری (۱۷۴۸ء) کو شاہدرہ (لاہور) پہنچا۔ اسی دوران میں نواب قمر الدین خاں نے جو شاہ نواز خاں کے ماموں ہوتے تھے، اُس کے خطرناک ارادے سے آگاہ ہو کر امداد دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دُرّانی نے شاہ نواز خاں کو دوبارہ ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود رہی، مگر اس نے پیش قدمی جاری رکھی اور ۱۰ر جنوری کو راوی سے اپنی فوجیں اُتار کر شالامار باغ میں خیمہ زن ہوا۔ ۱۱ر جنوری کو دونوں فوجوں میں جھڑپ ہوئی اور شاہ نواز خاں بھاگ گیا۔ جب قلعہ دہلی میں لاہور فتح ہو جانے کی خبر پہنچی، تو محمد شاہ نے جو اُن دنوں بیمار تھا، شہزادہ احمد شاہ اور نواب قمر الدین خاں اور راجا جے سنگھ سوائی والیِ جے پور کے لڑکے ایشر سنگھ وغیرہ کی نگرانی میں دو لاکھ فوج بھیجی جو ۲۵ر فروری (۱۷۴۸ء) کو سرہند پہنچی، ادھر سے یہ لوگ ذرا آگے بڑھے تھے کہ لدھیانہ کے راستے سے دُرّانی ۲ر مارچ کو سرہند پر قابض ہو گیا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ ۲۲ر مارچ (مطابق ۲۲ر ربیع الاوّل ۱۱۶۱ھ جمعہ) کو وزیر قمر الدین خاں اپنے خیمے میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ناگاہ ایک گولا آ کر لگا جس سے وہ فوراً مر گئے۔

مُعین الملک نے اِس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا اور خود نواب قمر الدین کے ہاتھی پر سوار ہو کر مقابلے کے لیے نکلا۔ اتّفاق سے دُرّانی کے توپ خانے کی بارود میں آگ لگ گئی اور اُس کی فوج کے ہاتھی بھاگنے لگے اور ایک ہزار فوج جل کر بھسم ہو گئی مجبوراً دُرّانی کو میدان چھوڑنا پڑا، اور شاہی فوج نے میدان مار لیا۔ اِس کی تاریخ "فتحِ خدا ساز" (۱۱۶۱ھ) نکلتی ہے۔

۹ر اپریل (۱۷۴۸ء) کو دہلی سے محمد شاہ کا فرمان پہنچا جس میں فوج کو واپس آنے کی ہدایت اور مُعین الملک کے نام لاہور کی گورنری کا حکم تھا۔ معین الملک اپنی وفات ۳ر نومبر ۱۷۵۳ء

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

ایشر سنگھ شہزادہ احمد شاہ کو ساتھ لے کر اُس سے جنگ کرنے نکلے۔ سرہند کے اُس طرف وزیر (نواب قمر الدین خاں) کے گولا لگا، اور زمیندار مذکور (ایشر سنگھ) کے پانو اُکھڑ گئے۔ معین الملک جو وزیر شہید کا لڑکا تھا، اور صفدر جنگ شہزادہ احمد شاہ کو سوار کر کے افغانوں سے بھڑ گئے، میں اس سفر میں خان مذکور (رعایت خاں) کے ساتھ تھا اور خدمات انجام دے رہا تھا۔ جب افغانوں کی فوج بُری طرح ہار کر بھاگی تو معین الملک لاہور کا گورنر ہوگیا اور خان مذکور (رعایت خاں) عضوِ معطّل کی طرح اُس کی رفاقت چھوڑ کر صفدر جنگ کے ساتھ شہر (دلّی) کو رواں ہوگیا۔

محمد شاہ کا انتقال
ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ

پانی پت کے قریب جو دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر ایک مشہور شہر ہے، یہ خبر پہنچی کہ محمد شاہ[۱۵] کا انتقال ہوگیا۔ (اِس خبر) سے عالم میں تہلکہ مچ گیا۔ صفدر جنگ نے بڑے تفاخر

تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد اُس کی بیوی مغلانی بیگم نے صوبے کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مگر عماد الملک نے اُسے معزول کر کے آدینہ بیگ خاں کو مقرر کر دیا۔ اور مغلانی بیگم نے احمد شاہ دُرّانی کو مال و متاع کا لالچ دے کر پھر ہندوستان آنے کے لیے لکھا۔

۱۵ محمّد شاہ (روشن اختر) ۷ر اگست ۱۷۰۲ء کو پیدا ہوا، اور ۱۹ ستمبر ۱۷۱۹ء (مطابق ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ) میں تخت نشین ہوا، ۲۶ اپریل ۱۷۴۸ء مطابق (۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ) کو اس نے انتقال کیا۔ اور اُس کی جگہ احمد شاہ اُس کا لڑکا بائیس ۲۲ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، وہ ادھم بائی کے بطن سے تھا جو "مان خاں قوّال کی بہن تھی۔ احمد شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد اُس کو نواب بائی خطاب دیا، پھر تھوڑے دنوں کے بعد نواب قُدسیہ صاحب الزماں خطاب ہوا" (تاریخ اودھ: ۱/۱۳۶) ادھم بائی جاوید خاں پر بہت مہربان تھی اِسی لیے جاوید خاں کو عروج حاصل ہوا۔ اور وہ ہفت ہزاری منصب تک پہنچا۔ مغل خاندان کی تاریخ میں یہ پہلا خواجہ سرا تھا جسے اتنا بڑا اعزاز نصیب ہوا لیکن اُس کے برسرِ اقتدار آنے سے طبقۂ شرفا میں بہت سخت ہیجان اور ناراضگی پیدا ہوگئی تھی۔ قلعے کے ملازمین جاوید خاں اور نواب قدسیہ کی اہانت کرتے تھے شرفا نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا۔ آخر کار صفدر جنگ نے ۲۷ر اگست ۱۷۵۲ء کو اُسے مروا ڈالا۔ احمد شاہ کو بھی (باقی بر صفحہ آیندہ)

سے چھتر اور تخت شاہی احمد شاہ کے حضور میں پیش کیا اور اُسے بادشاہ بنادیا۔ وہ پورے کرّ و فر سے شہر میں داخل ہوا، اِس موقع پر جاوید خاں کو جو مرحوم بادشاہ (محمّد شاہ) کا خواجہ سرا تھا نواب بہادر کا خطاب ملا۔ اور اختیاراتِ سلطنت اُس کے سپرد ہوئے ؎

ہر روز اختیارِ جہان پیشِ دیگریست
دولت مگر گداست کہ ہر روز بر دریست[۱]

صفدر جنگ کی وزارت
۱۱۶۱ھ

جب نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں انتقال کیا تو وزارت کا منصب صفدر جنگ کو ملا اور سادات خاں ذوالفقار جنگ بخشی گری سے سرفراز ہوا۔ نئے وزیر کے وہ ٹھاٹھ باٹ تھے کہ ایسی شان و شوکت بادشاہ کو بھی نصیب نہ تھی۔ نئے بخشی (سادات خاں) نے راجا بخت سنگھ کو، جو بڑا تجربہ کار اور نام برآوردہ زمیندار تھا اور اُس کا بڑا بھائی ابھے سنگھ ریاست جودھ پور پر متمکّن تھا، صوبۂ اجمیر کی نیابت دے کر (بھائی کا) مقابلہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ راجا مذکور خان (رعایت خاں) کو فوج کا سردار بنا کر اپنے ساتھ لے گیا سانبھر کے قریب جو اجمیر سے بیس کوس اِدھر ایک مشہور قصبہ ہے، دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور توپ خانے کی جنگ چھڑ گئی۔ فریقِ ثانی کے لوگوں نے جی چرایا اور نمک حراموں کی طرح ایک دن بھی جی لگا کر نہ لڑے جان دینے کا تو ذکر ہی کیا! ناچار اُدھر کے رئیس (ابھے سنگھ) نے ملھار کو جو مرہٹوں کا نامی سردار تھا درمیان میں ڈال کر صلح کر لی اور واپس ہوگیا۔ یہ صلح

عماد الملک نے اندھا کر کے تخت سے اُتار دیا اور عالم گیر ثانی کو اُس کی جگہ تخت نشین کر دیا۔

[۱] (ترجمہ) دنیا کے اختیار (حکومت و اقتدار) ہر روز دوسروں کو منتقل ہوتے رہتے ہیں، شاید دولت بھی فقیر ہے جو آئے دن کسی نہ کسی کے دروازے پر کھڑی رہتی ہے۔

کے بعد خواجۂ بزرگ[1] کی درگاہِ مبارک کی زیارت سے سعادت اندوز ہونے گیا، اور (اجمیر) کے اُس نواح کی سیر کر کے واپس آگیا۔

یہاں ایک بات پر پخ ہو گئی، راجا بخت سنگھ نے ناک بھوں چڑھائی اور خان (رعایت خاں) سے اُس کی بگڑ گئی[2] ستار قلی خاں کشمیری نے جو ایک ہی بہروپیا تھا، اُسے خوب سُنائیں (اور دونوں میں) ٹھن گئی۔ خان نے اپنا موقع نہ دیکھ کر، اِس بدکلامی کی معذرت کے لیے مجھے بھیجا۔ میں نے جا کر اُس کی جانب سے حلف اُٹھایا کہ آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مگر اُس کا دل صاف نہ ہوا۔ اور اس نے مہلت نہ دی۔ رسالے کے لوگوں کی تنخواہ کا حساب بے باق کر کے بھیج دیا اور وہاں سے خیر باد کہا۔ بارے بخیر گذر گئی، خان بھی اس سے دست بردار ہو کر شہر (دلّی) آگیا۔ اور کچھ دن گھر بیٹھا رہا۔

میری بے دماغی

(نقل) ایک چاندنی رات میں خان کے سامنے ڈوم کا لڑکا مہتابی پر بیٹھا گا رہا تھا۔ (خان نے) جب مجھے دیکھا تو کہنے لگا: "میر صاحب اِسے اپنے دو تین شعر ریختہ کے رٹا دیجیے پھر

---

[1] حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری" مراد ہیں، جو سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کبار میں شمار ہوتے ہیں اُن کی ولادت ۵۳۵ھ (۱۱۴۲ء) میں ہوئی۔ وہ خراسان اور بغداد ہوتے ہوئے ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں دلی آئے پھر اجمیر تشریف لے گئے وہیں مدت العمر قیام رہا۔ ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) میں انتقال فرمایا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی" اُن کے مشہور خلیفہ ہیں۔ خواجہ بزرگ کی طرف کچھ تصانیف بھی منسوب ہیں، لیکن وہ متحقق نہیں (رک: نثار احمد فاروقی: نقدِ ملفوظات) ایک دیوان بھی متداول ہے لیکن وہ دراصل معین الدین مسکین ساکن ہرات و مصنف معارج النبوۃ کا زائیدہ فکر ہے (رک مقالات شیرانی) "درگاہ اجمیر کی زیارت" بقول قاضی عبدالودود میر کے "وسعت مشرب کی دلیل نہیں ہو سکتی بخوبی ممکن ہے کہ میر خواجۂ اجمیر کو اپنا ہم مشرب سمجھتے ہوں" (معاصر ۱۴/۹۹)

[2] مولوی عبدالحق مرتب ذکرِ میر نے اِس موقع پر عنوان دیا ہے: "سادات خاں ذوالفقار جنگ اور بخت سنگھ کی نزاع" لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں یہ غلط ٹھیرتا ہے۔ "خان" سے میر کی مراد رعایت خاں ہے۔ سادات خاں نہیں!

یہ لڑکا انھیں بستہ نگار (راگ) کی دُھن میں بٹھا کر گا لے گا۔" میں نے کہا: "میں اس گون کا آدمی نہیں ہوں"، کہنے لگا: "تمھیں میرے سر کی قسم"۔ چوں کہ نوکری کا معاملہ تھا، طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اُسے یاد کرا دیے۔ مگر یہ بات میری طبعِ نازک پر بہت گراں گذری۔ آخر دو تین دن بعد خانہ نشین ہو گیا اُس نے ہر چند لطف کیا، نہیں گیا اور وہ نوکری چھوڑ دی۔ مگر اُس شخص کی ذاتی مروّت نے فقیر کو ناکام دیکھنا گوارا نہ کیا۔ میرے بھائی محمد رضی کو، میری رفاقت کے پیشِ نظر، اپنے پاس سے گھوڑا دے کر نوکر رکھ لیا۔ جب ایک مدّت کے بعد میں جا کر ملا تو اُس نے بہت عذر خواہی کی۔ میں نے کہا: "گذشتہ را صلوٰۃ!"

نوّاب بہادر

جب اِس پر بھی کچھ مدّت گذر گئی تو میں نے نوّاب بہادر کے ہاں ملازمت تلاش کی اور نوکر ہو گیا، اسد یار خاں[1] نے جو اُس کی فوج کا بخشی تھا، میرا احوال سنا کر گھوڑے اور نوکری کی تکلیف معاف کرا دی۔ وہ (نوّاب بہادر) میرا حد سے زیادہ لحاظ کرتا تھا اور میری امداد و اعانت کرتا رہتا تھا۔ خدا اُسے خیر دے۔

فرخ آباد کا سفر
شوال ۱۱۶۳ھ

جن دنوں محمد خاں بنگش کا لڑکا قائم خاں روہیلوں کی جنگ میں مارا گیا اور صفدر جنگ اُس کے گھر کی ضبطی کے لیے روانہ ہوا[2]۔ میں بھی ایک تقریب سے اِسحاق خاں نجم الدّولہ کے ساتھ

---

[1] اسد یار خاں (احمد شاہی) لطف علی خاں کے بیٹے تھے اور اُن کے باپ کے متعلق سیر الانصار مصنفہ باقر علی خاں پانی پتی میں درج ہے کہ: "از سرکارِ احمد شاہ سبب وساطتِ نواب بہادر خدمت خانِ سامانی بہ لطف علی خانِ بخشی گری بہ اسد یار خاں مُفوّض شد"۔ اس کتاب میں ان دونوں کے اور بھی حالات ہیں۔ (معاصر ۱/ ۱۸۷) [2] نواب قائم خاں بنگش (والیِ فرخ آباد) سے صفدر جنگ کی پُرانی عداوت تھی اور وہ بنگش خاندان کو ملیامیٹ کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا آخر اُس نے یہ ترکیب کی کہ روہیل کھنڈ کی گورنری کا فرمان بادشاہ سے لکھوا کر (باقی بر صفحہ آیندہ)

اُس طرف کی سیر کرنے چلا گیا۔ چوں کہ قائم خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے
گھمسان کی جنگ ہوئی۔ وزیر کی فوج نے منھ کی کھائی اور اسحاق خاں مارے
گئے۔ میں اُس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اُٹھا کر پھر شہر (دلّی)
واپس آ گیا[۱]۔ وزیر نے دوبارہ لشکر کشی کی اور افغانوں کو پچھاڑ کر پوری ظفرمندی

قائم خاں کے نام بھیج دیا اور یہ لکھ دیا کہ اِس علاقہ پر تم قبضہ کر لو۔ نواب علی محمد روہیلہ کا انتقال ہو چکا تھا (۱۱۶۲ھ) اور حافظ رحمت خاں اُن کے علاقے کا انتظام کر رہے تھے۔ نواب سعداللہ خاں کو اُنھوں نے علی محمد روہیلہ کے مسند پر بٹھا رکھا تھا۔ حافظ رحمت خاں نے قائم خاں کو بہتیرا سمجھایا کہ روہیل کھنڈ پر حکومت کرنے کا خیال ذہن سے نکال دو۔ یہ صرف صفدر جنگ کی ایک چال ہے اور وہ اِس طرح خاندانِ بنگش اور روہیلوں میں عداوت و نفاق کا بیج بونا چاہتا ہے، مگر صفدر جنگ کی شہ پر قائم خاں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مارا گیا (۱۵ رذی الحجہ ۱۱۶۲ھ مطابق ۲۶ رنومبر ۱۷۴۹ء) حافظ رحمت خاں نے اُس کی نعش فرخ آباد بھجوا دی۔

اب صفدر جنگ دہلی سے فرخ آباد پر قبضہ کرنے کی نیت باندھ کر نکلا (۳۰ رذی الحجہ ۱۱۶۲ھ) اور قائم خاں کی والدہ کو دھوکا دے کر اپنے خیمے میں بلوایا اور اُسے مع چھ فرزندوں کے گرفتار کر کے اُس کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔ پھر راجا نول رائے کو وہاں کا حاکم مقرر کر کے واپس آ گیا۔

اِدھر قائم خاں کے بھائی احمد خاں نے رستم خاں آفریدی کی مدد سے فوج جمع کی اور راجا نول رائے کو قتل کر کے اُس کی فوج کو لوٹ کھسوٹ کر مار بھگایا۔

یہ سن کر صفدر جنگ آگ بگولا ہو گیا اور اسّی ہزار فوج لے کر دہلی سے نکلا (۲۳ رجولائی ۱۷۵۰ء) سورج مل جاٹ، نجم الدولہ اسحاق خاں وغیرہ اُس کی مدد کے لیے ہمراہ تھے۔ میر بھی اسی لشکر میں اسحاق خاں کے ساتھ گئے تھے۔ چٹونی (متصل سہاور) کے مقام پر فرخ آباد سے چند کوس اِدھر میدانِ کارزار گرم ہوا۔ اسحاق خاں مارا گیا اور صفدر جنگ بھی زخمی ہوا۔ فوجیں بُری طرح پسپا ہو کر دہلی آ گئیں۔

۱۷۵۱ء میں صفدر جنگ نے ملہار راؤ ہلکر اور اپا سیندھیا مرہٹہ سرداروں کو کثیر رقم کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور دو لاکھ فوج لے کر دوبارہ فرّخ آباد پر حملہ کیا۔ اِس بار احمد خاں بنگش کو شکست ہوئی لیکن اس شرط پر صلح ہو گئی کہ احمد خاں، صفدر جنگ کو پچاس لاکھ رُپے بطور تاوانِ جنگ اور پانچ لاکھ شاہی خراج ادا کریں گے۔ [تاریخ فرخ آباد: اِروین و حیات حافظ رحمت خاں]

[۱] ۲۹ رشوال ۱۱۶۳ھ (خزانہ عامرہ/۸۳) مطابق ۳۰ رستمبر ۱۷۵۰ء

کے ساتھ حضور (شاہ) میں آیا۔[۱]

غازی الدین فیروز جنگ
۱۱۶۵ھ

جن دنوں ذوالفقار جنگ میر بخشی، نواب بہادر کی دشمنی کے باعث اپنے عہدے سے معزول ہوا اور امیر الامرائی کا منصب غازی الدین خاں فیروز جنگ پسرِ آصف جاہ کو ملا۔ وہ صوبۂ دکن کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے روانہ ہوا اور راستے میں ہیضہ کر کے مرگیا۔[۲] بخشی گری کی خلعت اُس کے بیٹے عماد الملک نے پہنی۔ بندہ لوگوں سے میل جول بند کر کے مُطوّل پڑھنے میں لگ گیا۔

مہانراین دیوان وزیر کی ملازمت
ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ

جب صفدر جنگ نے دھوکا دے کر نوّاب بہادر (جاوید خاں) کو مروا ڈالا،[۳] ایک عالم درہم برہم ہوگیا، میں بھی بے روزگار ہوگیا۔ وزیر کے دیوان، مہانراین نے اپنے داروغۂ دیوان خانہ میر نجم الدین[۴] علی سلاؔم کے ہاتھ جو میر شرف الدین علی پیاؔم کے بیٹے تھے، (میرے لیے) کچھ بھیجا، اور بڑے اشتیاق سے مجھے بُلایا۔ میں اُس کے دامن سے وابستہ ہوگیا اور کچھ مہینے فراغت سے بسر ہوگئے۔

ابھی مظلوم خواجہ سرا کے خون کا قضیّہ ختم نہیں ہوا تھا کہ زمانے نے ٹھوکر لگا کر

---

۱ جمادی الاولی ۱۱۶۴ھ (خزانۂ عامرہ/۸۳) ۲ ۷ ذی الحجہ ۱۱۶۵ھ (خزانۂ عامرہ/۵۰) یہ راستے میں نہیں بلکہ اورنگ آباد جانے کے ۱۷ دن بعد مرا تھا۔ ۳ ۲۷ اگست ۱۷۵۲ء مطابق ذیقعدہ ۱۱۶۵ھ (خزانۂ عامرہ/۸۵)

۴ نجم الدین علی سلاؔم، عہد محمد شاہی میں اردو کے مشہور شاعر شرف الدین علی پیاؔم کے بیٹے تھے۔ پیاؔم اکبر آباد کے رہنے والے تھے خان آرزو سے ان کی دوستی تھی۔ تقریباً سولہ سال انند رام مخلص کے ہم صحبت رہے۔ خوشگو کے مشاعروں میں شریک ہوتے اور باہم معارضے کرتے تھے۔ ۲۸ محرم ۱۱۷۵ھ کو انتقال کیا۔ اور دہلی میں دروازہ شاہ مردان کے قریب دفن ہوئے۔ ایک دیوان یادگار چھوڑا۔ انشا میں بھی دسترس تھی۔ سلاؔم کا ترجمہ نکات الشعراء میں موجود ہے (رک: مجمع النفائس: سراج الدین علی خاں آرزو۔ سفینۂ ہندی بھگوان داس ہندی/۲۷ سفینۂ خوشگو: بندرابن خوشگو۔ نکات الشعراء۔ نوائے ادب جلد ۸ شمارہ ۳-۴۔ سخن شعراء/۲۱۸۔ معاصر ۸/۱۲۲-۱۲۳۔ مرآۃ الاصلاح: انند رام مخلص۔ ورق ۱۵۸۔ الف۔

ایک اور فتنہ جگا دیا اور نیا ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یعنی وزیر کو کچھ شبہات پیدا ہوئے اور اُس نے بادشاہ سے بغاوت کر دی۔ ہر چند صلح کی کوشش کی گئی، مگر اُس نے امارت کے گھمنڈ میں اپنا سر نیچا نہیں کیا۔ مجبوراً بادشاہ نے اُسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ آخر وہ (صفدر جنگ) شہر سے نکل کر اپنے خداوندِ نعمت (احمد شاہ) سے جنگ کرنے پر تُل گیا۔[۱] ادھر عماد الملک نے جو آصف جاہ کا پوتا اور منصب بخشی گری پر مامور تھا۔ نیز اُس کے ماموں اور اعتماد الدّولہ (قمر الدین خاں) شہید کے لڑکے انتظام الدّولہ اور شاہی فوج کے دوسرے سرداروں نے شہر کی حفاظت کی۔ پُرانا شہر سب لُٹ گیا۔ چھ مہینے تک جنگ جاری رہی۔ اگرچہ اُس کے مقابلے کی اُن میں سکت نہیں تھی، لیکن شاہی فوج کے لوگوں نے ایسی جی توڑ کوشش کی کہ میدان مار لیا، اور باغی وزیر کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ مجبور ہو کر اُس نے صلح کا پیغام بھیجا۔ بادشاہ نے اُس کی شکست کو غنیمت جان کر اُسے صوبہ (اودھ) کی دستوری مرحمت کر دی۔ وزیر انتظام الدّولہ ہوا۔[۲]

امیر خاں کی حویلی میں (محرم ۱۱۶۷ھ)

اِنھیں دنوں زمانے کی نامُساعدت سے (تنگ آکر) میں نے ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو) کی ہمسایگی ترک کر دی یہ سوچ کر کہ وہ مجھے ہلکی نظر سے دیکھیں گے۔ اور امیر خاں[۳] مرحوم کی حویلی میں سکونت اختیار کی، (جو محمّد شاہی عہد کے بڑے امیر تھے الٰہ آباد کی صوبہ داری اور سلطنت کی دکھتی رگ اُن کے ہاتھ میں تھی، تخلّص

---

[۱] رجب ۱۱۶۶ سے تقریباً ذی الحجہ ۱۱۶۶ تک (خزانہ عامرہ/۸۶) [۲] صفدر جنگ محرم ۱۱۶۷ھ (نومبر ۱۷۵۳ء) میں صوبہ اودھ کی وزارت کا خلعت لے کر دلی سے روانہ ہوا اور اسی سال، ۱۷ ذی الحجہ (مطابق ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء) کو اُس نے وفات پائی۔ انتظام الدولہ، نواب قمر الدین کا لڑکا تھا یہ مارچ ۱۷۵۳ء میں عہدۂ وزارت پر متمکن ہوا اور مئی ۱۷۵۴ء تک رہا۔ عماد الملک نے اُسے قتل کرا دیا تھا۔ (خزانہ عامرہ/۸۶)

اُن کا انجام ہے۔ خوش سلیقگی اور طلاقتِ لسانی میں زبان زدِ عوام ہیں۔ محمّد علی روہیلہ کی مہم (سر کرنے میں) اُنھیں کا ہاتھ تھا، اُنھوں نے ہی بادشاہ کو اُس پر چڑھا کر اُسے قید کیا تھا۔ آخر کار اپنے ایک ملازم کے ہاتھ سے دیوانِ خاص کے دروازے پر مارے گئے) (اُن کی حویلی میں منتقل ہو کر) میں "بلطائفُ الحِیَل" بسر کرتا رہا۔

عماد الملک نے تھوڑی ہی مدت میں زور فراہم کر لیا اور مرہٹہ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر صفدر جنگ کا ساتھ دینے کے جرم میں سورج مل پر چڑھائی کر دی، جو ایک طاقتور زمین دار تھا۔ اور اُس کے قلعے کو مستقر بنا کر محاصرہ کر لیا اور اُسے پریشان کرنا شروع کیا۔ ملہار راؤ کا لڑکا اِسی جنگ میں مارا گیا۔ زمیندار مذکور (سورج مل) کی وزیر (صفدر جنگ) سے (خفیہ) خط و کتابت تھی یہی بات اِن دونوں کے نفاق کا سبب بنی۔ بادشاہ (بھی شہر سے) نکلا اور دریائے جمنا سے بیس میل اُدھر سکندر آباد کے قریب ڈیرے ڈالے۔ ایک دن شام کو خبر ملی کہ سردارانِ دکن، اور عماد الملک نے سورج مل سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے، اور اب وہ بادشاہی لشکر کو لوٹنے کے لیے یَس ہو کر چل پڑے ہیں بس پہنچا ہی چاہتے ہیں! بادشاہ نے صمصام الدولہ میر آتش اور چند دوسرے نمک حراموں کے کہنے میں آکر جو بخشی گری کے عملے سے سازش کر چکے تھے، ناموس (بیگماتِ شاہی اور خواتین) کو بھی وہیں چھوڑا اور مضطرب و سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا، وہاں صبح ہوتے تک دکنی فوج آگئی اور لشکر کو بالکل لوٹ لیا۔ پھر اُن کے تعاقب میں آئے اور دریا (جمنا) کے اُس طرف خیمے نصب کیے۔

عالمگیر ثانی
شعبان ۱۱۶۷ھ

اب حکم ہوا کہ مردانِ بادشاہی میں سے کوئی قلعے میں نہ رہے، اگرچہ وہ نمک حرام تو پہلے ہی یہاں سے نکل بھاگے تھے۔ اس بندوبست کے بعد عماد الملک آیا اور اُس نے قلمدانِ وزارت سنبھال لیا۔ بدھو

وزیر (انتظام الدّولہ) مارے بزدلی کے کسی کونے میں جا دبکا۔ اور بادشاہ حواس باختہ ہو کر باغ کی طرف نکل گیا۔ کچھ دیر بعد غدار ساتھیوں نے اُسے دھوکا دے کر پکڑ لیا اور اُس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر بہادر شاہ کے پوتے کو عالمگیر ثانی[1] کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔ بے حیثیت لوگ برسرِ اقتدار آ گئے۔ جو کچھ ہوا بے جا ہوا —— صمصام الدّولہ جو عقل سے بالکل کورا تھا امیر الامرا بن بیٹھا۔ میں اس سفرِ وحشت اثر میں احمد شاہ کے ساتھ تھا۔ واپس آ کر گوشہ نشین ہو گیا۔

ماموں کا سفر لکھنؤ
محرم ۱۱۶۸ھ

اُس زمانے میں کہ صفدر جنگ نے وفات[2] پائی اور صوبے (اودھ) کی ریاست اُس کے بیٹے شجاع الدّولہ کو ملی میرے ماموں (خانِ آرزو) لالچ کے مارے نکل پڑے یعنی شجاع الدّولہ کے لشکر میں اس توقع پر گئے کہ اسحاق خاں شہید کے بھائی وہاں ہیں وہ حقوقِ سابق کا خیال کر کے کچھ رعایت کریں گے۔ مگر کچھ اُن کے ہاتھ نہ آیا۔ قسمت کے دھکّے کھائے، وہیں مر گئے[3]۔ اُن کی نعش وہاں سے لا کر انھیں کی حویلی میں سپردِ خاک کی گئی۔

راجا جگل کشور
۱۱۶۹ھ

دو تین مہینے کے بعد راجا جگل کشور[4] جو محمد شاہ کے وقت میں وکیلِ بنگالہ تھے، اور بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے، مجھے گھر

---

[1] احمد شاہ کو ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں اندھا کر کے تخت سے اُتارا گیا۔ اور اُس کی جگہ عالمگیر ثانی کو ۵۵ سال کی عمر میں تخت نشین کیا۔ (۱۰ر شعبان ۱۱۶۷ھ روز یکشنبہ) وہ جب سے فرخ سیر برسرِ اقتدار آیا تھا (۱۷۱۳ء) بہت غریبی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس نے مذہبی کتابوں اور تصوّف و تاریخ کا اچھا مطالعہ کیا تھا اور اورنگ زیب کی طرح نظمِ حکومت کرنا چاہتا تھا، مگر اُس کی ناتجربہ کاری اور اُس کے درباری اُمرا کی نااہلی نے اُسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ بالآخر اُسے عماد الملک نے دھوکے سے قتل کرا دیا جس کا حال میرؔ نے آگے لکھا ہے۔ [2] ۱۷ر ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ خزانۂ عامرہ/۸۶۔

[3] ۲۳ر ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ مطابق ۲۷ر جنوری ۱۷۵۶ء سہ شنبہ۔ (خزانۂ عامرہ/۱۱۹) "بعد چندگاہ" اُن کا بقیۂ جسد، دلی لا کر اُن کی حویلی میں دفن کیا گیا تھا۔ اور بقول صاحبِ مخزن الغرائب "استخوانش بحضرت دہلی رسانیدند"، قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج (ورق ۳۹-الف)۔ [4] "در نکتہ دانی و لطیفہ گوئی و خوش معاشی و یار باشی معروف بودہ" (سفینۂ ہندی/۴۶-۴۷) عہد محمد شاہ میں دربارِ دہلی (باقی بر صفحہ آیندہ)

سے بُلا کر لے گئے اور اپنے اشعار پر اصلاح کرنے کو کہا۔ میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور اُن کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔

راجا ناگرمل ۱۱۷۰ھ

اُس زمانے میں راجا ناگرمل جو فردوس آرام گاہ کے عہد میں دیوانی خالصہ و تن پر فائز تھے[۱] نیابتِ وزارت پر سرفراز ہوئے۔ مہاراجگی اور عمدۃ الملکی کا خطاب پایا۔ چوں کہ وہ شہر کے مظلوموں کو اپنے گھر پناہ دیتے اور اُن کی فریاد سُنتے تھے، بہت سے لوگ اُن کے دشمن ہو گئے۔ اگر وہ دربار میں جاتے تو خود بھی بڑی احتیاط اور پورے طمطراق کے ساتھ (مسلّح ہو کر)، اُن کی فوج بھی چوکنّی رہتی۔ اِس طرح بدخواہوں کا فریب نہ کھاتے اور بڑے ٹھیّے سے بسر کرتے تھے۔ اِسی زمانے میں صمصام الدّولہ یعنی موجودہ میر بخشی سِل کے مرض میں (مبتلا ہو کر) مر گئے۔ اور اُن کا لڑکا جو محض بے حقیقت ہے اُن کے عہدے پر مقرر ہوا۔

ابدالی کے حملے

اِسی اثنا میں شاہ درّانی[۲] جو سرہند سے شکست کھا کر واپس ہو گیا تھا، اور ہندستان کا خیال برابر اُس کے سر میں سمایا

میں ناظم بنگالہ کا وکیل تھا۔ بادشاہ کے مزاج میں دخل تمام حاصل کر لیا تھا۔ اپنے بیٹے کی شادی بڑی دھوم سے کی تھی۔ خرابیِ دہلی کے بعد لکھنؤ گیا اور نواب شجاع الدّولہ کی ملازمت اختیار کی۔ وہاں سے پھر فرخ آباد چلا گیا۔ اُسے ایک موقع پر ہاتھی نے ہلاک کر ڈالا۔ [۱] محمد تقی میر از مدّتے بسبب افراط و تفریطِ روزگار ... ہمراہِ ناگرمل کہ دیوان تن و دخیلِ پادشاہی بود در قلعۂ ڈیگ شنیدہ می شود.. از غزلیاتِ تازہٗ اُوست کہ باین راقم الحروف نوشتہ ..." (قدرت اللہ شوق: تذکرہ طبقات الشعراء قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن، ورق ۸۶ ب تا ۹۲ - الف۔ مشمولہ تین تذکرے مرتبہ نثار احمد فاروقی ص۱۱۳ اس تذکرے کا زمانہ تصنیف ۱۱۸۶ھ ہے۔) [۲] احمد شاہ ابدالی دسمبر ۱۷۴۹ء میں پھر دریائے چناب پار کر کے ہندستان پر حملہ کرنے کی نیّت سے آپہنچا تھا اُس نے معین الملک کو چہار محل (گجرات۔ اورنگ آباد۔ پسرور، سیالکوٹ) کے خراج کے لیے لکھا جو محمد شاہ نے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کو دیے تھے معین الملک نے ابدالی کا یہ خط دہلی بھیج دیا جہاں سے اندرونی سازشوں کے شکار عیش پرست بادشاہ نے خراج ادا کرنے کا وعدہ لکھ بھیجا۔ معینُ الملک نے شاہی خط دکھا کر احمد شاہ (باقی بر صفحہ آیندہ)

ہوا تھا بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ لاہور آیا۔ وہاں کے وضیع و شریف نے کون سا ستم تھا جو نہ جھیلا، اور کون سی جفا تھی جو نہ سہی۔ کوئی روکنے والا تو تھا نہیں، یعنی معین الملک پہلے ہی مغلوب ہو چکا تھا کچھ دنوں بعد گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

وہاں سے ابدالی نے شہر (دلی) کا قصد کیا اُس کی آمد آمد سُن کر یاروں کے اوسان خطا ہو گئے۔ بادشاہ اور وزیر سے کچھ نہ بن پڑا، آخر اس کی رسم پذیرائی کے لیے گئے اور قید ہو گئے۔ راجا ناگرمل، سعدالدین خاں خان ساماں وغیرہ جیسے بعض رئیسوں کے ساتھ اپنی حفاظت کے لیے سورج مل کے قلعوں میں چلا گیا۔ تقریباً ایک مہینے تک شہر میں رسد کی تنگی رہی۔ پھر شاہ (ابدالی) نے عالمگیر (ثانی) کو سلطنت سپرد کر کے وزیر (عماد الملک) کو اپنے ساتھ لیا اور آگرے کا رخ کیا۔ اُس کی فوجوں نے لوٹ مار شروع کر دی متھرا میں جو

کو ٹال دیا۔

لیکن ابدالی کو اندازہ تھا کہ موعودہ وقت میں یہ خراج ادا نہیں کر سکے گا چناں چہ ایسا ہی ہوا جب میعاد گذر گئی اور رُپیہ نہ پہنچا تو احمد شاہ نے پہلے اپنے سفیر بھیجے۔ معین الملک نے حذر کیا۔ مگر حملے کی دھمکی میں آکر نو لاکھ رُپیہ ادا کر دیا اور باقی کے لیے وعدہ کر لیا کہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے واپس ہو جانے پر ادا کروں گا۔ ابدالی نے ۹ لاکھ تو خزانے میں جمع کیے اور حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی نہ کیا۔ (۱۷۵۱ء) معین الملک بھی پچاس ہزار فوج لے کر راوی کے پار پہنچ گیا۔ لیکن ابدالی دوسرے راستے سے لاہور کی طرف چل کھڑا ہوا۔ معین الملک جلدی سے لاہور واپس آیا۔ ابدالی نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور یہ چار مہینے تک جاری رہا۔ رسد کی پریشانی سے عاجز آکر معین الملک نے ہتھیار ڈال دیے۔ (مارچ ۱۷۵۲ء) لیکن ابدالی معین الملک کی ہمّت، شجاعت اور اپنے آقا کی وفاداری سے اتنا خوش ہوا کہ لاہور کی گورنری اپنی طرف سے اُسے عطا کی۔ اِدھر عبداللہ خاں کی سرکردگی میں کشمیر فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی اور وہاں کے گورنر ابوالقاسم خاں کو شکست دے کر سکھ جیون لال کو اپنی طرف سے گورنر مقرر کر دیا۔

لاہور پر اس کے بعد معین الملک تقریباً ۱½ سال تک اطمینان سے حکومت کرتا رہا۔ ۳ر نومبر ۱۷۵۳ء کو اچانک اُس کا انتقال ہو گیا۔

شہر (آگرہ) سے اٹھارہ کوس اِدھر بڑا بارونق اور آباد شہر تھا، قتلِ عام ہوا۔[1]
جب ہَوا متعفّن ہوگئی تو شاہ (ابدالی) نے طاعون کے خوف سے سورج مل کے
معاملے کو ملتوی کر کے دفعتہً کوچ کر دیا۔ اور محمّد شاہ کی بیٹی سے اپنا عقد کر کے بالا بالا

---

[1] جب معین الملک کا انتقال ہوگیا (۳ر نومبر ۱۷۵۳ء۔ محرم ۱۱۶۷ھ) تو اُس کی بیوی مغلانی بیگم نے صوبے کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مگر عماد الملک نے اُسے معزول کر کے آدینہ بیگ خاں کو حاکم مقرر کر دیا (مارچ ۱۷۵۶ء) مغلانی بیگم نے ابدالی کو بلا بھیجا۔

ابدالی قندھار سے چل کر ۲۰ر دسمبر (۱۷۵۶ء) کو لاہور پہنچا، اور ۱۰ر جنوری (۱۷۵۷ء) کو ستلج عبور کر کے بغیر کسی روک ٹوک کے ۲۸ر جنوری کو دِلّی میں داخل ہوگیا۔ یہاں اُس کی فوجوں نے ایسی لوٹ مار کی اور دست ظلم و تعدّی دراز کیا کہ میرؔ نے اِس کتاب میں اُس کا عُشرِ عَشیر بھی نہیں لکھا ہے۔

عماد الملک سے ابدالی نے زر و جواہر پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ اُس نے اپنے افلاس کا رونا رویا تو ابدالی نے اُسے اور اُس کے ملازموں کو ایذائیں دیں پھر انتظام الدّولہ طلب کیا گیا جو نواب قمر الدین خاں کا لڑکا تھا اور اُس سے ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کیا اُس نے بھی لیت و لعل کی تو اُسے "چوبہائے قینچی" سے ایذا دینے کی دھمکی دی گئی جو ابدالی کے سامنے فرش پر لگی ہوئی تھیں۔ تب اُس نے کہا کہ شولاپوری بیگم کو خزانے کا علم ہوگا۔ یہ بیگم ایک وزیر (انتظام الدّولہ) کی ماں دوسرے (قمر الدین خاں) کی بیوی اور تیسرے وزیر (محمد امین خاں) کی بہو، اُسی وقت بلائی گئی اور اُسے دھمکایا گیا کہ ناخنوں میں کیلیں ٹھونکی جائیں گی ورنہ قمر الدین خاں کے دفینے کا پتا بتاؤ! شولاپوری بیگم نے نشان بتایا تو سَو آدمیوں نے چھ گھنٹے لگاتار محنت کر کے قمر الدین خاں کا مکان کھود پھینکا اور ۱۶ لاکھ روپے نقد نیز بے شمار سونے چاندی کے ظروف نکال لیے (۴ر فروری ۱۷۵۷ء)۔

لاکھوں بے گناہ عورتوں کی عصمتیں اور ہزاروں امیروں کی دولت و عزّت لوٹنے کے بعد احمد شاہ نے جنوب کی طرف کوچ کیا۔ ۳ر مارچ (۱۷۵۷ء) کو بلبھ گڑھ کا قلعہ فتح کیا، یہاں قتل و غارت کا وہ بازار گرم ہوا کہ سپاہی مقتولوں کے سروں کو نوٹوں کی طرح جمع کرتے اور صبح ہی اُن سروں کی گٹھریاں لے کر وزیر کے خیمے پر آجاتے تھے جہاں اُنھیں ایک سر پر پانچ رُپے انعام ملتے تھے۔ اور شرفا کی بہو بیٹیوں کی ایسی بے توقیری ہوئی کہ جن مُغویہ عورتوں سے ابدالی کے سپاہی زنا کرتے تھے، اُن کی فریاد و فغاں سے راتوں کو کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔

اُدھر ابدالی نے نجیب خاں اور جہاں خاں کو فوجیں دے کر متھرا فتح کرنے بھیج دیا۔ وہاں بھی بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا سارے بازار لوٹ لیے گئے۔ (باقی بر صفحہ آیندہ)

نکل گیا۔ عماد الملک آگرے کے نواح میں رہ گیا۔ نجیب الدولہ، جو صفدر جنگ کی لڑائی (کے زمانے) میں وزیر کا ملازم ہوا تھا، نمایاں ترقی کر کے میر بخشی اور مختارِ سلطنت بن گیا۔

نجیب الدولہ سے جھڑپ

اِدھر راجا ناگرمل دکن کے سردار (مرہٹوں) سے مل گیا۔ وزیر (عماد الملک) اور احمد خاں اور اُن (مرہٹوں) کو نجیب الدولہ پر چڑھا کر لے گیا۔ وہ (نجیب الدولہ) شہر بند ہو گیا۔ توپ خانے کی جنگ ہوئی۔ بعض سردار جو خود رائے تھے، ذرا سا غلبہ پا کر شہر کی لوٹ کا قصد کرتے تھے۔ راجا مذکور جس کا منشا وزیر کی نیک نامی

تمام مکان جلا دیے اور ہفتوں تک سڑکوں پر لاشیں سڑتی رہیں، اتنا خون بہایا گیا تھا کہ جمنا کا پانی سُرخ ہو گیا تھا۔

۱۳ مارچ کو جہاں خاں نے آگرے پر قبضہ کر کے بیس ہزار سے زائد انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

قتل و غارت کی زیادتی کا معمولی سا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ فضا اِس قدر متعفن اور پانی ایسا خراب ہو گیا کہ ابدالی کی فوج میں ہیضہ پھیل گیا اور اوسطاً ڈیڑھ سو سپاہی روز مرنے لگے۔ مجبوراً ۲۸ مارچ کو ابدالی نے پڑاؤ اُٹھا دیے اور ہندستان سے چلے جانے کا قصد کیا۔ پہلے احمد شاہ نے اپنے لڑکے تیمور شاہ کی شادی عالمگیر ثانی کی ۱۶ سالہ لڑکی سے رچائی تھی اب واپسی میں اُس نے محمد شاہ کی لڑکی حضرت بیگم سے زبردستی اپنا نکاح پڑھوا لیا۔ (اپریل ۱۷۵۷ء) یہاں سے ابدالی کا قافلہ قندھار کی طرف چلا تو مال غنیمت ۲۸ ہزار اونٹوں، ہاتھیوں، خچروں اور بیل گاڑیوں پر لدا ہوا تھا۔ ساری فوج پیدل چل رہی تھی کیوں کہ اُن کی سواریوں پر مال واسباب تھا۔ دلّی میں جانور عنقا کا حکم رکھتے تھے کیوں کہ ابدالی نے چلتے وقت دلّی میں مریل گدھا بھی نہیں چھوڑا تھا۔

اُس نے سرہند کے علاقے کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا، اور عبدالصمد خاں کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ نجیب الدولہ کو اپنا مختار بنا کر دہلی میں چھوڑ گیا۔ اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا حاکم اور جہاں خاں کو اُس کا نائب بنا کر قندھار واپس ہوا۔

یہاں میرؔ نے ابدالی کے تیسرے اور چوتھے حملے کو مخلوط کر دیا ہے۔

کے سوا کچھ نہ تھا، انھیں لُوٹ مار سے باز رکھتا اور کہتا تھا کہ تمھارا شہر کو لُوٹنا نامناسب اور بیہودہ ہے۔ دکنی فوج ایک جہان کی ناموس خاک میں مِلا دے گی۔ تم تو ناتجربہ کار ہو، ایسا نہ ہو کہ شہر غارت ہو جائے اور بدنامی سر تھُپ جائے! بہتر یہ ہے کہ ہم روہیلوں کو صلح کر کے (محاصرہ سے) نکال لیں اور شہر کو محفوظ رہنے دیں۔ پایانِ کار اُس نے نجیب الدّولہ سے صلح کر لی اور اُسے شہر سے نکال لائے وہ سہارن پور چلا گیا۔ جو اُس کی فوج داری میں تھا۔ وزیر اور اُس کے دوسرے ساتھی شہر میں داخل ہوئے دکنی فوج کو رخصت کر دیا۔ توپ خانے کی داروغگی راجا کے لڑکے (بہادر سنگھ) کو تفویض ہوئی اور احمد خاں میر بخشی ہو گیا۔

راجا جُگل کشور

ایک دن میں نے راجا جُگل کشور کے سامنے روزگار کی شکایت کی؛ وہ عزیز شرم سے پیلا پڑ گیا، کہنے لگا: "میں خود مُفلس ہوں اگر کچھ بھی ہوتا تو ہرگز دریغ نہ کرتا"۔ ایک دن سوار ہو کر راجا ناگر مل کے ہاں گیا اور میرا تعارف کرا کے بُلوا بھیجا۔ میں گیا اور اُس کے وسیلے سے ملاقات کی، بہت تلطف و عنایت سے پیش آیا، کہنے لگا: "دعوتِ شیراز حاضر ہے، یعنی تمھارا حصّہ بھی تمھیں پہنچتا رہے گا"۔ بارے مجھے کچھ تسلی ہو گئی اور اُٹھ کر آ گیا۔ دوسرے دن جب شعر خوانی کا اتّفاق ہوا تو کہنے لگا: "میر کا ہر شعر موتیوں کی مالا ہے، مجھے اِس جوان کا طرز بہت اچھا لگتا ہے"۔ ایسے ہی میں کچھ دن جاتا رہا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ چونکہ چاقو ہڈّی تک پہنچ گیا تھا (یعنی فقر و فاقہ کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی) اضطراب بہت بڑھ گیا۔ ایک دن صبح کی نماز کے بعد اُس کے دروازے پر گیا۔ چوبداروں کا میردہ جے سنگھ نامی میرے سامنے آیا اور کہنے لگا: "یہ دربار کا کون سا وقت ہے؟" میں نے کہا: "اِضطرار کا عالم ہے!" بولا "لوگ تمھیں درویش کہتے ہیں، تم نے شاید یہ نہیں سُنا کہ لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللهِ (ایک ذرّہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا)

یہاں اپنی ریاست کے آگے کسی کی پروا نہیں ہے! صابر و شاکر رہنا چاہیئے، ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے، یہاں تو تمھاری رسائی مشکل ہے، البتہ اُن کے بڑے لڑکے سے مل سکتے ہو۔" میں نہایت شرمندہ ہو کر واپس آگیا۔

ایک رات کو اُس (دربان) کے کہنے کے مطابق (راجا کے) لڑکے سے ملنے گیا دربان نے روک دیا۔ بولا: "اس وقت اُن سے ملاقات کرنا ممکن نہیں۔" مجبوراً واپس آگیا۔ پھر عشا کی نماز کے بعد دوبارہ گیا، دیکھا تو ڈیوڑھی پر دربان نہیں ہے، میں نے پوچھا: "دربان کہاں گیا؟" لوگوں نے کہا: "آج اُس کے سر میں ایسا شدید درد تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔" میں نے سوچا تائیدِ الٰہی شامل ہے، دیوان خانے میں داخل ہوا اور ملاقات کی۔ شعر خوانی کا بھی اتّفاق ہوا۔ خواجہ غالب نے جو، جوانِ زور مند (با اثر) تھے اور مجھ سے شناسائی رکھتے تھے، میرا احوال مفصّل سنا کر کچھ مقرّر کرا دیا جو میں ایک سال تک پاتا رہا۔ ایک رات راجا کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے مجھے ایک سال کی تن خواہ دے کر فرمایا: "مجھ سے اکثر ملتے رہا کیجیے۔" اُس دن سے عشا کی نماز کے بعد ملازموں کے طریقے سے اُن کے پائیں باغ میں جاتا، اور دوپہر رات گئے تک رہتا تھا۔ اِس خدمت کا پھل یہ تھا کہ چین سُکھ سے گزر اوقات ہوتی تھی۔

اب میرا زبان دراز قلم بات کا رُخ بدل کر دوسری طرف چلتا ہے:

(سانحہ) دکن کے سردار مُلک کو اپنا سمجھتے تھے، اور شاہ (ابدالی) سے جنگ کے منصوبے گانٹھ رہے تھے، جب اُنھوں نے سُنا کہ شاہ دُرّانی کا لڑکا تیمور شاہ اور سردارِ فوج جہاں خاں تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ پڑا ہے تو انجام (یا پشت پناہ طاقت) کی پروا نہ کرتے ہوئے لاہور پر دھاوا بول دیا۔ شاہی فوج جو کم تھی جنگ کی تاب نہ لا کر بھاگ گئی، اور یہ لوگ (مرہٹے) دریائے اٹک تک

قابض ہو گئے۔ صاحبا نامی سردار کو وہاں کے انتظام پر چھوڑا اور اپنے ملک یعنی دکن چلے گئے۔

چند اور سانحے

چوں کہ میں اِن سانحات کو مختصر کر کے لکھنا چاہتا تھا اس لیے بہت سی باتیں، مثلاً: عماد الملک کا شجاع الدّولہ پر آنکھ کڑی کرنا اور راجا کا صلح کرا دینا، بدخشیوں کی بدتمیزی کا ہنگامہ اور وزیر، راجا اور نجیب خاں کی جرأت سے اُن کا مغلوب ہونا، اور وزیر (عماد الملک) کا اپنے خسر معین الملک کی املاک ضبط کرنے کے لیے لاہور جانا اور صوبہ دار مذکور (معین الملک) کی بیوی کو اُس شہر سے نکال[1] دینا، اور عاقبت محمود کشمیری کو مار ڈالنا، اور ستار قلی خاں کشمیری کا مارا جانا، شہر دلی کی بربادی اور چند بے حقیقت لوگوں کے ظلم سے (دلی والوں کے) گھر بار تباہ ہونا، جو نئے نئے برسرِ اقتدار آئے تھے۔ اور اُن احمقوں کا خدا کی لاٹھی سے غافل ہونا اور عالی گُہر (شاہ عالم) کا، جس پر اب بادشاہ ہونے کی تہمت ہے، مگر فرنگیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے، سردارانِ دکن میں سے ایک کے ساتھ جانا اور کچھ مدّت بعد اُس کا شہر (دلی) آنا اور اپنے باپ کی خدمت میں پہنچنا، اور اُس کی پذیرائی کے لیے راجا کا جانا، یاروں کا اُسے فریب دینا، اور اُس کا زخمی ہو کر پورب کی طرف بھاگنا، وہاں سختیاں اُٹھانا، (پھر) بادشاہ ہونا، اور انتظام الدّولہ خان خاناں کو قید کرنا اور کچھ نا اہلوں کے کہنے سے سلاطین کو قلعے سے نکال دینا، پھر اُن کا ناگفتہ بہ رسوائی کے ساتھ واپس آنا۔ (یہ سب باتیں) میرے قلم نے تفصیل سے نہیں لکھیں، کیوں کہ اِس مختصر (کتاب) میں اِن تمام تفصیلات کی گنجایش نہیں تھی۔

---

[1] ۲۸ مارچ ۱۷۵۶ء۔ اِس کا مفصل تذکرہ ہم نے گزشتہ صفحات کے حاشیے میں لکھ دیا ہے۔

مرہٹوں کا فتنہ

ابھی یہ ساری بلائیں پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھیں کہ چرخِ فتنہ انگیز کی گردش نے ایک نیا ہنگامہ برپا کردیا۔ عجب اُفراتفری پھیل گئی، یعنی جنکو نامی سردار بھاری فوج لے کر دکن سے آیا اور اُس کے لشکر کا شہر (دلّی) کے اطراف میں گذر ہوا۔ بہتوں کے دل دہل گئے، ایک ہلڑ مچ گیا۔ رئیسوں کا رنگ فق ہوگیا۔ شاہ اور وزیر نے اُس سے صلح کرلی۔ اُس نے دتّا نامی سردار کو جو اس بہادر اور کڑیل جوان (جنگو) کا مدارالمہام تھا، اپنے ساتھ ملاکر نجیب الدّولہ پر چڑھائی کردی، جو گنگا کے کنارے وسطی علاقے میں اپنے قدم جمائے بیٹھا تھا۔ وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی۔

یہاں سب نے وزیر کے گھر جمع ہوکر مشورہ کیا کہ اگر یہ بھاری سپاہ واپسی میں ہم پر ٹوٹ پڑی تو ایسی تباہی مچائے گی کہ عالم تہ و بالا کردے گی اور سارا شہر غارت ہو جائے گا۔ اگر بن پڑے تو ہم شریک ہوکر نجیب الدّولہ کا کام تمام کردیں ورنہ درمیان میں پڑکر صلح کرادیں۔

عالمگیر ثانی اور انتظام الدّولہ کا قتل
۱۱۷۳ھ

جب یہ طے ہوگیا تو وزیر نکلا اور اُس نے دریا (جمنا) کے اُس پار خیمے گاڑ دیے پھر بادشاہ کو (شریک ہونے کی) دعوت دی۔ اُس نے بیماری کا بہانہ کرکے صاف جواب دے دیا۔ چوں کہ لوگوں کو بادشاہ کی طرف سے اطمینان نہیں تھا، اُنھوں نے مشورہ کیا کہ شہر جاکر بادشاہ کو ختم کردیں اور انتظام الدّولہ کو بھی جیتا نہ چھوڑیں۔ راجا (ناگرمل) اُسی رات کو دریا کے پار چلا گیا، صبح ہوتے تک یہ سیاہ باطن، لشکر سے (نکل کر) شہر میں آئے اور بادشاہ کے سامنے قسمیں کھائیں کہ ہم وزیر سے خوش نہیں ہیں لیکن زمانہ سازی کر رہے ہیں۔ اگر حضور فائدہ اُٹھائیں تو ایک نادر موقع ہاتھ آیا ہے، وہ

سادہ لوح (بادشاہ) ان نابکاروں سے جُل کھا گیا، پوچھا: "کیا ہے؟" اِنھوں نے کہا: "ایک صاحبِ کمال تارک الدُّنیا فقیر دو تین روز سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں وارد ہے، کل چلا جائے گا، اگر آپ شام کو اُس سے مل لیں تو بہت ممکن ہے کہ اِس بزرگ کی دعا سے ہم اِس بلا سے چھٹکارا پالیں اور وزیر پر غالب آجائیں۔" بادشاہ اِن عزیزانِ زمانہ کی منافقت سے بے خبر تھا۔ وعدہ کر لیا کہ "ہم ضرور ملیں گے۔" آخر شام کے قریب اُسے سوار کر کے لے گئے، جب کوٹلے میں پہنچا تو اُس بے گناہ کو چاقو مار مار کر ہلاک کر دیا[1] اور اُس کی نعش دیوار کے نیچے پھینک دی۔ شام کے بعد وہاں سے نپٹ کر نماز پڑھنے کی حالت میں خان[2] خاناں کے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر کھینچا اور اُسے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر کے اُس کے مُردے کو سب کی نگاہوں سے بچا کر لے گئے اور دریا میں ڈال دیا۔ بادشاہ کی نعش تمام دن بڑی رسوائی کے ساتھ زمین پر پڑی رہی، جو دیکھتا تھا وہ اِس وحشیانہ فعل کے مرتکبوں پر لعنت کرتا تھا۔ آخر اُس کے وارثوں نے کلیجے پر پتھّر رکھ کے اُس کی میّت راتوں رات دفنا دی، اور اُن ظالموں کے خوف سے ماتم بھی نہیں کیا۔ دوسرے[3] دن صبح کو

---

[1] عزیز الدین شاہ عالمگیر ثانی ابن جہاں دار شاہ ۱۶۸۸ء/۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوا، ۲؍جون ۱۷۵۴ء (۱۰؍شعبان ۱۱۶۷ھ) کو تخت نشین ہوا۔ اور ۲۹؍نومبر ۱۷۵۹ء (۸؍ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ) کو عماد الملک نمک حرام کی غدّاری اور مہدی علی خاں کی سازش سے قتل ہوا۔ ہمایوں کے مقبرے میں مدفون ہے۔ وقائعِ عالم شاہی میں ہشتم ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ درج ہے۔ [2] انتظام الدّولہ خان خاناں، نواب قمر الدین خاں کا دوسرا بیٹا تھا، ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ میں بزمانہ احمد شاہ بخشی دوم ہوا اور ۱۷۵۳ء/۱۱۶۵ھ میں صفدر جنگ کی معزولی کے بعد وزیر بنا۔ ۳۰؍نومبر (۱۷۵۹ء) کو بادشاہ کے قتل سے اگلے دن عماد الملک کے آدمیوں نے اُسے بھی مار ڈالا۔ [3] لیکن فراقی کا بیان ہے: "ہماں روز شاہ جہاں ثانی را براَورنگِ خلافت نشانید۔ چناں چہ اُو یازدہ ماہ کامرانی کرد و بیست ونہم شہر صفر سال ہزار و یک صد وہفتاد ودو (۱۱۷۲ھ) مقیّد شد" (وقائعِ عالم شاہی/۵)۔

وہ جفا کار قلعے میں آئے، اور شاہ جہاں نامی ایک جوان کو تخت پر بٹھا کر نذریں پیش کیں۔ عالمگیر ثانی کی سلطنت کی مدّت سات سال تھی۔

جب اِن چند ظالموں نے بادشاہ اور انتظام الدّولہ کے قتل سے فراغت پائی تو وزیر کو لے کر کوچ کیا اور بھاگم بھاگ راستہ طے کر کے مرہٹوں کی فوج سے مل کر جنگ میں اُن کے شریک بن گئے۔ ابھی اس پر ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ خبر آئی شاہی فوج (ابدالیوں) نے اٹک پار کر کے صاحبا کو شکست دے دی۔ مرہٹے سردار نجیب الدّولہ کی جنگ کو یوں ہی چھوڑ کر (ابدالی کی فوج کو) روکنے کے لیے سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ اور پانی پت کے قریب دریائے جَون عبور کر کے اُترے۔ اثنائے راہ میں (اُن کے ہاتھوں) ایک عالم نے سختیاں اُٹھائیں، پھر وہ اینٹ سے اینٹ بجاتے ہوئے کرنال کے اُس طرف خیمہ زن ہوئے جو ایک مشہور قصبہ ہے اور وہاں (حضرت) شاہ شرف بُو علی قلندرؒ کا آستانہ ہے۔ شام کو سُنا گیا کہ شاہی فوج دریا کی طرف جمع ہو رہی ہے، انھوں نے بھی اپنی فوج کو تیار کیا دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے تقریباً آٹھ ہزار جیالے اور کارگذار سوار اور اپنے میں سے ایک سردار کو جدا کر کے اُن کی طرف بھیجا جب وہ گئے اور اس فوج کے مقابل ہوئے تو ایک ہی ٹکاری میں بہتوں کے پانو اُکھڑ گئے۔ ان سخت دل کوہ پیکر سورماؤں نے ایذا دہی شروع کی اور شیخی خوروں کے منھ توڑ دیے۔ مگر اُدھر کے خوں خوار بھی ایسے گتھ گئے کہ آن کی آن میں کُشتوں کے پُشتے لگا دیے۔ اِدھر کی فوج کے چھکّے چھوٹ گئے اور جوانوں کے دل دہل گئے۔ اگر خدا نخواستہ وہ دستہ دائرۂ لشکر پر ٹوٹ پڑتا تو ایک عالم کا کام تمام ہو جاتا اور ہم لوگوں میں سے ایک بھی شہر تک زندہ نہ پہنچتا۔ یہ لوگ تو پشیمان ہو کر واپس آ گئے اور وہ (دُرّانی، مالِ غنیمت) سے لد پھند کر دریا پار کر گئے۔

جب بادشاہ نے دوآبے میں ڈیرے ڈالے اور نجیب الدّولہ (اُن سے آکر) مل گیا تو دکھنیوں نے لشکر اور شہر کی محافظت کے لیے وزیر کو دستوری دیدی اور خود دریا کے کنارے کنارے آئے اور چھ کوس اُدھر خیمے گاڑ دیے۔ یہاں وزیر نے شہر کو محکم کر کے ملچار باندھ دیے اور دارا شکوہ کی حویلی جو دریا کے کنارے واقع ہے، راجا کو سونپ کر، نئے بادشاہ یعنی شاہ جہاں (ثانی) سے آملا۔

چار روز کے بعد شاہ (ابدالی) اور نجیب الدّولہ کی فوجیں ایک ساتھ کوچ پر کوچ کرتی ہوئی دریا تک پہنچ گئیں، جیالے سردار اور جنگ جو سوار (مرہٹوں کی) گوش مالی کرنے پر آمادہ ہوئے۔ روہیلوں کے پیادوں نے پیش قدمی کر کے جنگ شروع کردی، نہایت جاں فشانی سے کٹ کٹ کر لڑے۔ اِدھر سے دتّا جو دکن کی فوج کا سردار تھا اپنے کارگذاروں کی مدد کو آپہنچا اور بڑی ثابت قدمی سے اس فوجِ سنگین کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ پہلی ہی تفنگ جو ادھر سے سر ہوئی اس کا ایک تیر دتّا کے لگا اور پہلو میں ترازو ہو گیا۔ مرہٹوں کے ہاتھ پانْو پھول گئے، اُس کے مُردے کو اُٹھا کر دریا کے کنارے رکھا، تو اُنھوں نے دریا کے اس طرف آکر مار دھاڑ شروع کی یہ (مرہٹے) ہار کر بھاگ گئے وزیر اپنے سرداروں کو ملچاروں پر چھوڑ کر دکن کی فوج سے مل گیا۔ زمانۂ غدّار نے بڑی تباہی مچائی دُرّانیوں نے (مرہٹوں کی) بھگوڑی فوج کا تعاقب کیا اور اُن میں سے اکثر کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا وہاں سے واپس آکر شہر لوٹنے میں لگ گئے۔

دلّی میں لُوٹ

شام کو راجا شہر سے نکلا اور سُورج مل کے قلعوں میں جانے کا قصد کیا اور صحیح سلامت پہنچ گیا۔ بندہ (میرؔ) اپنے ناموس (حرم) کی حفاظت کے لیے شہر ہی میں رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ "شاہ (ابدالی) نے امان دے دی ہے رعایا کو چاہیئے کہ پریشان دل نہ ہو" مگر جب

گھڑی بھر رات گذری تو غارت گروں نے مظالم شروع کیے، شہر کو آگ لگادی، گھروں کو جلادیا اور (سارا ساز و سامان) لے گئے۔ صبح کو جو (گویا) صبح قیامت تھی تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت میں لگ گئے۔ (شہر کے) دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کرلیا بہتوں کو جلادیا اور سر کاٹ لیے۔ ایک عالم کو خاک و خون میں لٹایا اور تین دن رات تک ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا۔ کھانے اور پہننے کی چیزوں میں سے کچھ نہ چھوڑا چھتیں توڑ دیں، دیواریں ڈھادیں سینے زخمی اور کلیجے چھلنی کردیے! وہ بدطینت ہر در و بام پر (چڑھے ہوئے تھے) اور شرفا کی مٹی پلید ہورہی تھی۔ شہر کے عمائد خستہ حال تھے، بڑے بڑے لوگ ایک گھونٹ پانی کے محتاج تھے گوشہ نشین بے گھر اور نواب گداگر بن گئے۔ وضیع و شریف ننگے پھرتے تھے گھر والے بے گھر ہوگئے تھے اکثر بلا میں گرفتار اور رسوائے کوچہ و بازار تھے۔ کتنے ہی مصیبت میں مبتلا تھے، اور ان کے زن و فرزند اسیر۔ شہر پر (غارت گروں کا) ہجوم تھا اور قتل و غارت علی العموم ہورہی تھی۔ لوگوں کا حال ابتر ہوگیا۔ بہتوں کی جان لبوں تک آگئی (یہ غارت گر) زخم بھی لگاتے، اور گالیاں بھی بکتے، روپیہ بھی چھین لیتے اور سیدھیاں بھی سناتے۔ جو سامنے پڑتا اس کا پاجامہ تک چھین لیتے۔ ایک عالم تکلیفیں جھیل کر مرگیا۔ ایک جہان کی ناموس برباد ہوگئی۔ نیا شہر ڈھے کر خاک سے برابر ہوگیا۔ تیسرے دن نسق مقرر ہوا۔ انزلا خاں نامی نسقچی باشی آیا تو لوگوں کی ٹوپیاں اور نیمہ تن اس نے اتروا لیے۔ بارے قدغنچیوں نے ان غارت گروں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں۔ (اب) بے رحم لوگ پرانے شہر پر ٹوٹ پڑے اور ایک جہاں کو ہلاک کردیا سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ گرم رہا۔ ایک وقت کا کھانا اور پہننے کا سامان بھی کسی کے گھر میں

نہ رہا، مردوں کے سر ننگے تھے، عورتوں کے پاس اوڑھنی تک نہ تھی۔ چوں کہ راستے بند تھے بہت سے لوگ زخم کھا کھا کر گذر گئے، کچھ سردی کی شدت سے اینٹھ کر مر گئے (اس فوج نے) بڑی بے حیائی سے حملہ کیا اور (شہریوں کو) بے آبرو کیا، غلّہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے، اِن غارت زدوں (کی فریاد) کا شور و ہنگامہ ساتویں آسمان تک پہنچ رہا تھا، مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، اِستغراق کے باعث سُنتا نہیں تھا۔ ہزاروں خانہ خراب عین اِس بھڑکتی آگ میں دل پر داغ لیے ترکِ وطن کر کے جنگل کی طرف چل دیے۔ مگر راستے ہی میں چراغِ صبح گاہی کی طرح مر گئے۔ بہت سے مجبوروں کو وہ ظالم اپنے رکاب میں ڈال کے دائرۂ لشکر میں قیدیوں کی طرح لے گئے۔ ان جفا کاروں کا دَور دورہ تھا، دست درازی کرتے، لوٹتے کھسوٹتے، خوب دولت بٹورتے، عورتوں پر ہاتھ صاف کرتے، اپنی تلواریں لیے مال پر قبضہ کرتے پھرتے۔ شہریوں سے کچھ نہ بن پڑتا تھا کیوں کہ اُن کے جی چھوٹ گئے تھے۔ کوئی مضطرب ہوتا تھا، کوئی حیران تھا، ہر گھر میں ایک بد باطن، ہر کوچے میں قتل گاہ۔ آزار و گیر و دار عام تھی، ہر طرف خوں ریزی، ہر سمت سزا ہی۔ چٹکیاں لیتے تھے، طمانچے مارتے تھے۔ غریب لوگ خوف سے سہمے جاتے تھے اور یہ لُٹیرے ملندریاں مارتے پھرتے تھے۔ گھر جل گئے، محلّے ویران ہو گئے۔ سینکڑوں چوب کاری (ایک طرح کی سزا) کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ کسی کی فریاد سُننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک عالم اُن کے ستم سے ہلاک ہو گیا، مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پُرانے شہر کا علاقہ جسے (رونق و شادابی کے باعث) "جہانِ تازہ" کہتے تھے۔ کسی گری ہوئی منقّش دیوار کے مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے۔ ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہو رہی یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی

تھی، سیاہی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو مظلوم مرگیا (وہ گویا) آرام پاگیا، (اور) جو اُن کی زد میں آگیا وہ بچ کے نہ جا سکا۔ میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا، اب اور زیادہ مفلس ہوگیا۔ افلاس اور تہی دستی سے میرا حال بہت ابتر ہوگیا۔ سڑک کے کنارے جو میرا تکیہ (مکان) تھا وہ بھی ڈھے کر برابر ہوگیا۔ غرض کہ وہ بے مروّت سارے شہر کو لاد کر لے گئے اور شہر کے لوگ ذلّت (و رسوائی) اُٹھا کر جان سے گذر گئے۔

مرہٹے پھر آپہنچے

ابھی اِنھوں نے لوٹ مار بند نہ کی تھی جو مشہور ہوا کہ مرہٹوں کی فوج جو ہار کر بھاگی تھی دوسرے لشکر کے ساتھ جو میوات میں تھا، مل گئی ہے اور اب اُس کے ارادے ناپاک ہیں[۱]۔ شاہ (ابدالی) نے یہ خبر سُن کر اُن کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ شاہ جہاں (ثانی) کو جو چند مہینے کی

---

[۱] اس پُر آشوب زمانے میں سلطنتِ مغلیہ کے چپّے چپّے پر سازشیں اور بغاوتیں ہو رہی تھیں ایک معمولی سردار بھی ہندستان پر بادشاہت کرنے کے خواب دیکھتا تھا، خود قلعۂ شاہی کے امرا نے بادشاہ کو کٹھ پتلی بنا رکھا تھا اور آئے دن اُکھاڑ پچھاڑ میں مصروف رہتے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی تھی، بھرت پور اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں جاٹ سر اُٹھا رہے تھے، اودھ میں روہیلے اپنی مضبوط ریاست بنا چکے تھے مگر ان سب سے زیادہ طاقت مرہٹوں نے حاصل کرلی تھی جو اُس وقت برار سے سندھ تک پھیلے ہوئے تھے۔ عماد الملک اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے مرہٹوں کا دست نگر تھا اور اُس نے سلطنتِ دہلی کے کاموں میں رفتہ رفتہ مرہٹوں کو دخل کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نجیب الدولہ کے استیصال کی فکر میں لگا ہوا تھا، جسے ابدالی اپنا مختار بنا کر قلعہ دہلی میں چھوڑ گیا تھا چنانچہ اس نے ستمبر (۱۷۵۷ء) میں نجیب الدّولہ کو دہلی سے نکال دیا، اور دتّا سیندھیا کو سوا لاکھ فوج کے ساتھ اُس پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ نجیب الدّولہ نے ایک طرف تو شجاع الدّولہ، حافظ رحمت خاں اور احمد خاں بنگش وغیرہ سے کمک طلب کی تاکہ اپنی ریاست کو محفوظ کر سکے اور دوسری طرف ابدالی کو لکھ بھیجا کہ مرہٹے اسلامی سلطنت کا نام و نشان مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں اس وقت آپ کی مدد کی شدید ضرورت ہے۔ مرہٹوں نے ایک ہی دن میں ایک ہزار تین سو گانو جلا کر خاکستر کر دیے۔ اور سکّرتال (مظفر نگر) میں آ کر صف بند ہوگئے۔ (باقی آگے)

سلطنت کا گنہ گار تھا، قدیم دستور کے مطابق سلاطین میں بھیج دیا، (یعنی قلعہ

دہلی سے عالمگیر ثانی نے بھی ابدالی کو خط لکھا تھا کہ عماد الملک میرے خاندان کو اور مجھے قتل کرنے کی سازشیں کر رہا ہے۔ مگر ابدالی اُن دنوں خود اپنی سلطنت کی اندرونی شورشوں کے فرو کرنے میں لگا ہوا تھا اس نے یہی جواب دیا کہ میں یہاں کے کچھ سرکشوں کو کیفر کردار تک پہنچا دوں پھر آپ کی مدد کے لیے بھی آتا ہوں۔ آخر وہ اکتوبر ۱۷۵۹ء میں لاہور پہنچ گیا اور مرہٹوں کو وہاں سے بھگا کر اپنے وزیر شاولی خاں کے بھانجے کریم داد خاں کو گورنر مقرر کیا۔ ۲۷ر نومبر (۱۷۵۹ء) کو سرہند اور وہاں سے سید صادق آیا۔ عماد الملک کو اس کے آنے کی خبر ملی تو اُس نے عالمگیر ثانی کو (۲۹ر نومبر) اور انتظام الدولہ وزیر (۳۰ر نومبر) کو قتل کرا دیا اور پھر سورج مل کے قلعوں میں جا بیٹھا۔

ادھر دتا سیندھیا نجیب الدولہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، اُس نے ۲۰ر دسمبر کو جمنا عبور کی، اُس وقت ابدالی انبالے میں تھا، وہ قریب آیا تو تاراوڑی کے مقام پر دونوں فوجوں میں شدید مقابلہ ہوا (۲۴ر دسمبر) اور چار سو مرہٹے مارے گئے۔ دتا بھاگ گیا۔ ابدالی کی فوج جمنا پار کر کے نجیب الدولہ سے آملی، حافظ رحمت خاں، عنایت خاں، دوندے خاں، سعد اللہ خاں وغیرہ سرداران مشرق بھی ابدالی فوج کے شریک ہوئے اور ۹ر جنوری (۱۷۶۰ء) کو جمنا پار کر کے براری گھاٹ کے قریب مرہٹوں کو پھر گھیر لیا۔ اس میں دتا سیندھیا مارا گیا اور اس کا بھانجا جھنکوجی سخت زخمی ہوا۔ اُدھر ملھار راؤ ہلکر کچھ اور فوج لے کر آگیا اور دتا کی بھاگی ہوئی فوج راجپوتانے میں جا کر اُس سے مل گئی اور بلا ہی بالا روہیل کھنڈ کی طرف حملہ آور ہوئی۔ ۲۶ر جنوری (۱۷۶۰ء) کو یہ فوجیں جمنا کے پار اُتریں اور چاہتی تھیں کہ نجیب الدولہ کا دس لاکھ روپیہ جو آرہا تھا راستے ہی میں لوٹ لیں، مگر جہاں خاں نے بر وقت مدد کی اور مرہٹوں کو سکندرہ کے قریب شکست دے کر خزانہ بچا لیا (۴ر مارچ) سخت گرمی اور برسات کے باعث ابدالی علی گڑھ کے قریب ٹھہر گیا اور نجیب الدولہ کو اپنی جانب سے شجاع الدولہ پر چڑھا کر بھیج دیا۔ شجاع الدولہ ۲۰ ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ فوج لے کر ابدالی سے آملا۔ دتا اور ملھار کی شکست سے پیشوا نا امید نہیں ہوا، اب کی بار اس نے اپنے بیٹے اور جانشین وشواس راؤ کی سرکردگی میں بھاری سپاہ بھیجی جس میں توپ خانے کا نگراں ابراہیم خاں گردی تھا جو مشہور ماہر جنگ بوسی BUSSY کا تربیت یافتہ تھا۔ سداشیو بھاؤ بھی فوج کا سربراہ تھا۔ ۱۳ر جنوری ۱۷۶۱ء کو ہندستان کی وہ عظیم جنگ ہوئی جسے تاریخ میں "تیسری جنگ پانی پت" کہا جاتا ہے۔ اور جو مہا بھارت یُدھ کے بعد سب سے بڑی اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس کا حال میر نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں تیس ہزار سے زائد مرہٹے ہلاک ہوئے۔ ۲۲ ہزار کے قریب گرفتار کیے گئے۔ اور بے شمار زخمی ہو گئے۔ دو لاکھ مویشی ہاتھ لگے، جن میں پانچ سو ہاتھی تھے۔ (باقی آگے)

سلیم گڑھ میں قید کر دیا) اور عالی گوہر[1] کے لڑکے جواں بخت کو اُس کا ولی عہد مقرر کر کے شہر سے کوچ کیا۔ عماد الملک مرہٹہ سرداروں کے ہمراہیوں کو چھوڑ کر سورج مل کے قلعوں میں آ کر بیٹھ گیا۔ جب شاہ (ابدالی) میوات کے نواح میں پہنچا اور مرہٹوں نے دیکھا کہ ہمارا حملہ کارگر نہیں ہوتا اور فوج سہم گئی ہے، تو وہ اپنے قدیم معمول کے مطابق گوریلا جنگ کرتے ہوئے شاہ جہاں آباد (دلّی) تک آئے اور دریا عبور کر گئے۔ شاہ بھی تعاقب میں پہنچ گیا اور رات شہر کے سواد میں بسر کر کے (صبح کو) پایاب راستے سے پار اُتر گیا۔ جب دریا کے اُس پار اپنا لشکر جما لیا تو (اس کی) فوج کا سردار جہاں خاں آگے بڑھا اور سکندر آباد کے قریب ملہار کی فوجوں سے، جس کا حال آگے لکھا جا چکا ہے، بھڑ گیا۔ شاہ (ابدالی) بھی یہاں سے تین ہزار لشکریوں کے ساتھ سوار ہو کر دو گھڑی میں اُس سے جا ملا۔ اُدھر کا سردار (ملہار) مقابلے کی تاب نہ لا کر مرہٹہ سرداروں میں سے ایک کو اپنا قائم مقام بنا کر چپکے سے کھسک گیا۔ اُس (مرہٹہ) سردار نے بہادری کے جوہر دکھائے اور (لڑتے لڑتے) مارا گیا۔ دوسرے لوگ زِچ ہو کر فوج شاہی کے بہادروں کے آگے سے اُکھڑ گئے اور بھاگ کر تتر بتر ہو گئے۔ شاہ (ابدالی) کول تک جو ایک مشہور قصبہ ہے، اُن کے تعاقب میں گیا۔ ان بھگوڑوں نے سورج مل کے قلعوں میں پناہ لی اور دو تین دن کے بعد آگے روانہ ہو گئے۔ شاہی فوج اُس کے قلعوں میں سے ایک قلعے پر جو دریائے جون کے اِس طرف تھا، دھرنا دے بیٹھی، اور محاصرہ کر کے لوگوں کا

زر و جواہر کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ۲۹ر جنوری (۱۷۶۱ء) کو احمد شاہ دلّی آ گیا اور ممتاز محل میں مقیم ہوا۔ ابدالی فوجوں نے دلّی کو پھر لوٹ کر برابر کر دیا۔ ۲۲ر مارچ (۱۷۶۱ء) کو ابدالی مع افواج کے افغانستان چلا گیا۔ ہندستان پر ابدالی کا یہ پانچواں حملہ تھا۔

[1] شاہ عالم کا لقب عالی گوہر تھا، (مقدمۂ نادراتِ شاہی) یا تو میر سے سہو ہوا ورنہ بخوبی ممکن ہے متن کے مُرتّب (مولوی عبدالحق) سے یہ تسامح ہوا ہو۔

ناک میں دم کر دیا۔ زمین دار مذکور (سُورج مل) نے اُن کی امداد اپنی بساط سے باہر دیکھ کر تغافل اختیار کر لیا۔ ناچار محصورین موقع پاتے ہی رات کو بھاگ نکلے اور اپنا سفیر بھیج کر اُن سے صلح کر لی۔

(سانحہ) ابھی فوج دوآب کے بیچ میں تھی جو یہ خبر پھیلی کہ (مرہٹوں کی) ایک بڑی بھاری فوج جنگ کے ارادے سے نواحِ اکبر آباد تک آگئی ہے، اور یہاں تک آیا ہی چاہتی ہے۔ نجیب الدّولہ پورب کے سرداروں، مثلاً شجاع الدولہ، احمد خاں (بنگش) و حافظ رحمت (خاں روہیلہ) وغیرہ کو (شاہ کی) ملازمت میں لایا اور ہر ایک کو مُلک دینے کے وعدے سے خوش کر کے (شاہ سے) خلعت دلائی اور (مرہٹوں سے) جنگ کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

اس عرصے میں بھاؤ جو مرہٹوں کا سب سے بڑا سردار تھا اپنے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ سورج مل کے علاقے سے گذرا۔ اور اُس نے وزیر (عماد الملک) اور وہاں کے راجا (سُورج مل) کو بہلا پھُسلا کر اپنے ساتھ کر لیا اور شہر پر قابض ہوگیا۔ یعقوب علی خاں، جو شاہ دُرّانی کے وزیر شاہ ولی خاں سے قرابت رکھتا تھا شاہی قلعہ میں اِس توقع پر کہ شاہ (ابدالی) کی فوج دریا کے اُس طرف موجود ہے، اور مدد میں دریغ نہ کرے گی، گھمنڈ میں آکر (مرہٹوں سے) جنگ میں گُتھ گیا۔ دکنی فوج نے (قلعے کا) محاصرہ کر کے توپوں پر قبضہ کر لیا۔ اکثر مکاناتِ شاہی جو خوبصورتی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، خاک سے یکساں کر دیے۔ چوں کہ دریا برسات کے باعث پار کرنا مشکل تھا، اور شاہ (ابدالی) اس سے گذر نہیں سکتا تھا۔ خان مذکور (یعقوب علی خاں) راجا سے صلح کر کے قلعے سے باہر نکل آیا۔ عہد و پیمان کی وجہ سے کوئی اُس کے احوال سے مزاحم نہ ہوا۔

دلّی سے میرا کوچ

اُن دنوں میں راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض

کی کہ زمانے کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں چاہتا ہوں کہ اِس شہر سے نکل جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں، ممکن ہے اِسی طرح کچھ آسودگی نصیب ہو جائے۔ اُنھوں نے (میرے ساتھ) رعایت کی اور مجھے رخصت کر دیا۔ میں بال بچوں کو لے کر (پیادہ پا) نکلا، کوئی منزل تو مدِّنظر تھی نہیں، خدا پر بھروسا کر کے راستہ طے کرنا شروع کر دیا۔ دن بھر میں بڑی مشکل سے ۸-۹ کوس منزل سر ہو سکی۔ رات ایک سرائے میں درخت کے نیچے گذاری۔ اگلی صبح کو راجا جگل کشور کی (جس کی حال لکھا جا چکا) بی بی اُدھر سے گذریں اور ہم مجبوروں کی دستگیری کی۔ اپنے ساتھ بَرسانہ تک جو ہندوؤں کا تیرتھ اور سورج مل کے قلعوں سے آٹھ کوس اِدھر ایک قصبہ ہے، لے آئیں اور طرح طرح کے سلوک کر کے دل جوئی کی۔

برسانہ

ذی الحج کی آخری تاریخ کو وہ کاماں گئیں جو اُس جگہ (برسانہ) سے تین کوس پر ایک شہر راجا جے سنگھ (والیٔ جے پور) کی سرحد میں ہے۔ بندہ (میرؔ) اپنے اہل و عیال کے ساتھ عشرۂ (محرم) میں وہیں[1] مقیم رہا، اور عاشورے سے اگلے دن (۱۱ر محرم) وہاں سے نکل کر کُمھیر پہنچا۔ [۱۱- اگست ۱۷۶۱ء]

کُمھیر

یہاں بہادر سنگھ نامی، لالہ رادھا کشن کا بیٹا، جو پہلے صفدر جنگ کی خزانچی گری رکھتا تھا اور ان دنوں راجا کے ساتھ تھا ایک شام کو آیا اور میری دستگیری کر کے آدمیت کا سلوک کیا میں اُس کا احسان مند ہوں کہ سوائے واقفیّت کے میرا اُس پر کوئی حق نہ تھا، یوں کچھ دن سُکھ چین سے بسر ہو گئے۔

(حکایت) میں ایک دن کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے باعث پریشان بیٹھا تھا۔ جی میں آئی کہ اعظم خاں کلاں جو فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے عہد میں شش ہزاری امیر، اور نہایت کریم النفس انسان تھا، اُس کے لڑکے اعظم خاں

۱؎ وہیں سے میرؔ کی مراد برسانہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے یہاں غلط عنوان قائم کیا ہے۔

سے اگر ملا جائے تو شاید (وہ امداد کرے اور) کچھ دن سُکھ سے گذر جائیں۔ (چناں چہ) گیا اور سورج مل کے طویلے میں اُس سے ملا جو دہلی کے خانہ خرابوں کی نئی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ اُس عزیز نے، خدا بخشے، میری خیر و عافیت معلوم کی۔ میں نے اپنا دُکھڑا سنایا (تو) سُننے والوں کے ہوش اُڑ گئے۔ جب قہوہ اور حقّہ لایا گیا، تو یہ شعر برجستہ (میری) زبان پر آیا ؎

امروز کہ چشمِ من و عُرفی بہم اُفتاد
باہم نگریستیم و گریستیم و گذشتیم[1]

ایسے ہی چند شعر میں نے پڑھے، اور دو تین آنسو پلکوں سے گرائے۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ خان فکر مند ہے، میں نے کہا "آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟" بولا: "کچھ نہیں" میں نے کہا: "کچھ تو ہے!" کہنے لگا: "جب تم شہر (دہلی) میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائیاں اور قسم قسم کے حلوے منگاتے اور دونوں کھاتے تھے۔ آج کیسا اتفاق ہے کہ کچّی کھانڈ بھی مُیسّر نہیں جو تمھارے لیے ایک پیالہ شربت بنا سکوں۔" میں نے کہا: "میں اِن سب چیزوں کا ندیدہ نہیں ہوں، وہ بات بھی تفریحاً ہو جاتی تھی آپ تو جانتے ہیں کہ میں حریص اور لالچی نہیں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے وہ شربت و شیرینی کا وقت تھا یہ تلخیاں جھیلنے کا موسم ہے۔"

یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک عورت سر پر خوان رکھے دروازے سے داخل ہوئی اور بولی: "سعدالدین خاں خان[2] ساماں کی بہن نے (آپ کو)

---

[1] (ترجمہ) آج (جب) میرا اور عرفی کا سامنا ہوا (تو) ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا، روئے اور چل دیے!

[2] اس سے پچھلے صفحات میں یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ راجا ناگرمل اور سعدالدین خاں خان ساماں وغیرہ اپنی حفاظت کے خیال سے سورج مل کے قلعوں میں منتقل ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خان ساماں مع اپنے خاندان کے منتقل ہوا تھا۔ یہ سعدالدین خاں ثانی ہے جس کا نام حفیظ الدین تھا۔ (باقی بر صفحہ آیندہ)

دعا کہی ہے کچھ 'حلوای نزاکت' اور شنبہ کی شیرنی بھیجی ہے۔" خان نے خوان پوش اُٹھایا اور حلوے پر نظر پڑی تو باغ باغ ہوگیا کہنے لگا: "یہ رُوسیاہ تو اپنی قدر خوب جانتا ہے ایک عمر سے فاقہ کشی پر مدار ہے، حلوے اور شیرنی کا تو ذکر کیا، کبھی کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا یا پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں آیا۔ تم میرے عزیز مہمان ہو، یہ سب تمھارا ہے۔ میرا حصّہ مجھے دے کر باقی سب اپنے گھر بھیج دو۔" میں نے کہا: "یہ تو بہت ہے میں (اتنے سارے کا) کیا کروں گا۔" کہنے لگا: "تمھارے بیٹے میر فیض علی کے کام آجائے گا۔" غرض کے اُس بھلے مانس نے اِصرار کر کے حلوے کی قاب اور مٹھائی کا خوان میرے گھر بھجوا دیا اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ دو دن تک اُسی مٹھائی پر گذر ہوئی۔ تیسرے دن راجا کے چھوٹے لڑکے (بِشن سنگھ) نے مجھے بُلایا اور حالات دریافت کرنے کے بعد کہا کہ "راجا صاحب کے آنے تک تم میرے پاس رہو۔" میں نے کہا: "اَسبابِ معیشت مفقود ہے۔"[۵] تو بولا: "مطمئن رہو یہاں سب مِل جائے گا۔" باغِ کرم کا وہ گُلِ نَو (دمیدہ) خدا اُسے شاداب اور خوش رکھے، میری ضروریات کا سارا سامان ہنسی خوشی بھجواتا رہا۔

جنگِ پانی پت
۱۱۷۴ھ — ۱۷۶۱ء

(سانحہ) یہاں یہ سُننے میں آیا کہ شہر (دلّی) میں اَفواہ (پھیلی ہوئی) ہے کہ سرہند کا فوجدار صمد خان کچھ زمینداروں اور بھاری فوج کے ساتھ آرہا ہے اور شاہی لشکر (سے مقابلہ کرنے) کا ارادہ رکھتا ہے۔ دکھنی فوج کا سردار بھاؤ بڑا ہیکڑ جوان تھا اور اپنے آگے کسی کو نہ گردانتا تھا۔ (اُس نے) فالتو سامان چھوڑ کر اپنے مزاج کی تیزی کے اِقتضا پر

سعدالدین خاں اوّل کا انتقال دلّی میں ۹ رجب(جمادی) الاولیٰ ۱۱۵۶ھ (یکم جولائی ۱۷۴۳ء) کو ہو چکا تھا (تاریخ محمدی: ۱۲۱) عہدۂ خانساماں کی تفصیل اور تعریف کے لیے دیکھیے: مغل ایڈمنسٹریشن: ۱۲۲۔ [۵] اُس وقت ملازمت کرنے کو گھوڑا، ہتھیار وغیرہ اپنے پاس سے فراہم کرنا ہوتے تھے اِس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

اُدھر بڑھنا شروع کیا، اُس کے دل میں یہ تھی کہ وزیر کے پاس بہت سازو جواہر ہے، اور سورج مل بڑا زمیندار ہے، اگر زمانہ مُہلت دے تو وہ اُن سے کچھ نہ کچھ اینٹھ لے گا۔ راجا ناگر مل کو اُس کے سرداروں سے ملاقات کرنے کے سبب یہ بات معلوم ہو چکی تھی۔ ایک دن اُس نے راجا کو پیغام بھیجا کہ میں ممالکِ محروسہ کا بندوبست تمھارے اختیار میں چھوڑتا ہوں۔ اُس عزیز نے اِس بات پر غور کر کے جواب دیا کہ میں مدّت سے وزیر کے ساتھ ہوں یہ مناسب نہیں کہ وہ ناکام رہے اور میں اپنا اُلّو سیدھا کر لوں، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اُسے بھرت پور کی دستوری مرحمت ہو جائے۔ میں اور سورج مل بطورِ مُشایعت جائیں اور اُسے چھوڑ کر آپ کے کہنے کے موافق عمل کریں۔،، غرض اُس نے چکنی چپڑی باتیں بنا کر اور روغنِ قاز مل کر (اُسے ہموار کر لیا) دکھنیوں کے کوچ کے دن وہ خود اور سورج مل مذکور بہانے سے بَہیر اور بُنہ کے ساتھ اُن کے لشکر سے دلیرانہ نکلے اور بَلَم گڑھ میں، جو شہر سے بارہ کوس پر ایک مضبوط قلعہ ہے، آکر بیٹھ گئے۔ وزیر کو مع خیمہ و اسباب کے آگے چلتا کیا۔ دکھنی فوج کے وکیلوں نے ہر چند خوشامد کی، لیکن اُنھوں نے ایک نہ سُنی اور بادشاہ سے جا کر مل گئے۔ دکھن کا سردار جو واقعی بڑا جیالا تھا اور اپنے بھاری لاؤ لشکر اور زبردست ساز و سامان اور ہتھیاروں کے سامنے اُن کی جمعیّت کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اُس نے جب یہ سُنا تو تاؤ میں آگیا اور کہنے لگا: ''یہ کیا چیز ہیں؟ اِن کی حکومت کا چراغ ایک پھونک کا ہے۔ میں اِن کے بھروسے پر دکھن سے نہیں آیا ہوں۔ اِنھیں تو چٹکیوں میں مَسل دُوں گا۔،، اِس حرکت کے تدارک کو تو اُس نے پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھا اور جا کر نجابت خاں روہیلہ کے قلعہ پر قبضہ کر کے کھڑے کھڑے صمد خاں کو مار ڈالا اور اُس انبوہ کو تتر بتر کر دیا۔ اِس فوج کے بارہ باٹ ہو جانے سے مرہٹوں کی ہمّت بندھ گئی اور اُنھوں نے وہاں

سے پلٹ کر پانی پت کے قریب مورچے بنا لیے اور بادشاہ کی فوج سے کھلی جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ جب جون ندی کا پانی ذرا اُتر گیا تو شاہ (ابدالی) بڑے جوش و خروش سے پورب کے سرداروں کے ساتھ دریا کے پار اُترا اور اُن پر حملہ آور ہوا۔ باقاعدہ جنگ چھڑنے سے چند روز پہلے خبر ملی کہ گوبند پنڈت بھاری سپاہ کے ساتھ آرہا ہے اور مرہٹوں کی فوج سے ملنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ (ابدالی کی فوج کے) ایک سردار نے شاہی لشکر سے جُدا ہو کر اُسے چُپکے سے جا گھیرا اور ہلاک کر دیا۔ اُس کا سارا سامان لوٹ لیا اور لشکر تِتّر بِتّر ہو گیا۔

اُسی زمانے میں راجا (ناگرمل) کُمھیر میں جو سورج مل کا قلعہ ہے، دوبارہ تشریف لائے۔ قسمت کی بات کہ میں اُن دنوں وہیں تھا۔ (اُن کی خدمت میں) گیا اور التماس کیا کہ "میں آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا اب مجھے اجازت دیجیے کہ کہیں نکل جاؤں کیونکہ ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔" (راجا نے) از راہِ عنایت جو وہ میرے حال پر فرماتے تھے کہا: "معلوم ہوتا ہے 'بیابان مرگ' ہونے کا اِرادہ ہے، مگر میں جانے دوں جب نا!۔" اُسی دن خرچ کے واسطے کچھ بھیجا اور میرا وظیفہ بدستورِ سابق دستخط کر کے عنایت کیا۔

اُس بزرگوار (راجا) نے یہیں سکونت اختیار کر لی کیونکہ اب شاہجہاں آباد ایک ویرانے سے زیادہ نہیں ہے اور لوگ سال میں دو بار اُجڑ رہے ہیں۔ آخر کوئی کب تک خانہ بدوش رہے۔ یہ علاقہ ایک طرح سے گوشۂ عافیت ہے یہاں کا رئیس بھی خوش حال ہے اور مغرور نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے بھی اُس کے سایۂ دیوار میں اپنا ٹھکانا کر لیا اور وہیں پڑ گئے۔

(سانحہ) دونوں لشکروں کی حقیقت (سُنیے) کہ مرہٹے اگر اپنے قدیم دستور کے مطابق جنگِ گُریز کرتے تو عین ممکن تھا کہ غالب آجاتے۔ مگر وہ توپ خانے جمع

کر کے بیٹھ گئے اور شاہی فوج نے یہ فکر رکھی کہ اُن کی رسد نہ آنے پائے۔ جب (رسد نہ آنے سے) پریشانی بہت بڑھ گئی تو مرہٹہ سردار جنگ پر آمادہ ہوا اور اُس کے (ساتھی) سردار حصار اور مورچوں سے باہر آکر ڈٹ گئے۔ (ابدالی فوج کے) جگر دار بھی اُن کے درپئے آزاد ہو کر جی توڑ کوشش کرنے لگے۔ بہادروں نے پیچھے ہٹ کر تنظیم کے ساتھ ہلّہ بولا اور دلیروں نے متحد ہو کر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ آزمودہ کاروں نے بندوقیں سنبھال لیں اور مقابلہ پر جم گئے۔ مقابل دستے والے تلواریں سُونت کر ٹوٹ پڑے۔ معرکۂ کشت وخون کے زبردست پہلوان لڑنے مرنے کو مہیا ہو گئے۔ 'پیش جنگوں' نے پیادہ ہو کر لڑنا شروع کیا اور لڑائی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جوانوں کے کاری زخم لگے اور (بہت سے) ہلاک ہو گئے۔ جیالے جنگ آور دونوں طرف سے پل پڑے اور تفنگ لے کر (ایک دوسرے پر) حملہ کرنے لگے۔ دکھن کا سردار پامردی کے ساتھ میدان میں آیا اور اُس نے شاہی فوج کے بہت سے دستوں کو مار بھگایا۔ لیکن فتح تو شاہ کے لیے (مقدر ہو چکی) تھی اِن کی کوششوں سے کچھ بھی نہ ہوا۔ بہتیری بندوقیں چلاتے تھے مگر اُدھر کے ایک آدمی پر بھی اثر نہ کرتی تھی۔ (اُن کی) فوج کے بہت سے کارآمد سپاہی اِدھر کے معمولی تفنگ اندازوں کے ہاتھ سے زخمی ہو گئے۔ چنانچہ تیروں کے پہلے ہی ہلّے میں ایک تفنگ وِسواس راؤ کے لگا جو (مرہٹہ) ریاست کا ولی عہد تھا اور وہ خاک وخون میں لوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ بھاؤ بڑا غیور جوان تھا اور دادِ مردانگی دے رہا تھا۔ جب اُس نے اپنی آنکھوں سے یہ سانحہ دیکھا تو کہنے لگا کہ اب دکھن جانے کا مُنھ نہیں رہا۔ جان سے ہاتھ دھو کر بڑی دلیری کے ساتھ (ابدالی) فوج کے قلب پر جا پڑا یعنی جان بوجھ کر اپنے تئیں موت کے مُنھ میں ڈھکیل دیا۔ ملھار جو 'گُرگِ باران دیدہ' تھا وہاں سے دو تین ہزار سواروں کو ساتھ لے کر بھاگا باقی تمام لشکر غارت ہو گیا۔ جو سردار زندہ بچے وہ بھکاریوں کے سے حال میں ننگ دھڑنگ پھر رہے تھے

ہزار ہزار بھگوڑے سپاہیوں کے ہتھیار اور گھوڑے اطرافِ شہر (پانی پت) کے دس دس زینداروں نے مل کر چھین لیے کیا لکھوں کہ کیسا روزِ بد اِس قوم کو دیکھنا پڑا۔ ہزاروں ننگے (سپاہی) روتے ہوئے جس راستے سے گذرتے تھے (لوگوں کے لیے) عبرت کا سامان نظر آتے تھے۔ گانو کے لوگ بھنے ہوئے چنے سب کو ایک ایک مٹھی تقسیم کرتے تھے اور اُن کی تباہ حالی کا اپنے حال سے موازنہ کر کے (خدا کا) شکر ادا کرتے تھے۔ ایسی (عبرت انجام) شکست کسی کو کم ہی ہوئی ہوگی۔ بہت سے بھوک سے مر گئے، اور بہتوں نے ٹھنڈی ہوا سے اکڑ کر جان دے دی، جو فوج یہ قلعہ میں چھوڑ آئے تھے شاہی فوج کی لوٹ مار کے خوف سے رات کے وقت بھاگ گئی۔ کروڑوں روپے کا سامان شاہ (ابدالی) کے اور پورب کے سرداروں کے ہاتھ لگا جسے اُنھوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ نقد و جنس کے علاوہ توپ خانہ اور دوسرا جنگی سامان، ہاتھی، بیل، گھوڑے اور اونٹ شجاع الدولہ وغیرہ نے اپنے حصّے میں لے لیے۔ دُرّانی (سپاہی) جو فقیرِ محض تھے مالا مال ہو گئے۔ ہر دِہ باشی، کو سَو اونٹوں کا بار ملا اور ہر نفر کو دو خروار۔ بڑی دولت ہاتھ لگ گئی۔ ہر شخص پھولا نہ سماتا تھا۔ شاہ ابدالی اِس شاندار فتح کے بعد جو شاہانِ سَلَف میں سے بھی کسی کو میّسر نہ آئی ہوگی بڑے کرّ و فرّ کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور اطراف کے سرداروں کے نام فرمان بھیجے کہ آئیں اور نوکری کریں۔

ناگر مل کی نیابتِ وزارت

ایک تحریر راجا (ناگر مل) کے پاس بھی پہنچی۔ وہ یہ سوچ کر کہ شاہ (ابدالی) ہندستان کا بادشاہ ہوگیا ہے اور اب اِس زرخیز مُلک سے واپس نہ جائے گا اور ہمیں بہرحال نوکری کرنی ہی ہے، چلا گیا۔ نجیب الدولہ پیشوائی کے لیے آکر لے گیا۔ شاہ کی ملازمت اُس کے وزیر شاہ ولی خاں کے ذریعے حاصل کی۔ یہ ملاقات خوشگوار رہی۔ (شاہ نے) اپنی مُہر حوالے کی اور نیابتِ وزارت کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ چنانچہ وہ اُمرائے عِظام کی بہبودی کا سبب ہوئے

شجاعُ الدّولہ سے صفائی اور میرا سفر

وزیر (شاہ ولی خان) نے ایک بار کہا کہ شجاع الدّولہ کے باپ تم سے بہت اخلاص رکھتے تھے اور یہ ابھی بچّہ ہے، سوائے گھمنڈ اور خود نمائی کے کچھ نہیں جانتا۔ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ (ابدالی) بادشاہ ہے اور ذرا سی شوخی میں ایک عالم تہ و بالا کر دیتا ہے محتاط رہنا چاہیئے۔ اِس قسم کی ہیکڑی سے اُسے نہایت چڑ ہے، رفاقت کا خیال کر کے کچھ نہیں کہتا مگر اِس پر بھولنا نہیں چاہیئے:

پادشاہان و نکویان دو گروہے عجَب اند
کہ نبودند و نباشند بفرمانِ کسے

(بادشاہ اور نیکو کار یعنی درویش یہ دُو عجیب گروہ ہیں کہ نہ یہ کسی کے تابعِ فرمان کبھی ہوئے ہیں نہ ہوں۔)

بہتر یہ ہے کہ تم اور نجیب الدّولہ جا کر اُسے سمجھا دو ورنہ کل کلاں کو کچھ بات ہوئی تو ہم ذمّہ دار نہیں۔ چنانچہ دونوں گئے اور اُسے معذرت خواہی کے لیے آمادہ کر کے لائے اور وزیر سے اجازت حاصل کی۔ بارے یہ ملاقات خوشگوار رہی اور کدورت صفائی میں بدل گئی۔ میں اِس سفر میں اُن (راجا ناگرمل) کے ساتھ تھا۔

دلّی پھر لُٹی

(حکایت) ایک دن میں ٹہلنے نکلا اور شہر کے تازہ ویرانوں سے گذرا۔ ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھا حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کر سکا، کسی گھر کا پتا تھا نہ کسی عمارت کے آثار۔ نہ اُن کے مکینوں کی خبر۔

از ہر کہ سخن کردم گفتند: کہ این جا نیست
از ہر کہ نشاں جُستم گفتند: کہ پیدا نیست

(جس کے بارے میں بھی معلوم کیا یہی جواب ملا کہ یہاں نہیں ہے، اور جس کا پتا نشان

پوچھا، (لوگوں نے) یہی کہا "کچھ خبر نہیں۔")
گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ۔ خانقاہیں صوفیوں سے خالی۔ خرابات رندوں سے۔ یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لَق دَق۔

ہر کجا اُفتادہ دیدم خِشت در ویرانہ ای
بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانہ ای

(میں نے کسی کھنڈر میں جو اینٹ پڑی دیکھی وہ کسی صاحبِ خانہ کے احوال کا ایک ورَق معلوم ہوتی تھی۔)
نہ وہ بازار (تھے) جن کا بیان کروں۔ نہ بازار کے وہ حسین لڑکے۔ وہ حُسن کہاں جس کی پرستش کیا کرتا تھا، وہ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے؟ جوانانِ رعنا گذر گئے، پیرانِ پارسا چلے گئے۔ (بڑے بڑے عالی شان) محل خراب (ہو گئے) گلیاں معدُوم ہو گئیں اور ہر طرف وحشت برس رہی تھی۔ اُنس ناپید (تھا)۔ ایک اُستاد کی رُباعی مجھے یاد آگئی۔

اُفتاد گذارم چو بویرانۂ طوس — دیدم چُغدے نشستہ برجائے خروس
گفتم چہ خبر داری ازین ویرانہ؟ — گفتا: "خبر اینست کہ افسوس افسوس"

(میرا گذر شہرِ طوس کے ویرانے سے ہوا۔ میں نے دیکھا کہ مرغ کی جگہ ایک اُلّو بیٹھا ہوا ہے اُس سے میں نے کہا کہ اِس ویرانے کا کچھ حال بتا۔ کہنے لگا بس یہی معلوم ہے کہ "افسوس افسوس"۔)
ناگاہ اُس محلّے میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا، جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گذارتا تھا، راتوں کو روتا تھا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا تھا، اُن کے حُسن کی تعریفیں کرتا تھا، اور لمبی لمبی زُلفوں والے (معشوقوں) کے ساتھ رہتا تھا۔ حسینوں کی پرستش کیا کرتا تھا اگر پل بھر کو بھی اُن سے جدائی ہوتی تو بے قرار ہو جاتا تھا،

محفل سجاتا تھا۔ حسینوں کو بُلاتا تھا، اُن کی مہمان داری کرتا تھا (ایسی رنگین) زندگی گذارتا تھا۔ اب کوئی ایسا مانُوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر کے دل خوش کر لیتا۔ کوئی معقول انسان نہ ملا جس کے پاس جا بیٹھتا۔ پھر اُس وحشت گاہ سے نکل کر ایک کنارے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے (تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات) دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اُٹھایا اور عہد کیا کہ اب اِدھر نہ آؤں گا اور جب تک یہاں رہوں گا شہر کا رُخ نہ کروں گا۔

ابدالی کی واپسی

(سانحہ) جب یہ طے پایا کہ شاولی خان راجا کے ساتھ جا کر ملک گیری کرے گا تو شاہ ابدالی کی فوج جو مالِ غنیمت سے مالا مال ہو چکی تھی، قلعے کے دروازے پر جمع ہو کر ہنگامہ کرنے لگی اور کہا کہ ہم اپنے گھروں کو جاتے ہیں بادشاہ (ابدالی) یہاں رہنا چاہتا ہے تو رہے۔ ہم تو ایک مدّت سے اِسی مُہم میں لگے ہوئے ہیں بیوی بچّوں کی بھی خیر خبر نہیں۔ شاہ نے سوچا کہ پردیس میں فوج کے بغیر رہنا ممکن نہیں مجبوراً اپنی راجدھانی قندھار کو جانے کا تہیّا کر لیا۔ وزیر نے اپنے خیمے جو وہ آگے بھجوا چکا تھا، واپس منگوا لیے، اور یہاں کے سرداروں سے اُسے شرمندہ الگ ہونا پڑا۔ (اپنی روانگی) سے دو روز پہلے راجا (ناگرمل) اور شجاع الدولہ کو رخصت کیا، شہزادہ جواں بخت کو شاہ عالم کا ولی عہد بنایا، اور شہر کا انتظام نجیب الدّولہ کے سپرد کر کے دلّی سے نکلے۔ راستے میں زین خاں[1] نامی افغان کو جو اُنھیں کے قوم و قبیلے کا تھا، سرہند کا فوجدار بنایا اور لاہور پہنچ گئے۔ چونکہ اِس قوم کا غُرور حد سے تجاوز کر چکا تھا، غیرتِ خداوندی نے اُنھیں سکھوں کے ہاتھوں ذلیل کیا جو (پنجاب کے نَواح میں) بے اَصلوں، جولاہوں، نَدّافوں، بزّازوں، دلّالوں، بقّالوں، نجّاروں، قزّاقوں، کسانوں، کم مایہ لوگوں، سفلوں، جنگلیوں، بازاریوں،

---

[1] زین خاں کا قتل جنوری ۱۷۶۴ء میں ہوا۔

کمینوں، اور تہی دستوں کی ٹولی تھی تقریباً چالیس پچاس ہزار سکھوں نے جمع ہو کر اِس لشکرِ جرّار کا مقابلہ کیا۔ کبھی تو ایسے مقابل آتے کہ زخم پر زخم کھاتے مگر پیٹھ نہ دکھاتے اور کبھی اِدھر اُدھر منتشر ہو کر سَو دو سَو (ابدالی) سپاہیوں کو گھیر کرلے جاتے اور سب کو تہِ تیغ کر دیتے۔ ہر صبح کو فتنہ اُٹھاتے ہر شام کو چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے (غرض اُنھوں نے ابدالی کے) لشکریوں کو ایسا بَوکھلا دیا تھا کہ وہ ہزار جتن سے جان بچا کر بھاگتے تھے، کبھی ظاہر ہوتے اور لشکر پر ٹوٹ پڑتے کبھی سامنے آکر ہلّہ بولتے اور جم کر لڑتے، کبھی شہر پر چڑھائی کرتے اور اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ پریشاں بالوں اور بندھے ہوئے چُٹیلوں کے ساتھ فوج میں آتے تھے رات بھر شور و شر رہتا اور سارا دن فریاد و فغاں (کی ہولناک آوازیں آتیں)۔ اُن کے پیادے سَواروں کے تلوار لگاتے، اور اُن کے گھوڑوں کی زین کو خون میں لت پت کر دیتے۔ اُن کا معمولی سا نوکر (ابدالی کے) تیر اندازوں کو پکڑ کرلے جاتا اور ایذائیں دیتا غرض اِن بے حقیقت کنگالوں نے اُن بے مایہ لوگوں کو ایسا ذلیل و رُسوا کیا کہ اطراف کے سرداروں نے یہ ماجرا سُنا تو اُنھیں نظروں سے گرا دیا۔ (ابدالی فوج میں) مُقاومت کی سکت ہی نہ رہی جان بچا کر نکل بھاگنے کو غنیمت جانا اور اس شہرِ (سرہند) کی نظامت کا خلعت ایک ہندو کو دے کر اپنا رستہ لیا۔ (سکھوں کی فوج کا) یہ انبوہ اُن کے تعاقب میں لوٹ کھسوٹ کرتا ہوا اور دُون کی لیتا ہوا، دریاے اٹک تک اُن کی گوشمالی کرنے گیا۔ پھر اُس صوبے پر قبضہ کر لیا جس کی آمدنی دو کروڑ (سالانہ) تھی۔ کچھ دنوں بعد اس شامت کے مارے ہندو کو جو شہرِ (لاہور) میں مُقیم تھا قتل کر کے بالکل مالک و مختار ہو گئے۔ اب چونکہ ملک کا کوئی دعویدار درمیان میں نہ تھا، ان سب عوام کالانعام نے ملک کو آپس میں بانٹ لیا اور رعایا پر فیاضیاں شروع کر دیں، یعنی حکومت کے طور طریق سے واقف تھے نہیں، کاشتکاروں نے جو کچھ دست برداشتہ دے دیا وہ اِنھوں نے

مُفت جان کر قبول کر لیا۔

سُورج مل کی بَغاوت

(سانحہ) اِس سال سُورج مل، جو بڑا طاقت ور زمیندار ہے اور اُس کے آباؤ اَجداد اُولوالعزم (مُغلیہ) — بادشاہوں کی نوازشوں کے ہمیشہ مَورِد رہے ہیں۔ جب وہ (اِس حقیقت سے) واقف تھا تو آگرہ اور دلّی کے درمیان کی راہداری اُسی سے متعلّق تھی۔ مگر ان دنوں مسلمان اُمرا کی سستی سے (فائدہ اُٹھا کر) اُس نے بغاوت کی اور اکثر محالات پر قابض ہوگیا۔ سیَہ روزگار قلعہ[1] دار کی نمک حرامی سے آگرے کا مضبوط قلعہ بھی ہتیا لیا۔ شاہ عالم نے شُجاع الدّولہ کی تحریک پر، جو اب اُس کا وزیر ہے، بھاری لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور (یہ خبر) زبان زدِ خلق ہوگئی کہ بادشاہ سُورج مل کو نکالنے کے لیے آرہا ہے۔ زمیندار مذکور شہر (آگرہ) اور قلعہ کی حفاظت کے لیے اپنے قلعوں سے نکل آیا اور جنگ کرنے کو آمادہ ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے راجا (ناگرمل) کو لکھا کہ تمھارا آنا زیادہ مناسب ہے۔ وہ تو دوستی پیدا کرنے میں ماہر تھے اُنھوں نے سفیر بھیج کر (صُلح کرلی) اور اُس فوج کو واپس لوٹا دیا۔

میرا آگرے جانا (جولائی ۱۷۶۲ء)

میں اِس تقریب سے تیس سال کے بعد[2] اکبر آباد گیا اور اپنے والد اور چچا کے مزاروں کی زیارت کی۔ وہاں کے اکثر شعرا، مجھے اِس فن کا امام سمجھ کر ملنے کو آئے۔

---

[1] اس قلعہ دار کا نام فاضل خاں تھا اور اس نے ۱۲؍جون ۱۷۶۱ء کو قلعہ آگرہ پر قبضہ کیا تھا۔ ملاحظہ ہو سرکار: زوالِ سلطنتِ مغلیہ ۲/۲۷۸ نیز ۲/۳۱۸ مفتاح التواریخ ۵۱۹۔ [2] میر نے تیس (۳۰) سال کے بعد اپنا دوبارہ آگرے جانا لکھا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ غلط ہے۔ عباراتِ ماسبق سے اتنا واضح ہو چکا ہے کہ میر نادر شاہی حملے (۱۷۳۹ء) کے بعد (دوبارہ) دِلّی آئے تھے اور وہ زمانہ اگر ۱۷۴۰ء بھی مانا جائے تو سورج مل کی بغاوت جولائی ۱۷۶۲ء کا واقعہ ہے جس کی رو سے میر ۲۲-۲۳ برس کے بعد تیسری بار آگرہ گئے ہیں نہ کہ تیس برس میں۔

صاحب سُنّی نِکلے!

(حکایت) میں نے ایک عالم کی شہرت سُنی۔ گیا اور ملاقات کی، مگر کور مغز نکلا۔ یعنی بات کا مفہوم بھی نہ سمجھتا تھا۔ میں نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا کہ اُس نے احمقانہ باتیں شروع کر دیں کہ اِس زمانے کے اکثر جوان رافضی ہوتے ہیں اور از راہِ بہتان تراشی[۱] بزرگوں کے حق میں جانے کیا کیا بکتے ہیں۔ تمھاری یہ خاکِ امام کی تسبیح جو ہم صفا پیشہ لوگوں کے لیے بسببِ غبارِ خاطر ہے اِس کی دلیل ہے کہ تمھارا میلان رِفض کی طرف ہے۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نے کہا: "مجھے خود ہی تردّد تھا (کہ آپ رافضی ہیں یا نہیں) خدا کا شُکر ہے کہ صاحب سُنّی نکلے۔" وہ مُودھا اِس کِنائے کو نہ سمجھا اور بہت خوش ہوا۔ جب مجھے (اپنا) ہمنوا پایا تو اور بھی پوچ بکنا شروع کیا۔ میں نہایت بے مزہ ہوا اور اُٹھ کر چلا آیا۔

آہ اے وطن! (جولائی تا اکتوبر ۱۷۶۲ء)

(حکایت) میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے جاتا تھا۔ اُس کا محلِ وُقوع بہت اچھا ہے یعنی اِس طرف باغات ہیں اُدھر قلعہ اور اُمرا کی حویلیاں۔ گویا بہشت کی نہر ہے۔ میری معنی آفرینی کا شُہرہ تو عالمگیر تھا، الھڑ حسین سیاہ پلکوں والے، اچھی سج دھج والے، جامہ زیب، پاکیزہ طینت، اور شعرا مجھے نہیں چھوڑتے تھے اور میری بہت عزّت کرتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما وہاں کے عالموں فقیروں اور شاعروں سے ملا، مگر کوئی ایسا بات کرنے کی گوں کا نہ ملا

---

[۱] یہاں میرؔ نے فارسی محاورہ "سقیفہ سازی" کا استعمال کیا ہے۔ —— یہ ایک سُنّی سے مستبعد ہے۔ میر نے یہاں اپنے تشیّع کے اظہار یا محاورۂ ایران کی نقل کے شوق میں یہ بھی خیال نہ کیا کہ یہ محاورہ وہ ایک سُنّی عالم کی زبان سے کہلوا رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ مکالمہ کبھی ہوا ہی نہ ہو۔ اگر فی الواقع ہوا بھی تو نہ یہاں اِس کا کچھ سِیاق ہے نہ کوئی اہم نکتہ اِس کے درج کرنے کا مُحرّک ہو سکتا ہے جب کہ نسبتاً بہت سی اہم باتیں جو لکھنے کی ہو سکتی تھیں میرؔ نے اُن کی طرف التفات نہیں کیا ہے۔

جس سے دلِ بیتاب تسلّی ہوتا۔ میں نے سوچا کہ سُبحان اللہ، یہ وہی شہر ہے جس کی گلی گلی میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی، دانشمند، فقیہ، متکلّم، حکیم، صُوفی، مُحدِّث، مُدرِّس، درویش، مُتوکّل، شیخ، مُلّا، حافظ، قاری، اِمام، مؤذّن، مدرسہ، مسجد، خانقاہ، تکیہ، مہمان سرا، مکان اور باغ تھے، اور آج کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر دل خوش کر لوں! ایسا آدمی نہیں ملتا جس سے کچھ دیر گپ کر سکوں۔ بس ایک وحشت ناک خرابہ تھا (جسے دیکھ کر بہت) رنج اُٹھایا اور واپس آگیا۔ اِس طرح چار مہینے وطنِ مانوف میں گزارے، رخصت ہوتے وقت حسرت سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور میں سورج مل کے قلعوں میں آگیا۔

میر قاسم کی معزولی (اگست ۱۷۶۳ء)

(سانحہ) یہاں آکر سنا کہ قاسم علی خاں، ناظمِ بنگالہ اور اُن تجارت پیشہ نصرانیوں (یعنی ویسٹ انڈیا کمپنی) میں جو وہاں ایک مدّت سے سکونت رکھتے تھے جنگ چھڑ گئی ہے[۱]۔ وہاں (بنگال) کی رعایا اور زمیندار اُس کے بے اندازہ ظلموں سے عاجز آگئے تھے اِس لیے اُنھوں نے (قاسم علی خاں کا) ساتھ نہیں دیا۔ آخر کار وہ شکست کھا کر اپنی ہزیمت خوردہ فوج، زر و جواہر اور بے حساب مال و منال ساتھ لے کر عظیم آباد آگیا جو اُسی کا صُوبہ تھا۔ فرنگی (تعاقب کرتے ہوئے) یہاں بھی آپہنچے۔ اُس نے چاہا کہ شہر بند ہو جائے اور پھر جنگ کرے، لیکن اُس کے لشکر نے پیٹھ دکھائی اور اُسے دوبارہ شکست ہوئی۔

---

[۱] میر قاسم علی خاں ستمبر ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کی معزولی کے بعد بنگال کے گورنر ہوئے۔ انگریزوں سے اُن کا معاہدہ تھا لیکن انگریزوں نے اُس کی خلاف ورزی کی۔ اِس پر میر قاسم نے فوج کشی کر دی مگر شکست کا منھ دیکھنا پڑا (۱۷۶۴ء) اور شجاع الدّولہ سے پناہ مانگی۔ انگریزوں نے اَودھ پر دباؤ ڈال کر وہاں سے بھی نکلوا دیا آخر کچھ دن روہیلکھنڈ پھر ریاست گوہد اور جودھپور میں گذار کر ۱۷۷۴ء میں شاہ عالم کے دربار میں پہنچے مگر یہاں بھی پناہ نہ ملی۔ آخری زمانہ موضع کوتوالی میں نہایت کس مپرسی کے عالم میں بسر کیا۔ — ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء میں انتقال ہوا، اور اُن کے ساتھ ہی بنگال کے صُوبیداروں کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

وہ اپنا ساز و سامان لے کر نو دس ہزار فوج کے ساتھ شجاع الدولہ کی سرحد میں آگیا۔ انگریزوں نے بالفعل جنگ سے ہاتھ اُٹھا لیا اور پیش قدمی نہ کی۔ جب وہ بنارس کے قریب پہنچا تو خیمے ڈال کر وزیر (شجاع الدولہ) کو لکھا کہ "میں تمھاری امداد کے بھروسے پر آیا ہوں اگر تم میری اعانت کرو اور نصرانیوں سے جو (ہمارے) مذہب کے مخالف ہیں، جنگ کرنے کو آجاؤ تو تمھاری فوج اور ملازموں کا خرچ میرے متصدی اٹھائیں گے۔" اُنھوں نے جواب دیا: "پہلے تم یہاں آؤ اور بادشاہ کی ملازمت حاصل کرو (بادشاہ کے حضور میں جو کچھ طے ہوگا اُس کے موافق عملدرآمد کیا جائے گا۔" وہ شامت کا مارا اور سازش سے بے خبر، مع اسباب و آلات اور پانسو ہاتھیوں کے کچھ لالچیوں کے اعتماد دلانے پر جو بیچ میں پڑے ہوئے تھے، اُس دریا (گنگا) سے جو شہرِ مذکور (بنارس) کے نیچے واقع ہے پار اُتر کر لشکر میں داخل ہوگیا اور گھیرا ڈال دیا۔ اُدھر کے حریصوں کی نظر اُس کے شاہانہ اسباب پر پڑی تو اُن کی نیت ڈانواڈول ہوگئی اور کچھ پرانے گھاگ بھیج کر اُسے دھوکے دَھڑی سے قید کرلیا۔ دو تین دن بعد سب زر و نقد، جواہر اور اجناس، گھوڑے، ہاتھی، بیل، اُونٹ، خیمے، فرش، جو کچھ بھی تھا وزیر نے ناعاقبت اندیشوں کے کہنے میں آکر (چھین لیا اور) اُس کے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ جو بدعہد بیچ کے بچولیے بنے ہوئے تھے اُنھوں نے معاہدے کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور اپنے قول سے پھر گئے۔ (وہ بیچارہ یہ سوچ کر) آیا تھا کہ کوئی اُس کی مدد کرے گا مگر یہاں اور بھی بے اعتبار ہوگیا۔ جب اُس نے پناہ کا طالب ہو کر وزیر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو بیگم، یعنی مادرِ شجاع الدولہ کی سرکار سے (کچھ) یومیہ (وظیفہ) مقرر ہوگیا۔

باقی داستان یہیں چھوڑتا ہوں کیونکہ ابھی مجھے ایک اور کہانی سنانی ہے۔

---

[۱] ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء

سُورج مل کی جھڑپ[1]

جمادی الثانیہ ۱۱۷۷ھ۔ دسمبر ۱۷۶۳ء

(سانحہ) سورج مَل، جو بڑا جیالا سردار ہے، اُس کا بڑا لڑکا جواہر سنگھ، مدّت سے ریاست کا خیال سر میں رکھتا ہے۔ چنانچہ اب سے پہلے اپنے باپ سے جنگ کر کے بہتوں کا خون بہا چکا ہے، خود بھی دو تین کاری زخم کھائے تھے۔ اِن دنوں وہ فرّخ نگر گیا جو شاہجہاں آباد سے مغرب کی طرف تین منزل کے فاصلے پر ایک شہر ہے اور جس کی سرحد اُس کے باپ کے ملک کی سرحد سے ملتی ہے۔ وہاں کے زمیندار سے جا بھڑا جس کا باپ نواحِ دہلی کی فوجداری پر مامُور تھا۔ اِس آویزش کو طُول دیا اور وہ (زمیندار) بھی مونچھ نیچی کرنے پر آمادہ نہ ہوا، اور جی جان سے (لڑائی میں) کُود پڑا۔ جب اِسی طرح دو مہینے گذر گئے تو سورج مل نے بڑی بھاری سپاہ لے کر اُدھر کا رُخ کیا اور راجا (ناگر مل) کے ہاں رخصت ہونے کو آیا، اُنھوں نے مشورہ دیا کہ تم ہرگز مت جاؤ، ایسا نہ ہو کہ (کسی بڑے) فتنہ و ہنگامہ کا سبب بن جاؤ کیونکہ نجیب الدّولہ وہاں سے نزدیک ہے اگر اُس نے اِسلام کی رعایت کی تو جنگ چِھڑ جائے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ فریقِ ثانی کے پاس قلعہ ہے، فوج ہے، اگر جم کر لڑا اور دیر تک جنگ رہی، تو تمھارے بڑے پن کو بھی بٹّا لگے گا۔ آدابِ ریاست میں یہ لکھا ہے کہ جب تک کام نوکر سے نکل سکتا ہو، سردار کو چاہیئے کہ اپنے بیٹے سے نہ کہے۔ اور جب تک بیٹے (کو بھیجنے) سے کام بنتا ہو خود (مُہم پر) نہ جائے۔" لیکن خاصّہ یہ ہے کہ جب موت منڈلانے لگتی ہے تو انسان معقول بات نہیں سُنتا، اُس نے بھی (راجا ناگر مل کے اِس) مشورے کو اِس کان سُن کر اُس کان سے اُڑا دیا۔ چنانچہ گیا اور وہاں (فرّخ نگر) کے رئیس کو قید کر لیا۔ اُس کی سپاہ نے دستِ ظلم دراز کیا، اور وہاں کے شرفاء کے مکانوں میں

---

[1] فارسی متن "ذکرِ میر" کے مرتّب مولوی عبدالحق نے اِس موقع پر عنوان "جواہر سنگھ کی دست درازی اور نجیب الدّولہ کی گوشمالی" غلط قائم کیا ہے۔ نجیب الدّولہ کی جھڑپ سُورج مل سے ہوئی تھی نہ کہ جواہر سنگھ سے۔ میر نے اِسی جنگ کے بیان میں آگے چل کر نام بھی لکھ دیا ہے" اما کسی نہ دانست کہ این سورج مل است"۔

جھاڑو پھیر دی۔ (رئیسِ فرّخ نگر کے) بھائیوں نے جو نجیب الدّولہ کے ساتھ تھے بہت واویلا کی اور نجیب الدّولہ سے اپنی بے طاقتی کا اظہار کیا اُس نے اُن کی خاطر (سورج مل) سے التجا کی کہ وہ لوگ اپنی سزا کو پہنچ گئے اب اُنھیں معاف کردو۔ مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور بڑی دلیری سے شاہجہاں آباد کی طرف بڑھا۔ (نجیب الدّولہ نے) جنگ سے تغافل کرتے ہوئے شہر کے دروازے بند کرا دیے اور بالکل سونٹھ ہوگیا۔ یہ گھمنڈی اِتراتا ہوا دریا کے پار اُترا اور اُس سے اُلجھ کر درہمی کا باعث ہوا۔ اُس (نجیب الدّولہ) کی انسانیت میں شبہ نہیں (اُس نے) سَو بار کہلا بھیجا کہ "میں تم سے جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، اِس لیے اپنی فوج کو نہیں نکال رہا ہوں۔ شہر کے غریب لوگ (خواہ مخواہ) تکلیف اُٹھا رہے ہیں، تمھارا یہاں محاصرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔" لیکن (سورج مل) نے ایک جواب بھی انسانیت کا نہیں دیا بلکہ چھچھورپن سے یہ کہلا بھیجا کہ "میں تو نواب کی فوج کو دیکھ کر ہی واپس جاؤں گا اگر جلدی شہر سے باہر نکل آئیں تو احسان ہوگا کیونکہ مجھے اور بھی کام درپیش ہیں، نہیں تو یہ فوج جو میرے اختیار میں نہیں ہے، صبح و شام میں شہر پر دھاوا بولا ہی چاہتی ہے۔ اُس سردار (نجیب الدّولہ) نے کہا کہ "اچھا تو ہم کل صبح ضرور باہر نکلیں گے اور اپنی فوج کے دَم خم تمھیں دکھا دیں گے۔"

(نقل) ایک شخص نے جو اُن دونوں کے درمیان (سفارت کے فرائض انجام دے رہا) تھا، مجھ سے بیان کیا کہ آدھی رات کو نجیب الدّولہ نے اپنی فوج کو دریا پار کرنے کا حکم دیا اور خود لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیدار ہوا اور کہنے لگا کہ میں نے ایک عجیب واقعہ (خواب میں) دیکھا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا؟ اُس نے کہا: "ایک درخت پر ایک بڑا کوا بیٹھا ہے، اور بہت سے کوّے اُس کے چاروں طرف جمع ہو کر شور مچا رہے ہیں۔ میں اُدھر سے گذر رہا ہوں اور ایک ہی

تیر میں اُس (کوّے کو) ڈھیر کر دیا ہے۔ باقی سب کوّے اُسے مرا ہوا دیکھ کر یک بارگی اُڑ گئے ہیں، غالب ہے کہ مجھے فتح نصیب ہو گی۔ اِن شاءَ اللہ صبح کو سوار ہو کر اُس سیاہ باطن کو ٹھکانے لگاؤں گا۔"

جب صبح ہوئی، آسمان نے تیغِ حادثہ کھینچی، جنگ کا نقارہ بجا، اور (نجیب الدولہ) ہاتھی پر سوار ہو کر دریا کے پار اُترا اور نہایت استقلال کے ساتھ مقابلے پر جم گیا۔ حریف نے بڑے گھمنڈ اور طمطراق کے ساتھ اپنی فوج کے دستوں کو آگے بڑھایا۔ تفنگ انداز تفنگ چلانے میں (مصروف ہوئے) اور آزمودہ کار جنگ کے طور طریقے بھانپنے میں۔ یہ سردار (نجیب الدّولہ) تو پہلے ہی پُھنکا ہوا تھا، حسبِ معمول نہایت دلیری سے لڑ رہا تھا۔ اُدھر کا رئیس (سورج مل) بھی کمر کس کر میدان میں ڈٹ گیا تھا اور جھیر خانی سے باز نہ آتا تھا۔

جب روہیلوں نے دو تیغہ بازی شروع کی تو اُس (سورج مل) نے اپنے تئیں فوج میں چُھپا دیا اور اس سے غافل ہو کر کہ ظالم موت اُس کی تاک میں ہے، بالا بالا نکل کر اُس فوج پر ٹوٹ پڑا جو شہر کی جانب تھی۔ (اِس پر) ایک شور برپا ہوا۔ (نجیب الدّولہ کی) فوج کے قلب سے کچھ رُودار دستے اُن کی امداد کو لپکے اور اِس بلا کو دُور کر دیا۔ اِس گرد و غبار میں اُس اجل رسیدہ کے ایسا زخم لگا کہ گھوڑے سے زمین پر گرا اور مر گیا لیکن کسی نے نہ جانا کہ یہ سُورج مل ہے۔ (لوگ) آپس میں کہہ رہے تھے کہ جب اُس کا گھوڑا سامنے آئے گا تو اُس کے جِلو میں قیامت ہوگی یہ کیا جانتے تھے کہ وہ پیش جنگی کر کے خود کو لقمۂ اجل بنوا چکا ہے۔ اُس وقت سے شام تک پھر جنگ نہ ہوئی۔ وہاں تو اُس کا کام تمام ہو چکا تھا اور یہاں (نجیب الدّولہ کے سپاہی) یہ ڈر رہے تھے کہ رات ہوتی جا رہی ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ شب خون مارے اور ہمیں ہلاک کر ڈالے۔ شام کے بعد (جاٹوں کی) فوج منتشر ہو کر

چلی گئی۔ ادھر یہ آدھی رات تک جنگ کے ارادے سے گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار کھڑے رہے لیکن سب کو یہی فکر تھی کہ آخر کیا بلا ہے کہ اُدھر سے چھکار تک نہیں آتی، ایسا نہ ہو کہ حریف کی فوج غفلت میں ہم پر حملہ کرے اور قیامت برپا کردے۔ اُن کے لشکر کے جاسوس نکل کر دُو، دُو، تین، تین کوس تک اِدھر اُدھر گھومے لیکن ایک (چڑیا کا بچّہ بھی) نہ ملا۔ آخر شب کے قریب جاسوسوں نے آکر بتایا کہ گانو والوں سے یہ سُنا گیا کہ ایک جماعت بدحواسی (کے عالم) میں کہتی جارہی تھی۔ "افسوس ہے سُورج مل جیسا سردار مارا جائے اور ہم بے مروّت اُس کی لاش کو میدان میں چھوڑ کر اپنی جان کے خوف سے یُوں بھاگ آئیں!" اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سہ پہر کی جھڑپ میں جو محافظ فوج (چنداول) کے ساتھ ہوئی تھی، مارا گیا ہے، اور اُس کا لشکر بھاگ گیا۔

انھیں باتوں میں تھے کہ صبح ہوگئی اور ایک سوار ایک کٹا ہوا ہاتھ لایا اور کہنے لگا کہ یہ اُس کا وہی سُوکھا ہوا ہاتھ ہے جس میں ناسُور تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی پہچان لیا اور خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ جب یقین ہوگیا تو (بھاگی ہوئی) فوج کا تعاقب شروع کیا اور اُن کا پیچھا لیا۔ اگر وہ لوگ (روہیلے) دریا پار اُتر جاتے تو ایک جہان کو تباہ کر ڈالتے۔ لیکن راجا (ناگرمل) نے لکھا کہ نوّاب نے یہ دولت یعنی ایسی (شاندار) فتح مفت حاصل کرلی ہے اب مناسب ہے کہ اِسے غنیمت جانیں اور باگیں موڑ لیں۔ یہاں بڑی جمعیت موجود ہے اگر (جاٹوں نے) ہمّت سے مقابلہ کیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ (نجیب الدّولہ) سُلجھا ہوا دماغ اور قلبِ سلیم رکھتا تھا، اُس نے راجا (ناگرمل) کا خط دیکھا تو واپس ہوگیا۔

جواہر سنگھ جو یہ خبر سُن کر ہی بے جان ہو چکا تھا، مگر ظاہر میں خود کو سنبھالے ہوئے تھا مسندِ ریاست پر متمکّن ہو کر (نیا) لشکر اکٹھا کرنے کی فکر میں لگ گیا۔ ہمّت د

شجاعت اور مروّت میں وہ اپنے باپ سے سَو گُنا بہتر ہے۔

دولت نہ دہد خدای کس را بہ غلط

لشکر بادشاہ و وزیر کی حقیقت

(سانحہ) ہوا یہ کہ شجاع الدولہ نے کچھ ناتجربہ کار دُوں اور نااہلوں کے بہکائے میں آکر، جو اس کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے، اِس لالچ میں کہ اگر صوبۂ عظیم آباد ذرا سی تگ و دَو سے ہاتھ آجائے تو مفت برابر ہے، شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے کر اُس طرف لشکر کشی کردی۔ عیسائیوں کے کیپس یعنی فرنگیوں کے سردار نے شہر (کی حفاظت کے انتظامات) مُحکم کر کے انھیں لکھا کہ ہمیں جس سے پرخاش تھی اُسے ہم نے مار لیا اور اِس ملک سے نکال دیا۔ اب ہمیں نواب (شجاع الدّولہ) اور بادشاہ (شاہ عالم) سے کوئی سروکار نہیں، پھر اِس حرکت (فوج کشی) کا سبب نہ معلوم کیا ہے؟ اگر ہم سے اِطاعت (قبول کرانا) منظور ہے تو ہم (پہلے ہی سے) مُطیع و مُنقاد ہیں، بے فائدہ زحمت اُٹھانے کی حاجت کیا ہے؟ اور اگر کچھ بے سمجھ نو دولتوں کے اکسانے پر ہمارا اِستیصال مقصود ہے، تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بڑے لوگوں کا مزاج تُند سیلاب کی طرح ہوتا ہے، جدھر کو چل پڑا بس چل پڑا۔ ہم تو خس و خاشاک ہیں، ہمارے پاس کیا سر و سامان ہے جو اُس کے سدِّ راہ ہو سکیں۔ سرداروں کی طبیعت کو آندھی سے تشبیہ دی جاتی ہے، ہم تو مشتِ خاک ہیں (ہمارے پاس) کیا ساز و برگ رکھا ہے جو اُس کا راستہ روک دیں۔"

لیکن حضورِ شاہ کے معاملہ نافہم لوگوں نے جو عقل و شعور سے بیگانے تھے اِس تحریر کو فرنگیوں کی بُزدلی اور نامردی پر محمول کیا اور باصرار کوچ کرنے کا مشورہ دیا۔

جب شہر (عظیم آباد) کے نواح میں دونوں فریقوں کی مُڈبھیڑ ہوئی تو فرنگی بندوقیں لے کر لڑائی پر تُل گئے، اور نمک حرام مغل آقا کے خزانوں پر جھپٹ پڑے۔

نصرانی (انگریز) بڑی جرأت سے آگے بڑھے۔ نواب کا ایک چیلا عیسیٰ نامی دلیری سے (لڑتا ہوا) مارا گیا۔ بادشاہ (فقط) تماشائیوں کی طرح کھڑا (دیکھتا) رہا۔ (انجام کار) شکست ہوگئی۔ نواب نے جو (شہر کے) آس پاس کہیں لڑ رہا تھا، توقف میں مصلحت نہ دیکھی اور (باقی ماندہ) چند (لوگوں) کے ساتھ (اپنے) صوبہ کی راہ لی۔ (اتنی لمبی) مسافت (صرف) ڈیڑھ دن میں طے کر کے اپنے ٹھکانے پر آگیا۔ وہاں سے نقد و جنس اور ناموس بقدرِ ضرورت ساتھ لے کر فرخ آباد کو روانہ ہوا۔

کیا خوب سودا نقد ہے

اگرچہ یہ دنیا دارالجزا نہیں، لیکن کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے (کہ بدلہ ہاتھ کے ہاتھ مل جاتا ہے چنانچہ) اِس بھاری لشکر پر یہ شکست فاحش (اُس غداری کا) بدلہ تھی جو اُنھوں نے قاسم علی خاں سے کی تھی۔

شاہ عالم کا وظیفہ

اُدھر نصرانیوں نے خیموں اور آلاتِ جنگ وغیرہ پر قبضہ کر کے بادشاہ کو اپنے ساتھ لیا اور اطمینان سے اس طرف کو عازم ہوئے۔ سات آٹھ دن کے عرصے میں اودھ[1] پہنچے جو شجاع الدولہ کا مستقر ہے اور اِس فتح کے شکرانے میں جو اُن کے تصور سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی کسی شخص کو آزار نہیں پہنچایا۔ ایک ہفتہ کے بعد بادشاہ کا ۲ دو لاکھ روپیہ ماہانہ مقرر کر کے اُسے الٰہ آباد کو رخصت کر دیا کہ حضرت بطورِ خود رہیں؛ اب ہم جانیں اور مُلک۔

(سانحہ) اِسی دوران میں جواہر سنگھ اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ملہار راؤ (ہولکر) کی اعانت سے، جس کا احوال پہلے لکھا جا چکا ہے، بھاری لشکر لے کر نجیب الدولہ پر حملہ آور ہوا اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ اناج کی مہنگائی سے مخلوق تنگ آگئی۔ جنگ و جدال اور کشت و خون (کا سلسلہ) تقریباً ۲ دو مہینے (جاری) رہا۔

---

[1] اودھ موجودہ فیض آباد کا قدیم نام ہے۔

عماد الملک جو اِس جنگ سے کنارہ کرنے کی فکر میں تھا، اپنی ناموس (زن و فرزند) کے ساتھ بھرت پور کے قلعہ سے نکلا اور فالتو لوگوں کو فرّخ آباد بھیج کر خود جواہر سنگھ کا شریک ہوگیا۔

عماد الملک[1]

نواب عماد الملک اِس سن و سال کے باوصف یگانۂ روزگار ہیں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں چنانچہ پانچ چھ خط (خوشنویسی کے) بخوبی لکھتے ہیں۔ ریختہ اور فارسی دونوں میں بامزہ شعر کہتے ہیں اور فقیر (میر) کے حال پر بہت ہی عنایت فرماتے ہیں۔ جب کبھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، (کچھ نہ کچھ) حَظّ اُٹھایا ہے[2]۔

شجاع الدّولہ کی انگریزوں سے طلبِ امداد

(سانحہ) شجاع الدولہ کا حال یہ ہے کہ وہ جن لوگوں کی حمایت کے بھروسے پر فرخ آباد میں پڑا ہوا تھا اُن سے سوائے بے مروتی اور توتا چشمی کے کچھ نہ پایا تو ناچار ملھار کے ساتھ، جس کے حالات پہلے لکھے گئے ہیں، دوستی گانٹھ کر فوج جمع کی اور (اُنھیں) فرنگیوں سے جنگ کرنے کے لیے لے گیا۔ جب فریقین کا مقابلہ ہوا تو دونوں جانب سے گولوں کی باڑھ لگ گئی۔ دکھنی فوج کے دستوں نے اپنی بہادری دکھانے کے لیے توپ خانے کے منھ پر جاکر نیزہ بازی

---

[1] عماد الملک کے لیے رجوع کیجیے: خزانۂ عامرہ /۵۰۔ گلزار ابراہیم قلمی (نسخۂ پٹنہ) ورق ۲۹۷۔ ب تذکرۂ نشترِ عشق (قلمی رام پور) ۶۹۳۔ الف تا ۶۹۵۔ الف۔ گلشنِ سخن قلمی ۱۰۲۔ الف (مطبوعہ) تکملۃ الشعرا قلمی (نسخۂ رام پور) ۳۱۷۔ب تذکرۃ الکاتبین (قلمی) ۲۸۔ الف۔ حدیقۃ العالم ۲/۲۲۳۔ عہد بنگش سرگذشتِ نجیب الدّولہ /۵ زوالِ مغلیہ (سرکار) جلد ۲

[2] یہ سطور جس زمانے میں لکھی گئی ہیں عماد الملک جاٹوں کے علاقہ میں پناہ گزین تھا۔ فارسی متن کی عبارت یہ ہے: "ہر گاہ بخدمتِ شریفِ اُو حاضر شدہ ام حَظّے برداشتہ۔" قاضی عبدالودود صاحب نے میرے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "حظّے برداشتہ" کا فاعل عماد الملک ہے۔ مگر مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ حظ سے میر کی مراد یہ ہے کہ اُن کے پاس جب بھی گیا ہوں کچھ نہ کچھ انعام وغیرہ ضرور ملا ہے۔ نسخۂ رام پور میں اِس موقع پر صریحاً "برداشتہ ام" لکھا ہے اِس سے بھی میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اور مار دھاڑ شروع کر دی۔ (عیسائی فوج) دائرۂ لشکر سے چپکے سے نکل آئے اور گولہ باری کرتے ہوئے اچانک ایسے آپڑے کہ دکھنیوں کے چھکّے چھوٹ گئے اور ساری شیخی کِرکری ہوگئی۔ وہ بدحواس ہوکر ایسے بھاگے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دو تین دن میں گوالیار پہنچ گئے جو آگرہ سے تین منزل (کی مسافت) پر ایک شہر ہے جہاں (مرہٹوں کا) حاکم رہتا ہے اور یہ (علاقہ) اُن کے قبضہ میں ہے۔ چند روز میں انھوں نے اپنے پراگندہ حال کو درست کیا اور جواہر سنگھ سے جنگ کرنے پر تل گئے۔ اُدھر شجاع الدّولہ کا دعویٰ نمٹ گیا۔ وہ اپنی موت سے بے پروا ہوکر تن تنہا فرنگیوں کے پاس چلا گیا۔ (فرنگیوں نے) اُس سے مُروّت کی، اور تمام چیزوں سے دست بردار ہوگئے (اور اس کے) صوبوں کو اُس پر چھوڑ کر عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے۔

جب (بادشاہ اور وزیر کا) رفعِ حجاب ہوگیا تو (شجاع الدولہ نے) دوبارہ وزارت کا خلعت پہنا (۱۳۔ ربیع الاول ۱۱۷۹ھ / مطابق ۳۰۔ اگست ۱۷۶۵ء)[1] اور بخت ہوکر اپنے مستقر یعنی اودھ میں آ (کر بیٹھ) گیا۔

جواہر سنگھ اور مرہٹوں کی جنگ

(سانحہ) اُدھر یہ تیرہ روزگار دکھنی (مرہٹے) بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ جواہر سنگھ کی سرحد تک آگئے اور اکثر دیہات کو لوٹ کھسوٹ لیا۔ جواہر سنگھ جو واقعی بڑا بہادر ہے (اپنے) قلعوں سے نکلا اور آٹھ نو ہزار سکھوں کو جو اُن دنوں اس ضلع میں آئے ہوئے تھے بھرتی کرکے لے گیا اور مقابلہ کیا۔ جب جنگ چھڑی تو اُن کم بختوں کے چھکّے چھوٹ گئے اور یہ (سکھ) لوٹ مار اور پکڑ دھکڑ میں لگ گئے چنانچہ قریب پانسو آدمیوں کو مع ایک (مرہٹہ) سردار کے پکڑ لائے اور اُن کی سپاہ گری کی آبرو خاک میں ملا دی۔ ملہار چونکہ غیرت مند آدمی تھا جب اُس نے شکست پر شکست

[1] چہار گلزار شجاعی (قلمی) (عکس مملوکہ شعبۂ تاریخ۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ) نیز ذخیرۂ ذاتی

کھائی تو فرطِ اندوہ و غم سے تین چار منزل آگے جاکر مر گیا۔

مرہٹوں نے صلح کرلی

اندریں اثنا ر گھنا تھ راؤ، جو دکھنیوں کا مانا ہوا سردار ہے، کثیر فوج کے ساتھ پہنچا اور جواہر سنگھ کی سرحد کے اس طرف کے زمینداروں میں سے ایک پر چڑھائی کرکے اُس کے ملک میں فتنہ کھڑا کر دیا۔ زمیندار مذکور جواہر سنگھ سے دوستی رکھتا تھا' اُس نے لکھا کہ اگر مرہٹے مجھے دبالیں گے تو یقینی ہے کہ تمھارے ملک پر بھی ہاتھ صاف (کرنے کی کوشش) کریں گے۔ تمھارا (اپنی) سرحد پر آنا ضروری ہے، میرا فائدہ بھی اِسی میں ہے۔ یہ فراخ حوصلہ جوان (جواہر سنگھ) بے پایان لشکر کے ساتھ گیا اور چنبل — جو ایک مشہور دریا ہے — کے اُس طرف پڑاؤ ڈال دیے۔ مرہٹوں نے سراسیمہ ہوکر اور بھی جی توڑ کوشش شروع کردی۔ (مگر) ابھی دونوں لشکر محاذوں پر ہی (تیاریوں میں مصروف) تھے کہ شاہ (ابدالی) کے آنے کا غلغلہ بلند ہوا۔ اُس کے نام (ہی) سے مرہٹہ سرداروں کا پیشاب خطا ہوتا تھا، چنانچہ سر پر پانو رکھ کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے اور اُن قیدیوں کی رہائی پر صلح کرلی جنھیں ملہار کی جنگ میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اُس عزیز (جواہر سنگھ) نے اِن نمک حراموں کی واجبی گوشمالی کی جو مرہٹوں سے ساز باز کرکے اینٹھ رہے تھے اور آگرہ واپس آگیا۔

میرا دوسرا سفرِ آگرہ

راجا (ناگرمل) اپنے قلعوں سے (نکل کر) اُس کی ملاقات کے لیے (آگرے) گیا۔ مجھے اِس بہانے اپنے باپ اور چچا کے ڈھیروں کی زیارت پھر میسر آگئی۔ تقریباً پندرہ روز وہاں رہ کر اِس طرف کو واپسی ہوئی۔

ابدالی کا حملہ

اِس بار بھی شاہ درّانی مشہور دریائے ستلج کے اُس طرف تک آیا اور بے حقیقت سکھوں کے ہاتھوں نقصان اُٹھا کر لوٹ گیا۔

جواہر سنگھ اور مادھو سنگھ کی جھڑپ

(سانحہ) اِسی زمانے[1] میں جواہر سنگھ اور مادھو سنگھ پسر جے سنگھ کے مابین ریاست کے معاملات میں سے کسی معاملے پر تلخی ہو گئی اور وہ رفتہ رفتہ جھگڑے کی شکل اختیار کر گئی۔ اس بہادر نوجوان نے اس کے ملک کا ستیاناس کرنے پر کمر باندھ لی اور بظاہر بخت سنگھ — جس کا احوال میرا سحر طراز قلم پہلے لکھ چکا ہے — کے لڑکے راجا بجے سنگھ کی ملاقات کے بہانے سے پشکر گیا[2] جو اس وقت کا ایک بڑا تالاب ہے اور ہندو وہاں اشنان کرنے کو عبادت سمجھتے ہیں۔ راستے میں اُس نے اکثر دیہات کو تہ و بالا کر دیا۔ بجے سنگھ اگرچہ جوان تھا مگر پختہ رائے رکھتا تھا وہ آکر اُس سے ملا اور بیچ میں پڑکر صلح کرادی۔ باہم عہد و پیمان ہو گئے — رائے بہادر سنگھ راجا کا بڑا بیٹا جو ہمت و شجاعت والا جوان ہے اِس سفر میں جواہر سنگھ کے ساتھ اُس تالاب میں غسل کرنے گیا تھا۔ جب وہاں سے واپس ہوئے۔[3] جواہر سنگھ کی واپسی پر راجا مادھو سنگھ کے سرداروں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنگ چھیڑ دی۔ دوپہر تک تیر و تفنگ کی لڑائی ہوتی رہی، آخر میں جہالت کیش راجپوتوں نے "اُتارا" کیا[4] اور تلواریں سُونت کر پل پڑے۔ اکثر کے پانوں اُکھڑ گئے۔ آخر ان دلیر جوانوں (جواہر سنگھ و رائے بہادر سنگھ) نے دادِ مردانگی دے کر اس بلائے سخت

---

[1] یہ جمادی الثانیہ ۱۱۸۰ھ مطابق نومبر ۱۷۶۶ء کا واقعہ ہے اور میرؔ نے یہ سطریں اُسی زمانے میں لکھی ہیں۔ (چہار گلزارِ شجاعی)

[2] فارسی متن ذکرِ میرؔ (مطبوعہ) میں یہاں بھکر آیا ہے لیکن سیاق و سباق کا تقاضا ہے کہ پُشکر ہونا چاہیئے جو اجمیر کے قریب مشہور تیرتھ استھان ہے۔ جادو ناتھ سرکار نے اِس جھڑپ کی تاریخ ۶۔ نومبر ۱۷۶۷ء لکھی ہے (زوال سلطنت مغلیہ جلد ۲ ص ۳۷۴) PUSHKAR

[3] قوسین کے درمیان کی عبارت "ذکرِ میرؔ" کے مطبوعہ متن میں نسخہ رامپور کے حوالے سے حاشیے پر اضافہ کی گئی ہے ہم نے اس عبارت کو ترجمہ میں علیحدہ کر دیا ہے۔

[4] یہ میدان جنگ میں انتہائی شجاعت کا مظاہرہ ہوتا تھا کہ سواریاں چھوڑ کر دست بدست لڑائی شروع کر دیتے تھے

کوٹالا۔ شام ہونے تک دونوں لشکر بیدم ہو چکے تھے۔ کینے کی آگ (ابھی تک) دونوں طرف بھڑک رہی ہے اور (بے چاری) رعایا خس و خاشاک کی طرح اُس میں جل رہی ہے۔ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

سِکھ فوج کی بدعہدی

(سانحہ) جب جواہر سنگھ اپنے قلعوں میں آکر بیٹھ گیا تو راجپوتوں کی فوج بڑی بیدردی سے آس پاس کے گانو لوٹنے لگی اور دکھنیوں کی پُشت پناہی سے آبادیوں کو اجاڑنا شروع کر دیا۔ اُن دنوں سکھوں کی ایک فوج دریاے جَون کے اِس پار موجود تھی اُدھر کے رئیس (جواہر سنگھ) نے اُن سے ساز باز کر کے مقابلہ کیا۔ خوب کشت و خون ہوا۔ عالم تباہ ہوگیا۔ آخر (جواہر سنگھ نے) حریف کی فوجوں کو اپنے ملک سے نکال کر سکھوں کے سرداروں کو اُن کے پیچھے لگا دیا اور اپنا جانا خلاف مصلحت سمجھا۔ اس غدار قوم نے اُن سے سازش کر لی اور اس سردار (جواہر سنگھ) کو دھوکا دیا۔ جب اُس (جواہر سنگھ) نے ان کی بدعہدی دیکھی تو بہت بے مزہ ہوا۔ لیکن اُسی زمانے میں اُس کے اقبال نے یاوری کی کہ راجا مادھو سنگھ اپنی پرانی بیماری کے سبب مر گیا اور اُس کی فوج کے سردار مجبوراً صلح کر کے واپس ہو گئے۔ اور یہ بے تہ سکھ بھی اُس راہ سے نکل گئے۔

جواہر سنگھ کا قتل
۷۶۸ء - ۱۱۸۲ھ

(ایک عظیم سانحہ) اور وہ یہ کہ اِس عرصے میں جواہر سنگھ اکبر آباد چلا گیا اور کسی بدبخت کے ہاتھوں تلوار کے ایک ہی وار میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اب ریاست اُس کے بھائی راؤ رتن سنگھ کو ملی۔ یہ سیہ کار ہمیشہ شراب کے نشے میں دُھت رہتا تھا اور خلقِ خدا پر حد سے زیادہ ظلم کرتا تھا، چنانچہ دس مہینے کی مدت میں[1] اُس نے ہر کس و ناکس سے بدسلوکیاں

---

[1] ماہ صفر ۱۱۸۲ھ مطابق جون ۱۷۶۸ء سے ماہ ذی حجہ ۱۱۸۲ھ مطابق اپریل ۱۷۶۹ء تک۔

کیں۔ انجام کار کسی مُہوس نے اُسے بھی چاقو سے ہلاک کرڈالا[1]۔ اب سردار اُس کا (نابالغ) بیٹا کیسری سنگھ مقرر ہوا[2]۔ اختیارات نوکروں کے ہاتھ میں چلے گئے (جس کے باعث) سارا کام ابتر ہوگیا۔

اب کارپردازوں نے سُورج مل کے چوتھے بیٹے نول سنگھ کو جو میدان میں نہیں تھا اُس (نابالغ) لڑکے[3] کا نائب بنا دیا ہے۔ اگر وہ سلیقے سے نبھالے جائے تو اچھا ہے ورنہ ڈھنگ تو بگڑے ہوئے (نظر آہی رہے) ہیں[4]۔

جب اس قوم کے نفاق نے طول پکڑا اور ملک کے انتظام کی نوبت کرمینوں تک آپہنچی تو نول سنگھ اور اُس کا چھوٹا بھائی رنجیت سنگھ جس سے کُمھیر کا قلعہ متعلق ہے، دونوں جنگ کے لیے کھڑے ہوگئے۔ تقریباً پندرہ دن تک توپ و تفنگ کے ساتھ لڑائی ہوتی رہی[5]۔ چونکہ قلعہ مضبوط تھا ناچار نول سنگھ نے صلح کرکے چھوڑ دیا۔ ہرچند دونوں بھائیوں میں بظاہر صلح و صفائی ہوگئی ہے، مگر کینۂ باطن کا کیا علاج[6]۔ جیارام، جو رنجیت سنگھ کی فوج کا سردار اور اُس کا مدارُالمہام تھا،

---

۱ راؤ رتن سنگھ اگست ۱۷۶۸ء میں مسند ریاست پر بیٹھا تھا اور ۸۔ اپریل ۱۷۶۹ء کو قتل کیا گیا۔ اُس کی مدت ریاست آٹھ ماہ کے قریب ہوتی ہے۔ اُسے ایک برہمن گوسائیں رُوپانند نے قتل کیا تھا۔ اُس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ کیمیا بنانا جانتا ہے۔ راجا نے اُسے پارس کی پتھری ڈھونڈھنے پر مامور کیا۔ یہ کچھ زمانے تک اُسے بیوقوف بنا کر روپیہ اینٹھتا رہا اور جب دیکھا کہ مکر کا پردہ چاک ہونے والا ہے تو ایک دن رتن سنگھ کو ہلاک کردیا۔ (زوالِ سلطنت مغلیہ ۳/۳-۴)

۲ ذکرِ میر میں اُس کا نام "کھیری سنگھ" ملتا ہے مگر سرکار (زوال ۳/۴) نے کیسری لکھا ہے۔ یہ مسند نشینی کے وقت شیر خوار تھا۔ نول سنگھ کا سالا دان شاہ ریجنٹ مقرر ہوا تھا۔

۳ اس نابالغ لڑکے کا نام رنجیت سنگھ تھا (چہار گلزار)

۴ ان سطروں سے ظاہر ہے کہ یہ عبارت ۱۷۶۹ء۔ ۱۷۷۰ء کے مابین لکھی گئی ہے۔

۵ زمانہ تقریباً ۱۵۔ فروری ۱۷۷۰ء (زوال ۳/۴)

۶ یہاں تک ذکر میر کی عبارت فروری ۱۷۷۰ء میں لکھی جاچکی تھی۔

دکھنیوں کے لشکر میں گیا، جو اُن دنوں وہاں سے چار پانچ منزل کے فاصلے پر منڈلا رہے تھے[1] اور (مرہٹہ) سرداروں کو لالچ دے کر اپنے ملک میں لے آیا۔[2] یہی (مرہٹے) جو آج ڈون کی لے رہے ہیں (بہت) پھٹے حالوں میں اُس کے ساتھ آئے تھے اور قلعۂ کُمہیر کی دیواروں کے نیچے محاصرہ کر کے پڑ گئے تھے[3] اور اتنے ہراساں تھے کہ ایک ایک سے پوچھتے تھے "نول سنگھ کی فوج کتنی ہے؟ اور کیسے لڑتی ہے؟" اگر نول سنگھ اپنی جگہ سے نہ ٹلتا تو اُس کا اتنا نقصان نہ ہوتا اور مرہٹے بھی تھوڑا بہت (مال) بطور ضیافت لے کر چلے جاتے۔ چنانچہ اُنھوں نے متھرا کی جانب حرکت شروع کر بھی دی تھی[4] لیکن رات کے وقت نول سنگھ کی فوج کے ناتجربہ کاروں[5] نے گوردھن[6] کے قریب ـــ کہ وہ بھی ہندوؤں کا تیرتھ استھان ہے ـــ آ کر اُن پر قزاقانہ حملہ کر دیا[7] (اور ایسے کیا کہ) سَو یہاں ہیں، تو دو سَو وہاں۔ ہزار اِدھر تو پانسو اُدھر۔ اِسی لیے جو جس جگہ تھا وہاں تنہا (ہی) رہا، کوئی کسی کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ (اِس کا نتیجہ لامحالہ یہ ہونا تھا کہ) نسیمِ فتح و ظفر دکھنیوں کے پھریروں

---

[1] مرہٹے اُس وقت جے پور میں تھے اور والیِ جے پور نے اُنھیں پچاس لاکھ روپیہ دینے کا لالچ دیا تھا بشرطیکہ وہ جاٹوں سے اُس کے مقبوضہ علاقے واپس دلا دیں۔

[2] مرہٹہ فوج کے سرداروں نے ۵۔ مارچ ۱۷۸۸ء کو کُمہیر کے قلعہ میں رنجیت سنگھ سے ملاقات کی تھی (زوال ۳/۶)

[3] تقریباً ایک ماہ کُمہیر میں پڑے رہے تھے۔ [4] تفصیل دیکھو زوال ۳/ ۶-۷

[5] یہاں میرؔ کا اشارہ گوسائیں بالانند اور دان شاہ کی طرف ہے۔ سمرو (Sombre) اور میدک نے یہ مشورہ دیا تھا کہ جنگ کرنا مناسب نہیں، مگر دان شاہ نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور ناگوں کے سردار گوسائیں بالانند نے بھی اس کی تائید کی۔ (زوال ۳/۷)

[6] یہ بھرت پور سے نو میل جانبِ مشرق واقع ہے۔

[7] یہ حملہ ۶۔ اپریل ۱۷۸۸ء کو ہوا تھا۔ (زوال ۳/۶)

پر لہرائی۔ اِدھر کے گھوڑے ہاتھی اونٹ اور بہت سا سامان جنگ اُدھر کے قلعہ داروں[1] کے ہاتھ آیا۔ لیکن ایسی شکست دینے پر بھی اُن سے یہ نہ ہو سکا کہ نول سنگھ کے قلعوں پر دھرنا دے دیتے[2] بس اسی کو غنیمت سمجھ کر دریائے جون سے گذر گئے اور دوآبہ کے درمیان خیمہ زن ہوئے۔ جب وہاں اُن کا پڑاؤ لمبا ہو گیا تو نجیب الدولہ نے، جو بہت دور اندیش تھا، دل میں سوچا کہ یہ مصیبت یُوں بالا بالا نہیں جائے گی مبادا شہر کو کچھ گزند پہنچائے۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے اور بھائی کو نیز جتنی فوج بھی ہمراہ تھی اُسے لے کر نظر بتوکل (مرہٹہ) سرداروں کے مقابل آیا اور جب تک جان میں جان رہی دکھنیوں کو اِتنی مہلت نہیں دی کہ وہ شہر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔ مگر جب وہ اپنے پرانے مرض کی وجہ سے مر گیا[3] تو اُس کے سرداروں نے کسی چھوٹی سی بات پر اُس کے بیٹے ضابطہ خان سے اختلاف پیدا کر لیا۔ آخر (ضابطہ خان) چھوڑ چھاڑ کر سکرتال چلا گیا اور اُنھوں (مرہٹوں) نے شہر کے قریب آکر اپنے خیمے گاڑ دیے۔

کاماں میں

جب جاٹوں کی بد پردازی اور ناسازی حد سے سوا ہو گئی اور (شہر میں) رہنے سہنے کا مزہ بالکل جاتا رہا تو راجا ناگر مل نے (دہلی کے) بیس ہزار خاندانوں کو ساتھ لے کر جو اُسی کی وجہ سے آباد ہوئے تھے اور (اُن میں سے) اکثر اُسی کے دامنِ دولت سے وابستہ بھی تھے، یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا اور ادھر کے سرداروں سے (جانے کی) اجازت بھی طلب کی۔ لیکن وہ

---

[1] اِس جنگ میں دو ہزار مارے گئے تھے۔ پانچ ہزار زخمی تھے۔ غنیم کو ۴۰ توپیں ہاتھ لگیں۔ صرف دو ہلکی توپیں سمرو بچا کر لے بھاگنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ جاٹوں کے بارہ سو گھوڑے، گیارہ ہاتھی، اور بارہ بڑی توپیں مرہٹوں نے ہتیالیں (زوال ۲/۷)

[2] نول سنگھ نے شکست کے بعد گوردھن سے چار میل مشرق میں ایک قلعہ ارنگ میں پناہ لی۔ پھر ڈیگ آگیا تھا۔ مرہٹوں نے یہاں تک اُس کا تعاقب کیا مگر یہاں سے اُن کا رخ متھرا کی طرف ہو گیا تھا۔ (زوال ۳/۹)

[3] ۳۱۔ اکتوبر ۱۷۷۰ (زوال ۲/ ۲۹۰۔ تیز ۳/۱۶)۔

ظالم توہنوز ان لوگوں کو ستانے کی گھات میں (لگے ہوئے) ہیں انھوں نے راجا کو لیت ولعل میں رکھا اور یہ چاہا کہ اس سردار کا ارادہ فسخ کرا دیں اور (پھر موقع پاکر) خاموشی سے دستِ ظلم دراز کریں۔ جب (راجا کو) یہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ جانے نہیں دیتے بلکہ سدِ راہ ہو رہے ہیں تو اُس نے خدا پر بھروسا کر کے وہ کیا جو سرداری کا لازمہ ہے (یعنی) بڑی جرأت کے ساتھ اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر سوار ہوا، اور قلعے سے باہر آکر غریبوں کی امداد میں اتنا مصروف ہوا کہ ایک شخص کی ناموس (زن و فرزند) کو بھی وہاں (خطرے میں) نہیں چھوڑا۔ خدائے بیچوں کے فضل اور اپنے حُسنِ نیت کی برکت سے دو تین دن میں اِس بھاری قافلے کے ساتھ شہر کاماں میں داخل ہوا جو (بجے پور) کے راجا پرتھوی سنگھ پسر راجا مادھو سنگھ کی سرحد پر واقع ہے جسے حال ہی میں رئیس بنایا گیا ہے۔ ہم مصیبت کے مارے بھی اُس کی نوکری کے تعلق سے اُسی قافلے کے ساتھ اقامت گزیں ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آب و دانہ کچھ دن یہیں رکھتا ہے یا کہیں اور لے جاتا ہے۔[۱]

میرا دلی میں ورود

(سانحہ) ان دنوں یہ مشہور ہوا کہ شاہی اقبال کے جھنڈے فرخ آباد پر سایہ فگن ہوئے ہیں۔ راجا نے مجھے (سفیر بنا کر) حُسام الدین[۲] خان کے پاس بھیجا جو بادشاہ کے مزاج میں دخیل تھے[۳]۔ میں نے جا کر عہد و پیمان درست کیے[۴] اِدھر اُس کے چھوٹے بیٹے نے جو مجھ سے اِس لیے خوش

---

[۱] یہاں تک ذکرِ میر کی عبارت کاماں (راجستھان) میں لکھی گئی ہے۔

[۲] یہ حسام الدین حیدر خاں وہی ہیں جن کے نام سے ایک حویلی آج بھی محلہ بلیماران دہلی میں موجود ہے اور جن کے بارے میں یہ روایت ہے کہ اُنھوں نے مرزا غالب کا ابتدائی کلام میرؔ کو لکھنؤ میں دکھایا تھا اور اُس کے بارے میں میرؔ نے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

[۳] شاہ عالم جولائی ۱۷۷۱ء میں حُسام الدولہ کے ساتھ فرخ آباد پہنچے تھے تاکہ احمد خان بنگش کی جاگیر ضبط کریں۔ مگر چھ لاکھ سالانہ پر فیصلہ ہو گیا تھا۔ (زوال ۲/۳۹۶)

[۴] میرؔ کا یہ دوسرا سفر فرخ آباد تھا۔ پہلے سفر کا حوالہ صفحہ ۱۲۲ پر گذر چکا ہے۔

نہیں تھا کہ میں اُس کے بڑے بھائیوں سے کچھ مراسم رکھتا ہوں (معاہدے کے علی الرّغم) اپنے باپ کو یہ مشورہ[1] دیا کہ دکھنیوں کے پاس جانا زیادہ اچھا ہے چنانچہ وہ بادشاہ کے لشکر میں نہیں گئے اور شہر (کی طرف) عازم ہوئے۔ مجبوراً میں بھی اپنے متعلقین سمیت بڑی بے آبروئی سے اُن کے ہمراہ ہولیا۔ جب شہر (دِلّی) میں پہنچا تو بیوی بچوں کو عرب سرائے میں چھوڑ کر (اُن کے قافلے سے) علیحدہ ہو گیا (دو تین دن کے بعد رائے بہادر سنگھ[2] سے ملا اور اُسے اپنے احوال سے مطّلع کیا۔ اُس بھلے مانس نے اپنے مقدور بھر میرے حالات کو سُدھارنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔)

ضابطہ خاں پر چڑھائی
۱۷۷۵ء ۔ ۱۱۸۵ھ

اِسی زمانے میں سیندھیا ــــ جو دکھنی سرداروں میں سے ایک بڑا سردار ہے ــــ پیشوائی کے لیے جاکر بادشاہ کو اپنے ساتھ لایا اور شہر میں داخل ہوا۔[3] اِس (بات) کو ابھی کچھ (دن بھی) نہ گذرے تھے کہ (مرہٹہ) سرداروں نے باہم طے کیا کہ بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر نجیب الدّولہ مرحوم کے لڑکے ضابطہ خاں پر چڑھائی کرنی چاہیے۔ بادشاہ نے ہر چند بیماری کا بہانہ کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔[4]

میرا سفر سکرّتال
۱۷۷۲ء ۔ ۱۱۸۵ھ

اِس تقریب سے میں بھی شاہی لشکر[5] کے ہمراہ اُس طرف روانہ ہوا۔ اُن لوگوں نے (وہاں) جاکر (نواب)

---

[1] یہاں حسام الدّولہ کے بیٹوں کی طرف اشارہ ہے اِس لیے کہ شاہ عالم نے فرخ آباد کے معاملے میں مرہٹوں (مادھوجی سیندھیا) سے مدد طلب کی تھی [زوال مغلیہ ۲/۲۹۷]

[2] یہ راجا ناگرمل کا چھوٹا بیٹا تھا۔

[3] یہ واقعہ ۶۔ جنوری ۱۷۷۲ء کا ہے [زوال ۳/۱، ۲۲]

[4] رک: زوال سلطنت مغلیہ ۳/۳۵، ۱۰۹

[5] اس سفر میں میرؔ شاہی لشکر کے ساتھ تھے اور لشکر کا راستہ تھا: دہلی ۔ لونی ۔ باغپت ۔ غوث گڑھ ۔ چاندپور (رڑکی سے ۱۵ میل مشرق میں)۔ ضابطہ خاں نے سکرّتال میں مورچہ بنایا تھا۔ ضابطہ خاں کی شکست کے بعد شاہ عالم یکم مارچ ۱۷۷۲ء کو سکرّتال پہنچا تھا میرؔ بھی ساتھ رہے ہوں گے۔

ضابطہ خاں[۱] کو بغیر جنگ کے ہی بھگا دیا۔ اُس کے اموال اور گھر بار اور زن و فرزند پر قبضہ کرلیا[۲]۔ بادشاہ کو بجز دو سو مریل گھوڑوں اور چند پھٹے پُرانے خیموں کے کچھ بھی نہ دیا۔ بادشاہ (مرہٹوں کی) اِس حرکت سے بہت ہی بددل ہوا[۳]۔ مگر کر کیا سکتا تھا۔ مرہٹے (اپنی طاقت کے) گھمنڈ میں تھے اور یہاں نہ زور تھا نہ زر۔ جب اُنھیں روپیہ نہیں ملا تو شاہی کارندوں نے یہاں کے شرفا کی جاگیریں دھڑا دھڑ ضبط کرنا شروع کردیں اور بہتوں کو ذلیل و خوار کیا۔

---

۱ یہ بقول سرکار ۲۳ فروری ۱۷۷۲ء کا واقعہ ہے (زوال ۳/۳۶) ضابطہ خاں امیر الامرا نجیب الدولہ کا فرزند تھا اور اپنے باپ کی وفات (۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء) کے بعد اُس کی جگہ دربارِ شاہی میں منصب دار ہوا تھا لیکن اسے کچھ الزامات لگا کر نکال دیا گیا اور املاک ضبط کرلی گئیں۔ اُس نے سرکشی کی تو شاہ عالم نے مرہٹوں سے امداد لے کر سکرتال پر فوج کشی کی (۱۱۸۵ھ - فروری ۱۷۷۲ء) سہارنپور اور نجیب آباد کے علاقے اُس کے تحت تھے جادو ناتھ سرکار (زوال ۳/۱۰۹) کا بیان ہے کہ ۱۷۷۸ء میں ضابطہ خاں نے سکھ دھرم قبول کرلیا تھا اور اُس کا نام بھی دھرم سنگھ رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ بالکل بے اصل الزام ہے۔ ضابطہ خاں ۱۷۸۵ء میں انتقال کرچکا تھا۔ ۱۷۸۵ء ہی میں اُس کا بیٹا غلام قادر روہیلہ جانشین ہوا۔ اُس نے اپنے باپ کی ذلت کا انتقام لیا اور شاہ عالم کو نورِ بینائی سے محروم کردیا تھا۔ اِس کا حوالہ میر نے اِس کتاب کے آخر میں دیا ہے۔

۲ مرہٹہ سرداروں کے محفوظ رکارڈ سے سرکار (زوال ۳/۴۰) نے پتھر گڑھ کے قلعے کی لوٹ کے یہ اعداد و شمار دیے ہیں: "دس لاکھ کا زر و سیم۔ ۲۲۹۸ گھوڑے۔ اِن میں سے ۱۰۴۳ شاہ عالم کو دیے گئے۔ تین بڑی توپیں۔ سات زنبورکین۔ ۱۸۴۲ گولہ بار۔ ستّو راکٹ۔ ۵۳۰ من بارود۔"

ضابطہ خاں کی ضبط شدہ جاگیر میں سے سہارنپور فخر الدین خاں پسر قمر الدین خاں کو اور کرنال و انُوپ شہر سیندھیا کو بخش دیا تھا۔

واپسی میں شاہ عالم کا راستہ یہ تھا: "نجیب آباد۔ نہٹور۔ شیر کوٹ۔ سیوہارہ۔ سلیم پور۔ امروہہ۔ پوتھ (گنگا)۔ بکسر۔ ہاپوڑ۔ لاکھن۔ دہلی۔" نجیب آباد سے آخر مئی ۱۷۷۲ء میں روانہ ہوئے تھے اور ۹ جولائی ۱۷۷۲ء کو دہلی میں وارد ہوئے تھے۔ واپسی میں مرہٹوں نے سارے روہیلکھنڈ کو بُری طرح لوٹا تھا صرف امروہہ لٹنے سے بچ گیا تھا۔ یہاں کے سادات نے نجف خان کی وساطت سے ساٹھ ہزار روپیہ تاوان دینے کا پہلے ہی سے اقرار کرلیا تھا۔ عبرت نامہ میں یہ رقم اَسّی ہزار بتائی گئی ہے۔ [زوال ۳/۴۳]

۳ مالِ غنیمت کی تقسیم پر شاہ عالم اور مرہٹوں کے سفیر کے درمیان جھڑپ بھی ہوگئی تھی ۳ مئی ۱۷۷۲ء (زوال ۳/۴۰)

وجیہ الدولہ سے وظیفہ

میں گدائی کے لیے نکل پڑا اور لشکرِ شاہی کے ہر سردار کے در پر گیا۔ چونکہ شاعری کے سبب میری شہرت بہت تھی، لوگ گونہ عنایات میرے حال پر مبذول کرتے تھے بارے (ان کی تھوڑی بہت امداد سے) کتے بلی کی سی زندگی گذارتا رہا اور حسام الدولہ کے چھوٹے بھائی وجیہ الدین خاں سے ملاقات کی تو اُس شخص نے میری شہرت اور اپنی لاہیت پر نظر کر کے کچھ (وظیفہ) مقرر کر دیا، مگر دلدہی بہت کی۔

شاہ عالم اور مرہٹوں کی جنگ

القصہ چونکہ بادشاہ دکھنی سرداروں کی سرکشی سے ناخوش تھا، اُن کی مرضی کے بغیر شہر (دہلی) کی طرف روانہ ہوا اور قلعے میں آ گیا۔ یہاں آکر نجف خان نے، جو خود کو لشکرِ شاہی میں بڑا سپاہی سمجھتا تھا، بادشاہ کو جانچے پرکھے بغیر اِس پر آمادہ کر لیا کہ جاٹوں کے متعینہ محالات کو تھیا لیا جائے۔ آخر اُس نے حسام الدولہ سے جو دکھنی سرداروں سے گہرے تعلقات رکھتے تھے مشورہ کیے بغیر بڑے اصرار سے اِس عظیم مُہم کی اجازت حاصل کر لی اور دس پندرہ[۱] ہزار قلاش لوگ شہر اور مضافات سے جمع کیے، اور پہلے ہی ہلے میں شہر سے ملے ہوئے دس بارہ محالات پر قبضہ کر لیا۔ اِس پر اینڈنے لگا۔ چونکہ نوعمر اور ناتجربہ کار تھا کچھ احمقوں اور عاقبت نااندیشوں کے پٹی پڑھانے سے بہک گیا اور دکھنیوں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

مرہٹوں کا منصوبہ

اُنھوں (مرہٹوں) نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ آج تو بادشاہ فقیروں کی طرح (بے ساز و سامان) ہے، مگر باین زور و طاقت ہم سے لڑنے چلا ہے اگر اُسے واقعی طاقت حاصل ہو گئی تو ہمارا ناک میں دم

---

[۱] میر نے تعداد زیادہ لکھی ہے۔ نجف خاں نے سات ہزار سپاہی بھرتی کیے تھے۔ سعادت یار خاں رنگین کے والد طہماسپ خاں مسکین جو سکرتال کی مہم میں بھی موجود تھے، کہتے ہیں کہ یہ فوجی خوبصورت اور مضبوط تھے اور ہندی الاصل تھے مگر لڑائی میں اچھے ثابت نہ ہوتے۔ (زوال ۳/۴۳-۴۵)

کردے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم دوآبہ سے (نکل کر) شہر کی طرف کوچ کریں اور اُسے مہلت دیے بغیر اُس کا کام ہی تمام کر دیں۔ اگر وہ جنگ میں کام آجائے تو خیر۔ ورنہ اس کی فوج کو پراگندہ کرکے (بادشاہ کو قید کرلیں اور) اُسے فقیروں کے سے حال میں رکھیں کہ وہ نان و نمک کھاتا رہے اور ہمارا دست نگر بنا رہے۔ جب یہ مشورہ ہو گیا تو ضابطہ خاں (پسر نجیب الدّولہ) کو بخشی گری (کا عہدہ دینے) اور سہارن پور کی جاید اد (بحال کرنے) کا لالچ دے کر خوش کیا، جو اُس کے قبضے سے نکال کر بادشاہ کے علاقے میں شامل کردی گئی تھی۔ (اِس طرح اُسے بھی) اپنے ساتھ ملالیا، اور جاٹ کی فوج کو بھی اِسی طرح ڈھبایا، پھر ایسی ہڑ بونگ مچاتے ہوئے کہ اُس کا نہ لکھنا ہی بہتر ہے، ایک ہفتہ میں فرید آباد کے پاس پہنچ گئے اور پایاب دریا کو پار کرلیا، دو تین دن تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر ایک دن (باقاعدہ) جنگ بھی چھڑ گئی۔ اِس طرف سے بھی نجف خاں (کے علاوہ) بلوچوں[1] نے اور موسیو مدک فرنگی[2] نے جو نجف خاں کے ورغلانے سے جاٹ کی نوکری چھوڑ کر اِس شامت زدہ فوج کے ساتھ آملے تھے۔ — میدان جنگ میں بڑی بہادری دکھائی۔ نمک حرام "مغلیہ" (فوج) نے جب دکھنی فوج کا چھترا دیکھا تو (ڈر گئے اور) پیٹھ دکھا کر بھاگے اور رسوائی مول لی۔ کچھ اجل رسیدہ[3] لوگ جن کے بدن پر (ڈھنگ کی) وردی بھی نہ تھی مفت میں زخم کھا کھا کر ہلاک ہوئے۔

---

[1] یہ دسمبر ۱۷۷۱ء کا واقعہ ہے۔ بلوچوں سے وہ فوج مراد ہے جو موسوی خاں کے بھائی سید محمد خاں بلوچ کی کمان میں تھی (زوال ۳/۵۰) ذکرِ میر مطبوعہ میں طباعت کی غلطی سے "دلبوجان" چھپا ہے اور موسی مدک فرنگی کے ساتھ اس لفظ کے ذکر سے یہ التباس پیدا ہوتا ہے کہ "دلبوجان" بھی کوئی فرنگی نام ہوگا۔ موسی مدک یا موسیو مدک (RENE MADEC) پہلے بھرتپور کی ملازمت میں تھا اُسے چھوڑ کر ۱۵۔ نومبر ۱۷۷۲ء کو دہلی آیا۔ ۱۷۔ نومبر کو شاہ عالم کے دربار میں باریاب ہوا۔ بادشاہ نے اِسے "نواب شمس الدولہ بہادر قائم جنگ" خطاب کے علاوہ شش ہزاری ذات و سوار کا منصب دیا۔ (زوال ۳ ۴۶)

[2] اِس کا نام RENE MADEC ہے موسیو فرانسیسی تعظیمی لقب MONSIEUR ہے موسیو مدک کے حالات میں دیکھیے E. BARBE: L'Nebob Rene Madec

[3] دسمبر ۱۷۷۲ء (زوال ۳/۲)

اِدھر کی فوج کا ایک دستہ میدان صاف دیکھ کر بے تکلف شہر میں گھس آیا، اور شاہی ہاتھی نیز بہت سا اسباب اُن بھگوڑوں کے سروں پر لاد کر لے گیا۔ کچھ حواس باختہ لوگ جو وہاں جمع ہوئے تھے چشم زدن میں صاف ہو گئے۔ ایک گھڑی رات گئے تک حسام الدین خاں معدودے چند (سپاہیوں) کے ساتھ ریتی (پرانے قلعہ کے پیچھے جمنا کا مغربی کنارہ) میں ڈٹا رہا پھر (وہاں سے) اُٹھ کر بادشاہ کے پاس آیا۔ آدھی رات گئے نجف خاں بھی چند مظلوموں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر اپنی حویلی میں داخل ہو گیا۔ پرانا شہر جس میں (پہلے ہی) کہیں کہیں آبادی تھی اِس حادثے میں از سرِ نو لُوٹا گیا۔ ہم غریبوں کو حافظِ حقیقی نے اپنی حفاظت میں رکھا۔ صبح کو اُدھر کے بہادروں میں مقاوَمت کی تاب نہ تھی جو میدان میں اُترتے۔ شہر پناہ کی دیوار کے ساتھ مورچال درست کر کے وہ دن تو بادلیج (توپ) کی جنگ میں گزارا۔ بادشاہی اقبال نے کام کیا، ورنہ (دشمن) قلعۂ مبارک کو بھی اُڑا دیتے۔ (رہے اِدھر والے تو) اُن کا سلیقۂ جنگ اور استعداد (حرب) تو اُسی دن معلوم ہو گئی تھی جب فوجِ مرہٹہ کی آمد آمد سن کر بہتوں کے ہوش پرّاں ہو گئے تھے، اور توپخانے کے لوگوں نے جنگی سامان مثلاً توپ و رہکلہ، جزائر اُفتادہ، سرب و باروت و بان وغیرہ کی تیّاری کے لیے حضورِ اقدس میں عرضی دی تھی۔ متصدیوں نے میر آتش کو ـــ جو برف سے بھی ٹھنڈا ہے ـــ صرف سَو روپیہ ادا کیے۔ اُس کی ہیئت اور مونچھیں اگر دیکھو تو یہ مغالطہ ہو گا کہ مَرد ایسے ہی ہوتے ہیں مگر (وہ بزدل) ایسا کونے میں دَبکا کہ جب تک لڑائی ہوتی رہی اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ آخر تیسرے دن حسام الدّولہ سوار ہو کر گئے اور اُن لوگوں کے حسبِ منشا صلح کر کے (واپس) آئے۔ بارے نیا شہر (لُوٹ سے) محفوظ رہا۔ اب دکھنی (سردار) مختار (حسام الدّولہ) کے اِشارے پر نجف خاں اور نمک حرام مغلیہ (سپاہ) کو نکالنے کی فکر میں ہیں۔ دیکھتا ہوں کہ کیا صورت ٹھہرتی ہے اور یہ اِدبار زدہ (مغلیہ) کس

طرح شہر سے نکلتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟

القصہ سیندھیا۔ جو دکھنیوں کا تیسرا سردار تھا۔ جے پور کی طرف چلا گیا۔ دوسرے سردار دریا (جمنا) کے اُس پار جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ غالب (خیال) ہے کہ وہ فرخ آباد کے راستے سے جھانسی جائیں اور وہاں سے شجاع الدّولہ کے ملک کی خرابی کا سبب بنیں۔

نجف خاں کا اخراج
جنوری ۳ ۱۷۷۲ء

(سانحہ) چونکہ عام طور پر شہر کے لوگوں کی زبانوں پر تھا کہ نجف خاں وغیرہ سردار اور شورہ پشت مغلیہ (فوج) تنخواہ کا مطالبہ کرنے کی سوچ رہے ہیں اور جیسے ہی مرہٹے کوچ کر کے جائیں گے یہ جم غفیر بادشاہ کے دروازے پر دھرنا دے کر متصدّیوں کو پریشان کرے گا اور اپنی تنخواہ مانگے گا۔ لہٰذا حسام الدّولہ نے (جو مختار تھا) دکھنیوں سے کہا کہ یہ لوگ نمک حرام اور دنگئی ہیں جس طرح بھی ہو انھیں (یہاں سے) رگیدنے کی فکر کرو۔ (چنانچہ اب) اُن کے اشارے پر مرہٹہ سردار اِس قوم (مغلیہ) کو شہر بدر کرنے کی گھات میں ہیں۔ یہ قدغن کر دی گئی ہے کہ کوئی مغل شہر میں نہ رہے۔ جب اِس بات نے طول پکڑا اور شاہی مُتصدّی قلعہ میں جا کر بیٹھ گئے، اور عوام کو بھی شہر بند کر دیا، تو بظاہر اِس بے حقیقت گروہ نے لاہوری دروازے تک مورچے باندھ کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی اور بباطن اگرچہ مرہٹوں سے نپٹنے کی طاقت نہ تھی مگر اُن سے اُلجھ گئے۔ جب ہنگامہ آرائی سے کام نہ بنا اور دیکھا کہ ہم مقابلہ کرنے میں مارے جائیں گے تو ناچار (شہر سے) نکلنے پر آمادہ ہوئے اور مرہٹوں سے عہد و پیمان کر لیے۔ دو تین روز کے بعد[1] نجف خاں اور دوسرے مغل سردار اپنے سب ساتھیوں سمیت اُن کے

[1] میر نے یہ سطریں ۱۷۔ جنوری ۳، ۱۷۷۲ء کے آس پاس لکھی ہیں۔ اِسی تاریخ کو مرہٹوں نے نجف خاں کی حویلی واقع موری گیٹ کا محاصرہ کیا تھا۔ اِس کے بعد ۲۰۔ جنوری کو باہم تصفیہ ہو گیا اور نجف خاں نے مع اپنی فوج کے تین ہزار روپیہ یومیہ پر مرہٹوں کی ملازمت قبول کر لی تھی۔ (زوال ۲/۵۳)

لشکر میں چلے گئے۔ دکھنیوں نے ـــــ جو ظاہری سلوک اور مراعات کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کرتے ـــــ اِس نابکار گروہ کی آؤ بھگت میں کوتاہی نہیں کی، لیکن وہ عزت جو بادشاہ کی نوکری میں تھی یہاں ملنا معلوم ـــــ کچھ دنوں میں یہ بے حقیقت جماعت پراگندہ ہو جائے گی اور ہر شخص کسی (نہ کسی) طرف چلا جائے گا۔ مشہور یہی ہے کہ مرہٹے بالفعل اِن سب لوگوں کو اکبر آباد تک اپنے ساتھ لے جائیں گے اور وہاں سے اجازت دے دیں گے کہ جو جہاں جانا چاہتا ہے چلا جائے۔[1]

حاصل یہ کہ شرارت پیشہ مُغل اور سراپا فساد مرہٹے، قریب ہے کہ چلے جائیں اور حضرت ظلِّ سُبحانی اپنی ذاتِ قُدسی صفات اور دو تین مُحرّروں کے ساتھ بغیر کسی تشویش کے قلعۂ مبارک میں تشریف رکھیں۔ اگر دن میں سَو بار بھی قلعہ کے ایک ایک کنگرہ پر سیر کرنے کو آئیں تو کون ہے جس کا حجاب مانع ہو؟ اور اگر بازار میں پیدل نکل آئیں تو حاجب کہاں ہیں جو "دُور باش" کہیں۔ ڈھنگ یہ نظر آتے ہیں کہ اہلِ حرفہ سر بصحرا نکل جائیں گے اور سپاہی پیشہ (لوگ) بھیک کے لیے ہاتھ پھیلاتے پھریں گے۔ ہر شخص اپنا راستہ لے گا۔ شہر بڑا بارونق ہو جائے گا![2]

حُسام الدین خاں کا حشر
۱۷۷۲ء

(سانحہ) تازہ یہ ہوا کہ جب دکھنیوں نے نجف خاں کو ساتھ لے کر دریا کے اُس پار جانے کا قصد کیا تو نصرانیوں کی پُشت پناہی سے وزیرِ حال (شجاع الدولہ) یلغار کرتا ہوا اپنے صوبہ (اودھ) سے فرّخ آباد تک پہنچ گیا اور (مرہٹوں کے) مقابل[3] ہوا۔ چونکہ دکھنی (فوج کے) سرداروں نے خود کو اِس مَوقف میں نہیں پایا کہ اُن کا مقابلہ کر سکیں، قریب تین مہینے قیل و قال میں گذار کر (آخر) صلح کے خواہاں ہوئے۔ چونکہ وزیر بھی مانا ہوا

---

[1] دیکھو۔ زوال ۳/۵۲-۵۳

[2] اِس پیراگراف میں جو طنز کی تلخی ہے اُس سے اُن سیاسی حالات میں میر کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

[3] رک: (زوال ۳/۵۳ - پولیر ۳۴-۳۵)

سُورما تھا (اُس نے صلح کی پیشکش کو) غنیمت جانا اور قبول کرلیا۔ آخر نجف خاں کو حضورِ (شاہ) میں (اپنا) مُختارِ کار بنا کر اپنے صُوبے کو روانہ ہوگیا۔ دکھنی اور پُوربی بھی اپنے معاملات اُسے سونپ کر اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں کی طرف چلے گئے۔ جب نجف خاں شہر میں داخل ہوا تو حسام الدّولہ کا رنگ فق ہوگیا۔[1] دو تین روز گھر میں (دبکا) بیٹھا رہا۔ اس کے بعد بادشاہ نے قلعہ میں بلا کر اپنے چند سالہ حساب کے کاغذات طلب کیے اور اُسے وہیں حراست میں رکھ لیا۔ مجد الدّولہ عبدالاحد خاں پسرِ عبدالمجید خاں مغفور نے جو خاص شاہی کارپردازوں میں سے تھا، راجا ناگرمل کی تبدیلی کے بعد دیوانی خالصہ کا خلعت پہنا اور شاہی مختارِ کار ہوگیا۔[2] آخر کار بادشاہ نے حُسام الدین خاں کو، جو مختار الملک تھا، قید کرکے[3] زرِ شاہی اور مغلوں کی تنخواہ کے سلسلے میں آٹھ لاکھ روپیے کے عوض فتح خاں درّانی وغیرہ کے حوالے کردیا۔[4] وہ اُسے قلعہ سے اپنے گھر لے گیا۔ اب مغل مختار ہیں، چاہیں مار ڈالیں، چاہیں (زندہ) چھوڑیں۔ ع:

"این شامتِ اعمال قیامت بسر آورد"

---

[1] یہ صلح ۲۱۔اپریل ۱۷۷۳ء کو ہوئی تھی اور نجف خاں ۲۰۔مئی ۱۷۷۳ء کو شہر میں داخل ہوا تھا۔ (زوال ۳/۵۵۔۳/۶۰)

[2] اس کا خطاب "مجد الدّولہ بہرام جنگ" تھا۔ اور یہ ۲۲۔مئی ۱۷۷۳ء کو مختار بنا تھا۔ (زوال ۳/۶۱)

[3] یہ ۵۔جون ۱۷۷۳ء کو قید کیا گیا (زوال ۳/۶۲) نجف خاں نے پانچ دن کے بعد اسے آزاد کرا دیا تھا۔ مگر ۱۴۔جون کو مہدی قُلی خاں گرفتار کرلیا گیا جس نے عماد الملک کے زمانۂ وزارت میں دہلی والوں پر بہت مظالم کیے تھے۔ اسے ۱۲۔جولائی ۱۷۷۳ء کو ہاتھی کے پیروں تلے روندوا دیا گیا تھا۔ میرؔ نے یہ سطریں جون ۱۷۷۳ء میں لکھی ہیں جب حسام الدین خاں مُغلوں کی قید میں تھا۔

[4] (زوال ۳/۶۱۔۶۳) متن "ذکرِ میر" میں "ہشت صد لک روپیہ" ملتا ہے اور یہی نسخۂ رامپور میں بھی ہے۔ بظاہر ہشت لک ہونا چاہیے۔

[بظاہر تو حُسام الدین خاں کو مرا ہی سمجھو، کیونکہ وہ جانی دشمنوں کے نرغے میں پھنس گیا ہے جو تا بمقدور اُسے جیتا نہ چھوڑیں گے۔ آگے خدا کو اختیار ہے کیونکہ وہ تو ہر شئے پر قادر ہے[لہ]۔]

تین سال سے فقیر کا حال یہ ہے کہ کوئی قدردان تو درمیان میں ہے نہیں، اور زمانہ سخت تنگ ہو چکا ہے۔ خدائے کریم پر توکّل کر کے — جو رزق دینے والا اور قوّت و اقتدار والا ہے — گھر میں پڑا ہوا ہوں۔ ظاہری اسباب یہ ہیں کہ چند عزیزوں سے مثلاً ابُوالقاسم خاں، برادرِ خُرد عبدالاحد خان مجدُ الدّولہ، نیز وجیہ الدّین خاں برادرِ حُسام الدّین خاں، اور بہرام خانِ کلاں کے بیٹے بیرم خاں — جو آدمیّت میں یکتائے روزگار ہیں — اور قُطب الدّین خاں پسرِ سعد الدّین خاں خانساماں — اگرچہ اِن کی عمر کم ہے مگر ذہین ہیں اور سعادت مندی سے خالی نہیں — نیز قاضی لُطفِ علی خاں جو بڑے سلیقے سے زندگی بسر کرتے ہیں، اِن سب سے کبھی کبھی ملتا رہتا ہوں خواہ اُن سے کوئی فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے۔ بس توکّل کا سرمایہ یہی لوگ ہیں۔ کبھی ایسا بھی اِتّفاق ہو جاتا ہے کہ کوئی مجھے فقیر یا شاعر، یا مُتوکّل جان کر کچھ بطریقِ نذر بھیج دیتا ہے۔ مقامِ شُکر ہے۔ اکثر قرضدار رہتا ہوں اور نہایت عُسرت میں زندگی گذار رہا ہوں۔ القصّہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے[ٰلہ]۔

جاٹوں سے جنگ

(سانحہ) عبدالاحد خاں جو دیوان خالصہ ہو گیا تھا اور بادشاہ کے مزاج میں دخیل تھا، مختار بن گیا۔ جو جی میں

لہ قوسین کی عبارت نسخۂ رامپور میں ملتی ہے۔ اور وہ نسخہ اِسی عبارت پر تمام بھی ہو جاتا ہے۔ وہاں اِس کے بعد وہ عبارت ہے جو آگے آرہی ہے یعنی "تین سال سے فقیر کا حال یہ ہے کہ ..." اِس کے بعد عبرت و خاتمہ ہے یعنی: "القصہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے ..." اِس کے زمانۂ تحریر وغیرہ کی بحث کے لیے دیکھو "مقدمہ"

ٰلہ ذکرِ میر کا نسخۂ رامپور اِس عبارت پر تمام ہو جاتا ہے۔

آتا تھا کرتا تھا، کسی کو چُوں کرنے کی مجال نہ تھی۔ شاہی فوج کا حال پتلا اور بادشاہ قلاش تھا، بس شہر اور چند دیہات (اُس کے تصرف میں رہ گئے تھے اُن پر) گذارا کرنا کیسے ممکن تھا؟ جاٹ یعنی سورج مل کی اولاد درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تک قابض ہو چکے تھے، جو شہر سے تین چار کوس پر ہے۔ نجف خاں بادشاہ کے حضور میں عرض کرتا تھا کہ: "حضرت۔ زندگی یوں (گذارنا) تو ظاہر ہے (کہ بے مزہ ہے) ہاں اگر یہ علاقہ، جو جاٹوں نے ہتھیا لیا ہے، مل جائے تو خوش و ناخوش گُذران ہو سکتی ہے۔" بادشاہ جواب دیتا تھا: "شاید تم خواب دیکھتے ہو۔ چھوٹے منھ سے بڑی بات کرنا کیا ضرور ہے؟" وہ کہتا: "اگر ایسا ہو جائے تو حضور مجھے کیا دیں گے؟" بادشاہ نے کہا: "مُلکِ (مفتوحہ) میں سے ایک تہائی میرا باقی سب تمھارا۔" چونکہ اِس (جاٹ) قوم کی شامت منڈلا رہی تھی، ایک دن اُن کی فوج گڑھی[۱] کے میدان میں آگئی جو درگاہ خواجۂ مسطور علیہ الرحمۃ کے قریب ہی ہے، اور وہاں دَھما چوکڑی مچانے لگی۔ نجف خاں (اپنے) لوگوں کو، جن کے پاس (ڈھنگ کا) سامان بھی نہ تھا، لے کر حالتِ اضطرار میں اُن پر دَوڑ پڑا۔ وہ (جاٹ) تو مغرور تھے ہی، اِنھیں خاطر میں نہ لائے۔ معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ مگر جب باقاعدہ جنگ چھڑی تو (ایسا پانسا پلٹا کہ) جو تصور میں بھی نہ تھا وہ ہو گیا۔ یعنی شام تک (نجف خاں کی فوج نے) میدان مار لیا۔ شاہی فوج کے آدمی رات کو تو کچّا اناج چبا چبا کر وہیں پڑے رہے اور خوشی کے شادیانے بجاتے رہے۔ اگلی صبح کو آگے بڑھے اور بلّم گڑھ کا محاصرہ[۲] جا کیا جو شہر (دہلی) سے بارہ کوس کے

[۱] سُورج مل نے گڑھی کے میدان میں ایک قلعہ بھی تعمیر کر لیا تھا۔ یہ دہلی سے ۱۲ میل اور قطب صاحب سے پونے دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ (زوال ۳/۶۶)

[۲] یہ قلعہ دہلی سے ۲۵ میل جنوب میں واقع ہے۔ نجف خاں نے یہ محاصرہ اکتوبر ۱۷۷۳ء میں کیا تھا۔ (زوال ۳/۶۷)

فاصلے پر (جاٹوں کا ایک) مضبوط قلعہ تھا۔ چند دن تک توپ و رہکلے کی جنگ ہوتی رہی۔ وہاں کے سردار نے کہا[1] کہ (صرف) قلعہ پر قبضہ کر لینے سے جاٹوں کی جنگ کا خاتمہ نہیں ہوگا آگے جاؤ اور (بڑے) سرداروں سے جو جنگ (درپیش) ہے اُسے جیتو۔ یہ قلعہ تو میں بغیر جنگ کے خالی کر کے (تمھیں) دے سکتا ہوں ــــ نجف خاں اِس کم سنی کے باوجود بات کی تہ کو پہنچنے والا سردار تھا۔ اُس قلعے سے ہاتھ اُٹھا کر اور اُسی سردار کو وہاں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا جب ہوڈل[2] کے قریب پہنچا، جو جاٹوں کا مقبوضہ قصبہ تھا، تو (ایک اور) مشکل پیش آئی یعنی اُدھر سے بھاری فوج آکر مقابلے پر ڈٹ گئی۔ اب یہ ایک اور بڑی مہم سر پر آپڑی۔ جاٹوں کا سردار جس کا نام نَول سنگھ تھا بھاری لاؤ لشکر اور بڑے توپ خانے کے ساتھ آکر مقابل ہوا۔ جنگ کا ہنگامہ ہوا، اور آسمان نے بہتوں کو خاک و خون میں لٹا دیا، رفتہ رفتہ زمین تنگ ہونے لگی اور جنگ کا انجام سامان (رسد) کی کوتاہی پر ہوا۔ شاہی فوجیوں نے فاقوں کی کثرت اور تباہی کے باعث زندگی سے ہاتھ دھو کر مقابلہ کیا مگر منھ کی کھائی اور مارے گئے۔ چونکہ اِس قوم (جاٹ) کی شامت سے اُن کی فتح ہونی تھی ادھر کے سرداروں نے "اُتارا" کیا (پیادہ ہو کر لڑنا شروع کیا) اور میدان مار لیا اور وہ بھاری لاؤ لشکر شکست کھا کر واپس ہو گیا۔[3]

---

[1] یہ سردار اجیت اور ہیرا سنگھ نامی تھے جو نَول سنگھ کے خلاف نجف خاں سے مل گئے تھے۔

[2] بادنی کھیڑا جو پلول سے چھ میل جنوب میں ہے، اِس سے نو میل جنوب کی سمت نول سنگھ تھا۔ نجف خاں نے سیکری، فتح پور بلوچ میں پڑاؤ ڈالا تھا یہ مقام بلّم گڑھ سے ۵ میل جنوب میں اور پلوَل سے نو میل شمال میں ہے۔ (٦٧/٣)

[3] یہ جنگ ٣٠۔ اکتوبر ١٧٧٣ء کو لڑی گئی۔ اس میں نجف خاں کے ٢٣٠٠ سپاہی کام آئے تھے اور نَول سنگھ کے دو ہزار آدمی مارے گئے تھے۔ (تفصیل: زوال ٦٩/٣-٧١، نیز ٨١/٣-٨٣)

نجف خاں جیت گیا
۱۱۹۲ھ - ۱۱۸۹ھ

سمرو نام کا فرنگی[۵۱] جو اُدھر کے توپ اور رہکلے لے کر بڑی جرأت کے ساتھ دیر تک جما رہا تھا، دن کے آخری حصّے میں وہ بھی بھاگ گیا۔ نجف خاں جس کی سرکردگی میں یہ عظیم کام انجام پایا تھا بہت اِترایا۔ اور بھی جس نے یہ ماجرا سنا بھونچکّا رہ گیا۔ جاٹوں کا سردار (نول سنگھ) اپنے قلعے میں جاکر بیمار پڑ گیا۔ یہاں نجف خاں کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور وہ بڑا رئیس بن گیا۔ اگرچہ پاس پَلّے کچھ نہیں تھا زبانی جمع خرچ سے دَم دِلاسے دیتا رہا۔ جو آتا تھا نوکر ہو جاتا تھا۔ چند روز میں دریاے بیکراں کی طرح وسیع لشکر جمع ہو گیا۔ یہ اگرچہ مُفلس تھا، مگر چرب زبانی سے اپنا کام نکال رہا تھا۔ جب دیکھا کہ اِن طفل تسلیوں سے فوج نہیں رہتی، تو ہمّت کرکے (اپنے) سرداروں کو جاٹوں کے محالات کی طرف بھیجنا شروع کر دیا۔ بارے یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ خود اُس نے ڈیگ کے قلعے کا گھراؤ کر لیا، جو[۵۲] وہاں سے بارہ کوس پر تھا۔ اتّفاق سے وہاں کا سردار (نول سنگھ)، جو (پہلے سے) بیمار تھا، مر گیا۔ اُنھوں (جاٹوں) نے سُورج مل کے چھوٹے بیٹے رنجیت سنگھ کو (گدّی نشین کرکے) جنگ کرنا شروع کیا۔ اِس قلعہ کے داروغۂ توپخانہ نے اِدھر کے سرداروں سے سازش کر لی اور قلعہ میں گھُسنے کا راستہ بتا دیا۔ یہ لوگ یُورش کرکے اندر گھُس گئے اور شہر کی لوٹ مار کرکے (بھی) بہت فائدہ اُٹھایا۔ ہر بے حیثیت کو دو دو گٹھری سامان ہاتھ آیا۔ بہت سا سامان اور بے شمار توپخانہ نجف خاں کو بھی ملا۔[۵۳] اِس فوج کے قلقچی مالدار ہو گئے۔ سات آٹھ دن کی لوٹ مار کے بعد وہ قلعہ

---

۵۱ والٹر رینہارڈ سومبرے (Walter Reinhard Sombre) جسے عام طور پر سَمرو کہا جاتا ہے۔ اُس کی بیگم بھی تاریخی شخصیت ہے جس کی کوٹھی دہلی میں آج بھی "پتھر والی" مشہور ہے۔

۵۲ نجف خاں نے ڈیگ کا محاصرہ جنوری ۱۷۷۶ء میں کیا تھا، اور اس سے پہلے ۱۱- اگست ۱۷۷۵ء کو نَول سنگھ مر گیا تھا۔ (زوال ۳/۸۳-۳/۱۵۹)

۵۳ ۲۹- اپریل ۱۷۷۶ء (زوال ۳/۸۶)

اُس نے سردار کے حوالے کر کے آگے کوچ کیا۔ اب کُھیر کا رُخ کیا، جو اُس کا دوسرا قلعہ تھا۔ رنجیت جو اِس قوم کا سردار ہو گیا تھا، اس قلعہ کو خالی کر کے اور آلاتِ جنگ ایک طرف پھینک کر، بھرت پور چلا گیا جو ایک مضبوط قلعہ ہے۔ یہ لوگ اس شہر پر بھی قابض ہو گئے اور بہت سامان سپاہیوں کے ہاتھ آیا۔ مجبور ہو کر جاٹوں نے صلح کا پیغام بھیجا۔ کشوری جو رنجیت کی ماں ہے، اور شعور سے بہرہ رکھتی تھی، خود آئی اور صلح کی خواہش کی[1] نجف خاں، بھرت پور انھیں دے کر اور اِس مہم کو پھر کسی وقت کے لیے ملتوی کر کے، آگرے چلا آیا۔ جو ایک مضبوط راجدھانی ہے اور جس پر جاٹ قابض تھے۔ یہاں آ کر قلعہ کی جنگ میں جُٹ گیا۔ چونکہ اِقبال یاوَر تھا، تھوڑی سی مدّت میں نقب لگا کر اُس پر قبضہ کر لیا۔ جو سردار جاٹوں کی طرف سے وہاں تعینات تھا، اُسے وعدے وعید کر کے نکال دیا۔ وہاں کے لوگوں سے (اچھا) سُلوک کیا اور پورے صوبے پر قابض ہو گیا۔ جسے چاہتا تھا وہاں کے محالات تنخواہ میں دیتا تھا کچھ ہی دنوں میں اِس تمام مُلک کا مالک ہو گیا۔ اُدھر سب راجوں اور زمینداروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ اب اگر جاٹ کوئی حرکتِ مذبوحی کرتے بھی تو ایسی منھ کی کھاتے کہ پھر (بھول کر بھی) اُدھر کا رخ نہ کرتے۔

جب نجف خاں اِس تمام ملک[2] کا مالک ہو گیا اور اُس کی کمان چڑھ گئی تو عبدالاحد خاں کے سامنے ڈُون کی لینے لگا۔ یعنی سلطنت کا مدار اب اُس کی ذات سے وابستہ ہو گیا۔ بادشاہ نے اُس کے قول کے مطابق ملک کے تہائی حصّے کا سوال کیا تو اُس نے حضور میں آ کر عرض کیا کہ یہ ساری فوج جو میرے ساتھ ہے، ملک کو

---

[1] فروری ۱۷۷۸ء (زوال ۳: ۸۷-۱۱۳)

[2] جن علاقوں پر نجف خاں نے قبضہ کیا تھا وہ یہ تھے: گڑھی ڈیگ۔ کھیر۔ اکبر آباد۔ متھرا۔ بندرابن۔ کول (علی گڑھ)۔ جلیسر۔ کامان۔ ۱۲۔ جون ۱۷۷۴ء سے ۲۱۔ اپریل ۱۷۷۵ء تک نجف خاں دہلی ہی میں تھا (زوال ۳: ۷۵)

بطورِ تنخواہ میں نے اس کے آدمیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حضرت مجھ سے تیسرے حصۂ ملک کی قیمت لے لیں۔ بادشاہ کو اُس کے جھوٹے وعدوں پر اطمینان نہ تھا کہنے لگا: "اِتنا ملک ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔" عبدالاحد خاں کی زور آوری کے سامنے اُس کا یہ داؤں نہ چل سکا ناچار ملک کے تیسرے حصّے کے محالات بطورِ مختار الگ کر کے دیے، اور اُسے میر بخشی گری کا خلعت عطا ہوا۔ امیر الامرا ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کے حضور سے اجازت لے کر اکبر آباد (آگرہ) چلا گیا۔

عبدالاحد خاں اور سکھ ۱۷۷۸ء

یہاں عبدالاحد خاں نے سکھوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور جو کچھ جمع پونجی تھی وہ اُن کو دے ڈالی۔ پھر اس بھاری فوج کے بھروسے پر شہزادہ فرخندہ[۱] اختر کو ساتھ لے کر راجا پٹیالہ پر چڑھائی کر دی۔ اُس کا ارادہ تو یہ تھا کہ جیسے ہی موقع ملے سکھوں کو نجف خاں سے بھڑا دے۔ (اب بھی اگرچہ) اُدھر (پٹیالے کی طرف) جا رہا تھا مگر خیال اِدھر (نجف خاں) ہی کا تھا۔[۲] رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بہت سے لوگ امیر الامرا (نجف خاں) کے لشکر سے علیحدہ ہو کر (عبدالاحد خاں) مختار کے نوکر ہو گئے۔[۳] چونکہ یہ ملک دار نہ تھا، اور معاملاتِ ریاست سے نابلد تھا، ہر کام اَدھورا چھوڑ دیتا تھا۔ (یہاں بھی) کچھ دنوں تو جما رہا پھر سکھوں کے مشورہ سے راجا (پٹیالہ) سے صلح کر لی۔ جو کچھ جمع پونجی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اب بادشاہ سے روپیہ طلب کیا۔ بادشاہ اِس مطالبہ سے بہت بددل ہوا اور لکھ بھیجا کہ جیسے بھی تم سے بن پڑے وہاں رہو، میرے پاس تو روپیہ ہے نہیں۔[۴]

---

[۱] یہ مرزا جہاں شاہ فرخندہ بخت پسر شاہ عالم کی طرف اشارہ ہے جسے ساتھ لے کر عبدالاحد خاں نے سرہند پر حملہ کیا تھا۔ دہلی سے یہ لشکر ۳۔ جون ۱۷۷۹ء کو نکلا تھا اور اسی سال اکتوبر میں واپس ہوئی تھی۔ (۳/۱۱۸-۱۳۰) فرخندہ بخت نے ۶۔ مئی ۱۷۸۱ء کو انتقال کیا۔ (۳/۱۵۴)

[۲] عبدالاحد خاں کا کیریکٹر دیکھو (زوال ۳/۱۲۱) یہ درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ میں مدفون ہے۔

[۳] مئی ۱۷۷۹ء تک عبدالاحد خاں کی فوج ۳۰ ہزار ہو گئی تھی (۳/ ۱۲۰-۱۲۱)

[۴] شاہ عالم ثانی کی اقتصادی حالت کے لیے دیکھو (زوال ۳: ۱۳۴-۱۳۸)

حافظ رحمت خاں کی شہادت

۲۸ راپریل ۱۷۷۴ء - ۱۶ر صفر ۱۱۸۸ھ

(سانحہ) وزیر اعظم امیر معظم نواب شجاع الدولہ جو بہت زور آور تھا حافظ رحمت (خاں) روہیلہ سے، جو اُس کی ہمسری کا دعوی کرتا تھا، اور خصومت رکھتا تھا، جنگ کرنے نکلا۔ حریف (حافظ رحمت) نے ازراہِ بداندیشی انگریزوں کو لکھا تھا کہ وزیر جو اتنی سپاہ اکٹھی کر رہا ہے تم سے اُلجھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ گورنر بہادر جو "صاحب" (کہلاتا) ہے۔ جنگ کے ارادے سے نکل کر آگیا تھا۔ نواب وزیر جو اِس بالادست قوم (انگریز) کا زیادہ سے زیادہ پاس کرتا تھا، اُن کے یہاں اکیلا ہی پہنچ گیا اور کہا: "میں تمھارا تو لحاظ کرتا ہوں مگر اَور کسی کے سامنے اپنی بات ہیٹی نہیں ہونے دُوں گا اس میں چاہے کچھ ہو رہے۔ یا تو مجھے اپنے ساتھ ہی کلکتہ لے جاؤ یا ریاست کو میری مرضی پر چھوڑ دو۔" انگریزوں نے وزیر کا سلوک دیکھ کر تمام چیزوں سے ہاتھ اُٹھالیا۔ کڑا (مانک پور) اور الہ آباد (کے اضلاع) بھی اُسی کے حوالے کر دیے اور چلے گئے۔ اب آسمانِ شعبدہ گر نے ایک نیا ہی شگوفہ کھِلایا اور زمانہ دگرگوں ہوگیا۔

جب وزیر وہاں سے پلٹا تو اُس کے لشکر میں بہت سے فرنگی مقدمۃ الجیش تھے اور جنگ کا اہتمام اُنھوں نے اپنے انداز پر کر رکھا تھا۔ جب روہیلوں نے یہ ٹھاٹیں مارتا ہوا لشکر دیکھا تو سہم گئے۔ ضابطہ خاں اور دوسرے چند سرداروں نے دس بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ آکر اظہارِ اطاعت کیا کہ "ہم لوگ آپ کے دولت خواہ ہیں اور سرتابی نہیں کریں گے۔" وزیرِ اعظم نے خدا کے فضل و کرم پر نظر کر کے حکم دیا کہ اچھا (ہماری) فوج کے پیچھے صف آرا ہو جاؤ۔ اگر چہ بعض سرداروں نے کہا بھی کہ یہ قوم غدار ہے اِس پر بھروسا نہ کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ عین جنگ کے موقع پر گڑبڑ کرے۔ مگر وزیر بھی واقعی بہادر تھا اُس نے بھوں سکیڑ کر کہا۔

"اِن کا زور مجھے معلوم ہے۔ چٹکیوں میں مَسل دوں گا۔"

صاحبزادہ آصف الدّولہ بہادر، جو اب وزیر اعظم ہیں، جنگ کے میدان میں بڑی سرگرمی سے لڑے۔ جدھر کا رُخ کرتے دھوئیں اُٹھا دیتے تھے۔ توپخانے کے زنجیرے تلوار سے کاٹ ڈالتے تھے۔ جب جنگ اپنے شباب پر آئی، تو حریف جو غرقِ آہن تھا موم سے بھی نرم پڑ گیا۔ (ادھر سے) اتنے گولے برسائے گئے کہ کشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ جب زمین (حافظ پر) تنگ ہو گئی اور اُس نے دیکھا کہ نہ بھاگنے کا راستہ ہے نہ ٹِکنے کی سکت، تو دل کڑا کر کے میدان میں ڈٹ گیا اور دنیا سے دل اُٹھا کر جان پر کھیل گیا۔ ایک ہی یورش میں اِس گروہ کی جان کے لالے پڑ گئے۔ (بڑے بڑے) دلاوروں کے پِتّے پانی ہو گئے۔ ایک گولا (حافظ رحمت خاں[۱]) کے سینے پر لگا۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ دشمن کا سر گیند کی طرح (لُڑھکا کر) لے گئے جب اِس فاتح لشکر میں لا کر دکھایا تو روہیلوں نے تصدیق کر دی (اور کہا کہ) ہر عمل کی جزا اور ہر کرتُوت کی سزا (ضرور ملتی) ہے۔ جب یقین ہو گیا کہ (حافظ) مارا گیا تو وزیر اس فتح کے

---

[۱] حافظ رحمت خاں روہیلہ ۲۳۔ اپریل ۱۷۷۴ء کو کٹرا میران پور کے میدان میں شہید ہوئے وہ مغلوں کے دورِ زوال میں ایک جری، باہمت، دیانت دار، اور پاک باطن سردار تھے۔ اگر شجاع الدّولہ نے انگریزوں سے سازش کر کے اُن کے ساتھ غدّاری نہ کی ہوتی تو اُنھوں نے ہندستان کی تاریخ کو شاید دوسری طرح ہی لکھوا لیا ہوتا۔ مگر نوابانِ اودھ کا دامن محسن کُشی، طمع و آز اور بداعمالیوں کی سیاہیوں سے ہمیشہ داغ دار رہا ہے چنانچہ شجاع الدّولہ کی بدباطنی نے اپنے ہی نہیں اپنے باپ کے بھی اِس محسن کو پوری طاقت سے کچل کر روہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا اور روہیلوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے شمالی ہند میں انگریزوں کو اپنے قدم مضبوطی سے جما لینے کا موقع فراہم کر دیا۔ باقی احوال کے لیے دیکھو۔ (۱) اخبار الصنادید: مؤلفہ نجم الغنی رامپوری مطبع نولکشور۔ جلد دوم۔ ۱۹۱۸ء۔ (۲) تاریخ اودھ حصّہ دوم۔ مؤلفہ نجم الغنی مطبع نولکشور ۱۹۱۹ء۔ (۳) حیاتِ حافظ رحمت خاں۔ مؤلفہ الطاف علی بریلوی۔ نظامی پریس بدایوں۔ (۴) گلستانِ رحمت مصنفہ نواب مستجاب خاں بہادر خلفِ حافظ رحمت خاں۔ (انگریزی ترجمہ از چارلس ایلیٹ۔ لندن ۱۸۳۱ء) دید و دریافت۔ نثار احمد فاروقی۔ مضمون "مولوی مَدن کی سی"۔ دہلی ۱۹۶۴ء۔

روہیلوں کی ایک تاریخ جو فارسی آمیز پشتو میں کاظم خاں شیدا نے حافظ رحمت کی فرمائش پر لکھی تھی اُس کا ایک قلمی نسخہ حال ہی میں (۱۹۷۲ء) نیشنل میوزیم نئی دہلی نے خریدا ہے۔ یہ حافظ رحمت کے ہم عصر ماٰخذ میں ایک اہم کتاب ہے۔

شکرانے میں سر بسجدہ ہوا۔ (حریف کا) لشکر لُٹ گیا، اور زن و فرزند قید کر لیے گئے اور سارا ملک وزیر کے قبضہ میں آگیا۔ نجف خاں جو آگرے سے آکر اس جنگ میں وزیر کے لشکر سے مل گیا تھا رخصت ہو کر پھر آگرے چلا گیا۔

میری خانہ نشینی
۱۷۷۲ء - ۱۱۸۸ھ

فقیر (میر) اِن دنوں خانہ نشین تھا۔ بادشاہ نے اکثر طلب کیا، نہیں گیا۔ عبدالاحد خاں مختار کا چچیرا بھائی اور الوالبرکات خاں صوبہ دارِ کشمیر کا لڑکا ابُوالقاسم خاں[1]، میرے ساتھ گونہ مراعات برتتا تھا۔ کبھی کبھی اُس سے ملاقات ہو جاتی تھی کبھی (کسی تقریب سے) بادشاہ بھی کچھ بھجوا دیتے تھے:

مصرعے گاہ گاہ میگویم — کارِ دنیاے من ہمین قدر است

(کبھی کبھار کوئی مصرع کہہ لیتا ہوں۔ بس اب میری دنیا یہی رہ گئی ہے)

شجاع الدّولہ کی وفات
۲۵ جنوری ۱۷۷۵ء - ۲۳ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ

اِس فتحِ عظیم کے بعد وزیر اعظم امیرِ معظم نواب شجاع الدّولہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ اپنے صوبہ میں داخل ہوا۔ لیکن آسمان کی نظر تو اہلِ دنیا کی خرابی پر لگی رہتی ہے۔ اِس انبوہِ پُر شکوہ کو بھی نظر کھا گئی۔ یعنی اُس بہادر اور لائق وزیر کو آب و ہوا کی تبدیلی سے ایسا مرض لاحق ہوا جس کا تدارک مشکل ہو گیا۔ ہر چند طبیبوں اور فرنگی (ڈاکٹروں) نے معالجے[2] میں کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ (وزیر نے) جب دیکھا کہ بیماری بڑھتی ہی جا رہی ہے تو از راہِ دانشمندی اپنے خلف الصدق آصف الدّولہ بہادر کو مسندِ وزارت پر بٹھا دیا جو نہایت شایستہ کار، جری، عالم مدار،

---

[1] الوالقاسم خاں کا لقب اعظم الدولہ تھا۔ اسے عبدالاحد خاں نے اکتوبر ۱۷۷۵ء میں سہارن پور کا فوجدار بنا کر دہلی سے روانہ کر دیا تھا۔ ۴ مارچ ۱۷۷۶ء کو ضابطہ خاں کی فوجوں سے اس کی جھڑپ شروع ہوئی۔ مظفر نگر سے آٹھ میل شمال میں امیر نگر کے مقام پر ۱۱ مارچ ۱۷۷۶ء کو مارا گیا۔ اُس کے دونوں پیروں میں لنگ تھا۔

[2] چہار گلزارِ شجاعی میں فرنگی کا نام فراسیس ملتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو تاریخ اودھ ۲/۲۹۴۔

اور فیض واحسان کا سرچشمہ ہیں۔ اور خود اِس دنیا سے کنارا کر گئے۔ اِس امیر بزرگ کے ماتم میں سارا عالم سیاہ پوش ہوگیا۔ یہ عجب حادثہ رونما ہوا۔ اگر آسمان ہزاروں سال گھومتا رہے تب کہیں ایسا ہمہ تن جرأت اور سراپا مروت سردار پیدا ہوتا ہے۔

مختار الدّولہ کی وفات

کچھ دنوں کے بعد مختار الدولہ کو بھی جس کے ہاتھوں میں صوبہ داری اور وزارت کی ذمّہ داریاں تھیں زمانے نے مہلت نہ دی اور وہ بسنت نامی خواجہ سرا کے ہاتھ سے مارا گیا[ل] اور عدم کو سدھارا۔ اب نیابت کا عہدہ حسن رضا خاں سرفراز الدّولہ بہادر کو ملا۔ یہ ایک سنجیدہ، متواضع، خلیق اور اوصافِ حمیدہ کا مالک سردار ہے۔ صفتِ کرم اُس کی تمام صفاتِ حمیدہ پر غالب ہے اور حسنِ سلوک سے وضیع و شریف کی دلجوئی کرتا رہتا ہے۔ اُس کی عنایات میرے ہی حال پر نہیں، بہتوں پر ہیں۔ خدا اُسے سلامت رکھے۔

(سانحہ) مختار (عبدالاحد خاں کشمیری) کے روپیہ طلب کرنے سے بادشاہ کُڑھا ہوا (تو بیٹھا ہی) تھا۔ اُس نے ذوالفقار الدّولہ نجف خاں کو لکھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہاں پہنچو۔ وہ بادشاہ کی شہ پا کر دلیرانہ اور شیرانہ (آگرہ سے) شاہ کے حضور میں روانہ ہوا۔ عبدالاحد خاں یہ خبر پاتے ہی کہ امیر الامراء نجف خاں آرہا ہے نہایت بدحواسی میں شہزادہ اور سکھوں کی فوج کو ساتھ لے کر بھاگم بھاگ (دہلی) آیا اور نجف خاں مذکور کے (شہر میں داخل ہونے کے) دو دن پہلے قلعہ کا بندوبست سنبھال کر بیٹھ رہا۔

نجف خاں کا زمانہ

(جب یہ) شور ہوا کہ ذوالفقار الدولہ آگیا تو بادشاہ نے اُسی

ل دیکھو عماد السعادت ص ۱۲۹۔

مختار (عبدالاحد) کو پیشوائی کے لیے بھیجا[۵۱]۔ یہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ گیا اور ملاقات کی۔ سوار ہوتے وقت دونوں ایک ہی ہاتھی پر بیٹھے۔ نجف خاں نے عبدالاحد خاں کو مُنافق جان کر ظاہر داری کا برتاؤ کیا اور قلعے کے دروازے تک میٹھی باتوں میں لگا کر لے آیا۔ یہاں (آکر) اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ میری توپ رہکلہ اور فوجیں بے تحاشا قلعے کے اندر گُھس جائیں اور جگہ جگہ (مورچہ بنا کر) کھڑی ہو جائیں۔ ہر چند ان دونوں کے درمیان صرف ایک چاقو کے پھل کا فاصلہ تھا اگر (نجف) چاہتا تو ایک ہی وار میں مختار کا کام تمام کر دیتا لیکن اُسے بادشاہ کی بندگی کا خیال رہا کہ آخر یہ بھی حضور کا ملازم ہے پہلے بادشاہ کی مرضی معلوم کر لینی چاہیے پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔

جب اِس ہنگامے کے ساتھ بادشاہ کے سامنے آیا، اور باریاب ہوا، تو دیکھا کہ آقا (بادشاہ) اُس سے بھرا بیٹھا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اُس کا کام تمام ہو جائے۔ یہ وہاں سے پلٹ کر بیچ بازار میں آن کھڑا ہوا[۵۲] اور عرضی بھیج دی کہ میں نے حضور کا خیال کر کے دست اندازی نہیں کی تھی، اب جب تک عبدالاحد خاں کو اپنے ساتھ نہ لے لُوں یہاں سے نہ ٹلوں گا۔ بادشاہ نے ظاہر میں تو (صلح) کی بات چیت کی لیکن خفیہ طور سے یہی کہا کہ جس طرح بن پڑے اِسے یہاں سے لے جاؤ۔ چونکہ مختار کے سپاہی[۵۳] مجبور ہو کر جا چکے تھے اور سکھ الگ تھلگ رہے۔ ناچار اُس نے قول و قسم کیے کہ نجف خاں میرے

---

۵۱ نجف خاں نے ۱۲ر نومبر ۱۷۷۹ء کو دہلی کے جنوب میں کشن داس کے تالاب پر خیمہ لگایا تھا اور یہیں عبدالاحد خاں شہزادہ اکبر شاہ کو ساتھ لے کر اُس کی پیشوائی کے لیے ۱۴ر نومبر ۱۷۷۹ء کو آیا تھا۔ اِسی دن دونوں قلعہ میں داخل ہوئے۔ نجف کی ایک ہزار سپاہ کو لے کر افراسیاب خاں نے قلعہ پر قبضہ کیا تھا۔ (۱۲۶/۳-۱۲۷)

۵۲ قلعہ سے نکل کر نجف خاں مسجد روشن الدولہ میں آکر بیٹھ گیا تھا اور یہاں سے عبدالاحد کی گرفتاری کے مطالبے پر مشتمل عرضی بھجوائی تھی۔ (۱۲۸/۳)

۵۳ عبدالاحد خاں کی سپاہ سے لطافت علی خاں اور میر سیّد علی ٹوٹ کر نجف سے مل گئے تھے۔ (۱۲۸/۳-۱۲۹)

ساتھ بدی نہ کرے اور میری عزت کے درپے نہ ہو۔ بادشاہ نے کہا: "میں ضامن ہوں۔ تم بے کھٹکے چلے جاؤ۔" جب کوئی چارا نہ دیکھا اور زمانہ کو بدلا ہوا پایا تو شام کے وقت ایک ہاتھی پر سوار ہو کر قلعے سے نکلا[1]۔ امیر الامرا (نجف خاں) جو بازار میں انتظار کر رہا تھا خود بھی سوار ہوا اور اپنے ہاتھی کو اُس کے ہاتھی کے برابر رکھ کر اپنے گھر لے گیا۔ اور وہاں اُسے حراست میں رکھا[2]۔ چند دن تو لیت و لعل میں گذارے کہ آج بادشاہ کے پاس جاؤں گا، کل لے جاؤں گا، اور آخر کہہ دیا کہ وہاں جا کے کیا کرو گے بہتر ہے کہ یہیں میرے پاس رہو۔ لیکن اُس کے مال و منال پر دست اندازی نہیں کی۔ بیس روپیہ روز اپنے پاس سے مقرر کر دیے اور چند خدمت گار اُس کے پاس چھوڑ دیے۔ خود بادشاہ کے ملکی و مالی معاملات میں مصروف ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ (نہایت با اختیار اور) بلند مرتبہ ہو گیا اُس کے عُلوے مرتبت کے باعث لوگوں کی اتنی آمد و رفت رہتی تھی کہ اُمرا کو مجرے کا موقع بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جس دن وہ بادشاہ کے حضور میں آتا (اُسی دن) دربار ہوتا ورنہ بادشاہ اپنے چند مُصاحبوں کے ساتھ پڑے رہتے تھے۔ چونکہ وہ جوان تھا اور شاہجہان آباد ایک طلسم خانہ ہے، یار لوگوں[3] نے اُسے عیش و عشرت کی جانب مائل کر دیا۔ مکروہات کے استعمال اور عورتوں کی تماش بینی میں اتنا منہمک ہوا کہ بدن سے طاقت زائل ہو گئی[4]۔ آخر مرضِ سل میں گرفتار ہو گیا۔ طبیبوں نے

[1] عبدالاحد خاں کی نظر بندی ۱۵ر نومبر ۱۷۷۹ء کو ہوئی تھی۔ اس کے بعد نجف نے اپنے لیے (وکیلِ مطلق) کا عہدہ حاصل کر لیا تھا جو مغلوں کے دَورِ آخر میں مادھوجی سیندھیا کے سوا اور کسی کو نہیں ملا۔ (۳/۱۲۹)

[2] نجف خاں نے اپنے رہنے کے لیے نواب قمر الدین خاں کی حویلی حاصل کر لی تھی یہ موجودہ قاضی حوض اور اجمیری گیٹ کے درمیان واقع تھی۔

[3] اسے عیش و عشرت کی طرف مائل کرنے والا، دراصل نواب آصف الدولہ کا نائب لطافت علی خاں خواجہ سرا تھا۔ (زوال ۳/۱۳۲)

[4] نجف خاں دو سال اور چار ماہ "وکیلِ مطلق" رہا۔ ۹ر نومبر ۱۷۷۹ء سے ۶ر اپریل ۱۷۸۲ء تک۔ اور یہ پورا زمانہ دہلی ہی میں گذرا۔ اس نے ۶ر اپریل ۱۷۸۲ء کو انتقال کیا۔ بیماری کا سلسلہ ۱۷۸۱ء کے ماہِ اگست سے شروع ہوا تھا اور ۱۷۸۲ء کے ابتدائی تین ماہ بہت شدائد میں گذرے تھے (باقی برصفحۂ آیندہ)

اُس کے علاج میں بہتیرے ہاتھ پانو مارے مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔" جب (زندگی سے) مایوس ہوگیا تو بڑی حسرت سے کہتا تھا کہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ بس اتنی تمنّا ہے کہ زندہ رہ جاؤں۔" اُس کی بیماری میں زمانے کا اور ہی رنگ بدلا۔

میری دلّی سے ہجرت
۱۷۸۲ء - ۱۱۹۶ھ

فقیر (میرؔ) خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے کہیں نکل جائے۔ مگر اسباب کا فُقدان قدم باہر نہیں نکالنے دیتا تھا (بارے) میری عزّت و آبرو کے تحفظ کے لیے نواب وزیر الممالک آصف الدّولہ بہادر آصفُ الملک کو خیال آیا کہ میرؔ میرے پاس نہیں آتا۔ اُسے بلاؤں۔ نواب سالار جنگ پسر اسحٰق خاں مؤتمن الدّولہ[۱] نے جو اسحٰق خاں نجم الدّولہ کے چھوٹے بھائی اور وزیرِ اعظم کے ماموں ہوتے ہیں، اُس پرانے رَبط پر نظر کرکے، کہ میرے (سوتیلے) ماموں (خانِ آرزو) اُن کے ساتھ (وابستہ) تھے، یہ کہا کہ اگر نواب صاحب از راہِ عنایت زادِ راہ کے لیے کچھ مرحمت فرمادیں تو میرؔ ضرور آجائے گا۔ حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ اُنھوں نے سرکار سے کچھ (زادِ راہ) لے کر مجھے خط لکھا کہ: "نواب والاجناب تمھیں طلب فرماتے ہیں جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ۔" میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا، خط پاتے

نجف خاں کا مقبرہ دہلی میں مسجد موٹھ کے قریب واقع ہے۔ اُس کے جنوب میں افراسیاب خاں (متوفی، ازذی الحجہ ۱۱۹۹ھ سہ شنبہ؟) کا مقبرہ ہے۔ (حوالہ: سیر المنازل)۔ میرؔ کا سفر لکھنؤ اُس کی بیماری کے زمانے میں ہوا ہے۔ (زوال ۳/۱۳۱-۱۳۲)

[۱] اسحٰق خاں مؤتمن الدّولہ کے اجداد شُوستر سے آئے تھے۔ یہ عہد محمّد شاہی کے امیر تھے۔ دیوانی خالصہ کے ساتھ خطاب مؤتمن الدّولہ پایا تھا۔ ۱۱۵۲ھ میں بحالتِ سجدہ انتقال کیا (تاریخ محمدی)؛ خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ فقیر کو اُن کی خدمت میں بیس برس سے زیادہ نیاز حاصل رہا۔ آرزو پر بہت نوازش کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو تذکرۂ مجمع النفائس (قلمی)۔ رامپور۔ گلِ رعنا (قلمی) ورق ۴۳ ب۔ (نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد)۔ تین تذکرے۔ مُرتّبۂ نثار احمد فاروقی۔ دہلی ۱۹۶۸ء۔

نواب سالار جنگ نے ۷ رجب ۱۲۰۱ھ / ۲۵ اپریل ۱۷۸۷ء کو انتقال کیا (چہار گلزارِ شجاعی عکس شعبۂ تاریخ۔ مُسلم یونیورسٹی۔ صفحہ ۵۵۳)۔ نیز ذخیرۂ ذاتی۔

ہی لکھنؤ کے لیے چل پڑا۔ چونکہ خدا کا ارادہ شامل (حال) تھا، بغیر یار و مددگار اور بے قافلہ و رہبر کے چند روز میں فرخ آباد کی راہ سے گذر ہوا۔

مُظفّر جنگ نے جو وہاں (فرّخ آباد) کے رئیس تھے، ہر چند چاہا کہ میں کچھ دن اُن کے ہاں ٹھہر جاؤں، مگر میرا دل نہیں گونجا۔ ایک دو دن بعد وہاں سے روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گیا۔ خدا اُنھیں سلامت رکھے، اُنھوں نے میری بڑی عزت کی، اور میرے لیے جو کچھ مناسب سمجھا بندگانِ عالی (آصف الدّولہ) کی جناب میں کہلا بھیجا۔

نوّاب آصف الدّولہ سے ملاقات

چار پانچ روز کے بعد، اتّفاقاً نواب عالی جناب مرغ لڑانے کے لیے تشریف لائے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے: "میر محمّد تقی ہو؟" (پھر) بڑی عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر لے گئے، اور مجھے مخاطب کر کے اپنے اشعار سُنائے میں نے کہا: سُبحان اللہ۔ بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔" فرطِ مہربانی سے مُجھے بھی (شعر خوانی) کا موقع دیا۔ اُس روز میں نے غزل کے چند شعر سنائے۔ جب نواب صاحب اُٹھ کر جانے لگے تو نواب سالار جنگ نے کہا کہ "میر حسبُ الطّلب آگئے ہیں۔ اب بندگانِ عالی مختار ہیں، اِنھیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں۔ اور جب مرضی مبارک ہو خدمت میں بُلوا بھیجیں،" (نواب آصف الدّولہ نے) فرمایا: "میں کچھ (تن خواہ) مقرّر کر کے[1] تمہارے پاس (اطلاع) بھیج دوں گا۔ دو تین دن بعد یاد فرمایا۔ میں حاضر ہوا، اور مدح میں جو قصیدہ کہا تھا، وہ سُنایا۔ سماعت فرمایا۔ اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں مجھے داخل کر لیا۔ (اب تک) میرے حال پر عنایات و کرم فرماتے ہیں۔

---

[1] سفینۂ ہندی/ ۲۰۵ اور تذکرۂ عیار الشعراء (خوب چند ذکاؔ) ورق ۲۱۷-الف (نسخۂ انجمن ترقی اردو) سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدّولہ نے میؔر کا دو سو روپیہ ماہانہ مقررِ کر دیا تھا۔ اُن کا تقرر "صیغۂ اُستادی" میں ہوا تھا۔

نجف خاں کی وفات
اپریل ۱۷۸۲ء - ۱۱۹۶ھ

میرے اِدھر آنے کے بعد نجف خاں جو وہاں بیمار پڑا تھا، مر گیا۔ اور شاہی کاروبار تلپٹ ہو کر رہ گیا[1] اُس کے چیلے مثلاً نجف قلی خاں[2] و افراسیاب خاں اور دوسرے سرداروں میں رسّاکشی شروع ہو گئی۔ کچھ دنوں یہ کھینچا تانی رہی، آخر مرزا شفیع جو اُس کے بھائیوں میں سے تھا اور سکھوں کی تنبیہ کے لیے فوج کشی کر رہا تھا، حضور (بادشاہ) کے اشارے پر حاضر ہوا اور عبدالاحد خاں کو اپنا چچا جتا کر، قید سے رہا کر دیا۔ دیوانی خالصہ بھی اسے دلادی اور خود مسندِ ریاست پر (نجف خاں کے جانشین کی حیثیت سے) متمکّن ہو گیا۔

نجف خاں کے جانشینوں کی رسّاکشی[3]

(سانحہ) چونکہ مرزا شفیع سفّاک و جرّار تھا، اِس لیے ہر شخص اُس سے خطرہ محسوس کرتا تھا۔ وہ نجف خاں کے چیلوں کی سرکشی سے بِھنّا گیا اور شہر ہی میں جنگ شُروع کر کے نجف قلی خاں کو گرفتار کر لیا۔ افراسیاب خاں بھی آکر بظاہر مرزا مذکور (شفیع) سے مل گیا لیکن اُس کا عروج دیر پا ثابت نہ ہوا۔ چند روز بھی نہ گذرے تھے کہ

---

[1] نجف خاں کے مرنے کے بعد، افراسیاب خاں نے دوآب (علی گڑھ)، محمد شفیع نے میرٹھ، نجف قلی نے میوات اور ریواڑی، اور محمد بیگ ہمدانی نے بھرتپور، الور، اور جے پور کے سرحدی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ نجف خاں نے اپنے پیچھے دو کم سن لڑکیاں چھوڑی تھیں۔ اولادِ نرینہ کوئی نہیں تھی۔ اِن لڑکیوں کو نجف کی بہن خدیجہ سلطان بیگم نے پرورش کیا۔ ان میں سے ایک کا نکاح مرزا شفیع سے کر دیا تھا۔ (دیکھو ۳/۱۳۹ - ۳/۱۵۸ - ۳/۱۶۶) عبدالاحد خاں ۱۶ر جون ۱۷۸۲ء کو رہا کیا گیا تھا۔

[2] نجف قلی خاں نومُسلم تھا۔ یہ افراسیاب خاں سے مل گیا تھا (۱۷ر جولائی ۱۷۸۲ء) اس کی ایک بیٹی نواب حسام الدین حیدر خاں نامی کو بیاہی تھی جن کے نام سے آج تک دہلی کے محلہ بلّیماران میں ایک حویلی موجود ہے۔ اُن کے بیٹے حسین مرزا اور نواسے یُوسف مرزا تھے جن کا حوالہ غالب کے خطوط میں جا بجا آتا ہے۔ حسین مرزا کی نواسی ذکیہ بیگم محمد حسین آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم سے منسوب تھیں۔ نامی کے ایک علاتی بھائی سید محمد خاں رند لکھنوی تھے۔ (تفصیلات ”نقوش“ لاہور شمارہ ۱۱۶۔)

[3] اپریل ۱۷۸۲ء سے نومبر ۱۷۸۴ء تک نجف خاں کے جانشینوں میں سخت رسّاکشی رہی۔ ۱۷۸۴ء تک لطافت خواجہ سرا، مرزا شفیع اور افراسیاب تینوں قتل ہو گئے تھے، اور عبدالاحد خاں کو دوبارہ قید کر لیا گیا تھا اس طرح محمد بیگ ہمدانی کے لیے میدان صاف ہوا ہی تھا کہ مرکزی سیاست پر مادھوجی سیندھیا کا اقتدار قائم ہو گیا۔

لطافت نامی[۵۱] خواجہ سرانے، جو وزیر الممالک (آصف الدولہ) کی طرف سے حضور (شاہ) میں رہتا تھا، اور فی الجملہ کچھ طاقت بھی رکھتا تھا — اور سمرو فرنگی کے رشتہ داروں[۵۲] میں سے ایک فرنگی نے، باہم سازش کی کہ جہاں بھی موقع ملے اُسے ختم کردیں، بادشاہ کو بھی سمجھایا کہ یہ شخص بدتمیز ہے۔ جب اُسے اپنے خلاف سازش کا علم ہوا، تو ذرا دیر صبر نہ کرسکا اور شہر سے نکل کھڑا ہوا (جاتے ہوئے) عبدالاحد خاں کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔[۵۳] (اُس کے فرار ہونے کی) جب تک اُنھیں خبر ہوئی اُس کا کوئی سراغ نہ پاسکے۔ بادشاہ نے شہر و اطراف کے لوگوں (رئیسوں) کو شقّے لکھے کہ جہاں بھی اُسے دیکھ پائیں ہرگز نہ چھوڑیں اور حضور (شاہ) میں لے آئیں۔ ایک (ایسی ہی) تحریر تلم گڑھ کے سردار کو بھی ملی، اور یہ — (مرزا شفیع) وہاں جاکر ٹھہرا ہوا تھا۔ سردار نے اُسے (بادشاہ کا) وہ شقّہ دکھایا تو بہت سراسیمہ ہوا۔ عبدالاحد خاں کو وہیں چھوڑ کر خود فرار ہوگیا اور ایک دو منزل آگے جاکر دم لیا۔ اکبرآباد پہنچ کر، جہاں محمّد بیگ ہمدانی[۵۴] کا تسلّط تھا، اُس سے عہد و پیمان کیے اور اُسے بادشاہ کے رفقا سے جنگ کرنے پر آمادہ کرلیا۔ وہ بیس ہزار سپاہ لے کر اُس کے ساتھ ہولیا۔[۵۵] یہاں فرنگی، خواجہ سرا اور دوسرے عزیز بادشاہ کو شہر سے باہر نکال لائے اور دریا (جمنا) کے کنارے خیمے گاڑ دیے۔ وہ لوگ اس سازش سے بے خبر تھے کہ موت منڈلا رہی

---

[۵۱] لطافت علی خان خواجہ سرا کے لیے دیکھو زوال ۳/۱۶۰

[۵۲] میر جسے سمرو فرنگی کا رشتہ دار بتا رہے ہیں یہ شاید پالی PAUL I ہے جو ایک جرمن کمانڈر تھا۔

[۵۳] مرزا شفیع عبدالاحد خاں کو ساتھ لے کر ۱۶ر اکتوبر ۸۲ ۱۷ء کو فرار ہوا تھا۔ (۳/۱۷۱)

[۵۴] میر نے غلطی سے دو جگہ احمد بیگ ہمدانی لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ طباعت کی غلطی ہو۔ اس کا نام محمد بیگ ہمدانی تھا یہ مغلیہ سپاہ کا سردار تھا اور اسمٰعیل ہمدانی اس کا بھانجا تھا۔ یہاں جس عہد و پیمان کی طرف اشارہ ہے وہ کوسی کے مقام پر ہوا تھا یہ طے پایا تھا کہ شفیع اُسے جے پور کا پورا خراج، نجف خاں کا نصف سامان، اور اسلحہ نیز چھ لاکھ روپیہ نقد یا جاگیر کی شکل میں ادا کرے گا۔ (۳/۱۷۱)

[۵۵] آگرے سے ہمدانی کی فوج ۶ر نومبر ۱۷۸۲ء کو روانہ ہوئی تھی۔

ہے۔ بڑے طنطنے کے ساتھ قریب پہنچے۔ بادشاہ نے جب دیکھا کہ اُس کی کمان چڑھی ہوئی ہے تو لطافت علی خاں خواجہ سرا اور فرنگی کو اُس کے لانے کے لیے آگے روانہ کیا۔ اُنھوں نے لپک کر خواجہ سرا کو گرفتار کر لیا اور فرنگی کو مار ڈالا۔ بادشاہ نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنی حفاظت کی۔ کچھ ان کا بھی (بادشاہ پر) زور نہ چل سکا۔ اب اُنھوں نے سوال جواب میں وقت لگاکر اور بہت سے لوگوں سے وعدے وعید کر کے اُنھیں اپنے ساتھ ملالیا۔ جب یہ سمجھ لیا کہ بادشاہ بغیر جنگ کے قابو میں نہیں آئے گا تو عبدالاحد خاں کو بیچ میں ڈال کر قول وقسم کیے اور اپنی بندگی و وفاداری کا یقین دلاکر اُسے خیمے سے قلعے میں لے[۵۱] آئے۔ نجف قلی خاں، افراسیاب[۵۲] خاں، اور عبدالاحد خاں نے متحد ہو کر سلطنت کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا اور ہمدانی[۵۳] کو جو میرزا شفیع سے قول وقرار کر چکا تھا یونہی ٹرخا دیا وہ چند توپیں اور رہکلہ لے کر اکبرآباد کو روانہ ہو گیا۔ یہاں چند دنوں کے بعد افراسیاب خاں اپنے محالات میں گیا اور مرزا مذکور نے شہر میں نجف قلی خاں سے جنگ کر کے اُسے گرفتار کر لیا۔[۵۴]

---

[۵۱] شاہ عالم نے قلعے سے نکل کر بارہ پُلہ کے مقام پر خیمے ڈالے تھے۔ مرزا شفیع اور ہمدانی کی فوجوں کا پڑاؤ خواجہ سرائے بدرپور نالہ کے قریب ہوا تھا۔

[۵۲] افراسیاب خاں کو نجف خاں کی بہن خدیجہ بیگم نے جانشین نامزد کیا تھا۔ اُس نے بادشاہ کو ایک لاکھ ۸۷ ہزار پیشکش دے کر، اور پانچ لاکھ کا وعدہ کر کے اشرفُ الدّولہ خطاب اور امیرالامرا میر بخشی اور مختار سلطنت کا عہدہ ۱۱؍اپریل ۱۷۸۲ء کو حاصل کیا تھا۔ (زوال ۳/۱۶۴)

[۵۳] لطافت علی خاں اور کپتان پالی PAULI ۱۷؍نومبر ۱۷۸۲ء کو ہمدانی کے کیمپ میں گئے تھے۔ ان کے ساتھ شاہ عالم کا ملازم خاص کلّو خواص بھی تھا۔ موخرالذکر کے ذریعہ ہمدانی کو یہ پیغام بھیجا گیا تھا کہ اگر وہ شفیع کا ساتھ چھوڑ دے تو اُسے میر بخشی کا عہدہ دے دیا جائے گا۔ ہمدانی نے اس سازش سے شفیع کو باخبر کر دیا تھا۔ اُس نے اسی قول وقرار کو محکم کرنے کے بہانے لطافت خواجہ سرا اور کلّو خواص کو اپنے کیمپ میں بلوایا تھا۔ یہ لوگ ۲۴؍نومبر ۱۷۸۲ء کو خیمہ سے نکل کر آئے تھے۔ اگلے دن ۲۵؍نومبر ۱۷۸۲ء کو لطافت کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا گیا اور پالی کو قتل کر دیا۔

[۵۴] ۳؍ستمبر ۱۷۸۲ء (۳/۱۶۹)۔

اور بیگم کے پاس — جو نجف کی بہن ہوتی ہے — بھیج دیا[۱]۔ عبدالاحد خاں اپنے گھر سے نکلا اور چرب زبانی سے پھر اپنا اُلّو سیدھا کر لیا[۲]۔ بیگم مذکور نے سفارش کر کے نجف قلی خاں کو رہا کرا دیا اور اُسے جاگیر پر بھیج دیا۔ رفتہ رفتہ مرزا شفیع کا تسلّط خوب ہو گیا[۳] اور وہ شہر سے نکل کر ملک گیری کی طرف متوجہ ہوا۔ چونکہ کوئی بھی اُس سے مطمئن نہ تھا، افراسیاب نے آ کر ہمدانی کو بُلایا اور یہ طے کیا کہ مرزا (شفیع) ہمدانی کی دلدہی کے لیے اُس کے خیمے تک آئے۔ (چنانچہ اُسے وہاں سے) لائے اور جھانسا دے کر قتل کر دیا۔ وہ مارا گیا تو افراسیاب خاں کا طوطی بولنے لگا[۴] اور ریاست کا انتظام اُس کے قبضے میں آگیا۔ ہمدانی پھر اپنے علاقے میں واپس چلا گیا اور یہ (بادشاہ) کے حضور میں امیرالامراء ہو کر امورِ سلطنت کے مختار ہو گئے۔

وارن ہیسٹنگز کا لکھنؤ میں استقبال (۱۱۹۸ھ - ۱۷۸۴ء)

(سانحہ) ادھر وزیرِ اعظم امیرِ معظم گورنر بہادر کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے جو اُن کی دعوت پر کلکتہ سے آ رہے تھے[۵] اور اس تمام ملک پر وہی غالب تھے۔ فوج کا غُبار آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ یہ سفر الٰہ آباد تک ہوا۔ اِس ضلع کے تمام سردار اُن کی

---

۱ عیدالفطر کی شب میں ۱۰ر ستمبر ۱۷۸۲ء کو گرفتار ہوا اور ۱۲ر ستمبر کو اسے خدیجہ بیگم کے پاس بھیج دیا گیا۔ (۱۶۹/۳)

۲ افراسیاب خاں نے یہ چال چلی تھی کہ میر بخشی کا تقرر ملتوی کرا کے عبدالاحد کو مختار بنوا دیا تھا۔ (۱۱ر اگست) (۱۷۴-۱۷۳/۳)

۳ مرزا شفیع کو ناصر الدولہ ذوالفقار جنگ خطاب کے ساتھ آگرہ کی صوبہ داری اور میر بخشی کا عہدہ ۱۵ر ستمبر ۱۷۸۲ء کو ملا تھا اور یہ "وکیلِ مطلق" ہو گیا تھا۔ مگر ایک ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔ اسے قلعۂ ڈیگ سے پانچ میل کے فاصلے پر ۲۵ر شوال ۱۱۹۷ھ/ ۲۳ر ستمبر ۱۷۸۳ء کو منگل کے دن قتل کیا گیا۔ اسمٰعیل بیگ ہمدانی نے اپنے خنجر سے کام تمام کر دیا تھا اور محمد بیگ ہمدانی نے معانقے کے بہانے سے اسے اپنی گود میں بھر رکھا تھا — (۱۷۹-۱۷۸/۳)

۴ افراسیاب خاں نے اکتوبر ۱۷۸۳ء میں عہدہ سنبھالا۔ ۲۲ر دسمبر ۱۷۸۳ء کو وہ آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس سفر میں سلیمان شکوہ اور خدیجہ بیگم اُس کے ساتھ نہ تھے۔ اُس کا لشکر ۴ر جنوری ۱۷۸۴ء کو قلعۂ آگرہ میں داخل ہوا تھا۔ (۱۷۳/۳)

۵ ہیسٹنگز کے سفر لکھنؤ کے لیے دیکھو چہار گلزار شجاعی (قلمی) ۲۷ ب و ۲۳ ۷ الف نیز عماد السّعادت ۱۳۵ - ۱۳۶ -

آمد آمد سے آگاہ ہو کر دیدار کے منتظر تھے۔ ایک منزل پہلے نواب گردُوں رکاب سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے اُنھیں اپنے ساتھ لکھنؤ تک لائے جو نواب کا محلِ سکونت ہے۔ ہر منزل پر نئی ہی ضیافت ہوتی تھی۔ نئے نئے خیمے، اچھے اچھے کھانے، ترکی و تازی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی[1] قیمتی پوشاک اور جواہر کی کشتیاں خوشگوار شربت، اَن گنت میوے، اِس علاقے کے نِت نئے تحفے، جنوب اور مغرب کی (بنی ہوئی) تلواریں، چاچی کمانیں، (ہر جگہ بہار دکھا رہی تھیں)۔ جب دارالقرار لکھنؤ میں آئے، اور محل میں داخل ہوئے، تو ہر روز بُوقلمُوں کے فرش، جن کے گوشوں میں عطر چھڑکا ہوا۔ اطرافِ مکان میں گلاب کا چھڑکاؤ، بسائی ہوئی سیجین، معطر لباس، مخمل کے اچھوتے فرش۔ سیم گِل کی ہوئی دیواریں، پردوں اور جھالروں سے آراستہ ایوان، بہارِ عنبر نے عجب بساط بچھا رکھی تھی۔ وہ مکان بہارستان پر سبقت لے گیا تھا۔ بُھنے ہوئے پستے اور بادام انگریزی پیڑیاں نُقل کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ راتوں کو رقصندگانِ پری وَش۔ نہیں نہیں حورانِ بہشتی سے بڑھ کر دلکش۔ شیشے اور چینی کے گُل دان سلیقے سے چُنے ہوئے۔ طاق تازہ میووں سے بھرے ہوئے۔ فرنگی رقص، خوشی کا تماشا، بلکہ گھر ہی خوشی کا مکان، شادمانی کی ہوا۔ شام کو چراغاں کر کے آتش بازی چھوڑتے تھے۔ ستارہ اور ہوائی آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔ چراغاں کا نظارہ دل کو لُبھا رہا تھا اور مہتابی رات کو دن کا نمونہ بنا رہی تھی۔ زربفت کا سائبان اِس خوبی سے تانا گیا تھا کہ سورج کی نگاہوں نے اُس کا مثل نہ دیکھا تھا۔ اُمراء پاسداری میں سرگرم راجا خدمت گذاری پر آمادہ۔ شاعرانِ مربوط اور جوانانِ مضبوط مدح خوانی کر رہے تھے۔ ہر گھر میں خوب سجاوٹ، ہر جگہ سایہ خوب پھیلا ہوا۔ پانی بہتا ہوا۔ نرگس دان قطار میں یوں رکھے تھے جیسے پائیں باغ (آراستہ ہو) اور برف گھلی ہوئی چاندی سے بھی اچھی اور بھلی لگ رہی تھی۔ رنگ برنگ کے گھلے فالودہ جن کا شربت شیرۂ جان تھا۔ قسم قسم کی

---

[1] رینکنگ (RANKING) ص ۱۳ کا بیان ہے کہ آصف الدولہ کے پاس ایک ہزار سے زیادہ ہاتھی تھے۔ (آرمی آوف مغلز ۱۸۰)۔
RANKING: Army of the Mughals p.180

روٹیاں دستر خوان پر۔ نانِ بادام بڑی نزاکت سے بنی ہوئی، شیر مال، باقر خانی، خورشید پر طعنہ زن۔ نانِ جوان ایسی گرمی اور خوبی کی، کہ بوڑھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ نانِ ورقی کی تعریف کروں تو دفتر بھر جائے۔ نانِ زنجبیلی کو دیکھ کر ذائقہ محظوظ (ہوتا تھا)۔ بھانت بھانت کے قلیے، دو پیازے، رکھے ہوئے تھے۔ تمام مہمانوں کو لطف آرہا تھا۔ کئی قسم کے کباب دستر خوان پر چُنے ہوئے تھے۔ 'کبابِ گُل'، تازگی اور خوبی سے بنا تھا' اور 'کبابِ ہندی' ایسا خوش نمک تھا کہ دل مُوہ رہا تھا۔ 'کبابِ قندھاری'، مزاجوں کو اپنی ہی طرف مائل کر رہا تھا۔ 'کبابِ سنگ'، راستے کے تھکے ماندے کی کوفت زائل کر رہا تھا۔ 'کبابِ ورق'، عجب ترکیب سے تلے گئے تھے کہ طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اور معروف کباب بھی سب ہی خوش ذائقہ اور لذیذ تھے۔ ایک ایک کے سامنے دس دس قابین رکھی تھیں۔ طرح طرح کے پلاؤ اور شوربے تھے۔ عجب عجب نعمتیں تھیں۔ سُبحانَ ذِی الجُودِ وَالاِکرَام۔

یہ مہمان اور وہ میزبان

ایسے وفور کا مہمان، اور نواب وزیر جیسا میزبان۔ ایسی شوکت والا مہمان، اور ایسی ثروت کا میزبان، ایسے حسنِ اخلاق والا مہمان، اور ایسی بڑی ریاست والا میزبان، ایسی عقلِ کامل رکھنے والا مہمان، اور ایسے لطفِ شامل کا میزبان، نہ زمانے کی آنکھوں نے دیکھا نہ عاقلوں کے کانوں نے سُنا۔ اِس طرح چھ مہینے تک رات دن گفت و شنید اور باہم صلاح و مشورے ہوتے رہے۔

فرنگی سے گٹھ جوڑ

جب یہ خبر (بادشاہ کے) حضور میں پہنچی تو وہاں کے امیروں میں سے ہر ایک اپنی فکر میں پڑ گیا۔ عبدالاحد خاں نے (اپنے) آدمیوں کو ادھر بھیجا اور فرنگیوں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ افراسیاب خاں وغیرہ کو گمان ہوا کہ فرنگی اِدھر آئے گا، چونکہ زبردست ہے بادشاہ کو بطورِ خود رکھ کر ہمارا پتّا صاف کرے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم بادشاہ کو آگرے لے جائیں[ل۱] وہاں لوگوں کو جمع کریں اور مرہٹہ کو — جو

ل۱ افراسیاب خاں ۱۶ ر جون ۸۴ء کو شاہ عالم کو لے کر دہلی سے نکلا اور یہ قافلہ ۶ ر اگست ۸۴ء کو آگرہ پہنچا تھا۔ (۳/۱۸۶)۔

گوہد والا کے رانا پر متصرف ہے[۱] — اپنے ساتھ ملالیں۔ پھر فرنگی سے نامہ و پیام کریں۔ اگر جنگ کی نوبت آتی ہے تو آجائیے، ورنہ اِسی ٹھاٹ باٹ سے وہاں رہیں۔ چنانچہ بادشاہ کو — (دلّی سے) نکال کر آگرہ لے چلے اور راستے میں عبدالاحد خاں کو قید کرلیا۔[۲]

شہزادہ جوان بخت

(سانحہ) جب (یہ لوگ) شہر مذکور میں پہنچے تو شہزادہ جوان بخت وہاں سے بھاگ کر نواب وزیر (آصف الدولہ) اور فرنگی کے پاس[۳] آگیا۔ (انھوں نے) گھبراہٹ میں مرہٹہ سے عہد و پیمان درست کیے۔ اُس نے ان کی طرفداری کی اور شہزادے کو واپس بھیجنے کی گفت و شنید شروع کردی۔ یہاں فرنگی آیے بالے بتاتا رہا کیونکہ اپنے ملک یعنی کلکتہ کا انتظام اُس کے مدِ نظر تھا۔

کچھ دن کے بعد شہزادہ کو ساتھ لے کر وزیر الممالک سے رخصت ہوا اور چلا گیا۔ رخصت ہوتے وقت نواب والا جناب نے صاحب کے ملازموں کو اتنے بے حساب انعام او ربخشش سے نوازا جو قیاس میں نہیں آسکتی۔ ہر شخص کو گھوڑا، ہاتھی، ارقبا (عطا کی) اور ہر بے سر و پا کو سراپا (خلعت) دیا۔

افراسیاب خاں کا قتل

۲ نومبر ۱۷۸۴ء / ۱۵ ذی الحجہ ۱۱۹۸ھ

جب صاحب دریا کے راستے سے چلے گئے اور نواب وزیر اپنے دار القرار (لکھنؤ) میں واپس آگئے تو مرہٹہ اور افراسیاب خاں نے محمد بیگ ہمدانی سے پرخاش کا ارادہ کیا۔ اُس نے بھی مونچھ نیچی نہیں کی اور ان سے بھڑنے کو آمادہ ہوگیا۔ اِسی اثنا میں میر زین العابدین برادرِ مرزا شفیع کے آدمی نے افراسیاب خاں

---

[۱] گوالیار کی ریاست مراد ہے جو پہلے رانا گوہد والا کے قبضہ میں تھی اور بعد میں اُس پر مادھوجی سیندھیا نے قبضہ جمالیا تھا۔

[۲] عبدالاحد خاں کو ۳۰ جون ۱۷۸۴ء کو قید کیا تھا۔ بعد کو اُسے علی گڑھ کے قلعہ میں نظر بند کردیا گیا تھا۔ (۱۸۵/۲)

[۳] میر کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادہ جوان بخت آگرہ سے فرار ہوا تھا۔ وہ شاہ عالم کے سفر آگرہ سے بہت پہلے ۱۴ اپریل ۱۷۸۴ء کو دہلی کے قلعہ سے نکلا تھا۔ اُس رات شدید آندھی چل رہی تھی۔ وہ ۶ مئی ۱۷۸۴ء کو لکھنؤ میں آصف الدولہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ (۱۸۴/۳)۔

کے خنجر گھونپ دیا[۱] (جس سے) وہ دو چار دن کے بعد مر گیا۔ اِن دنوں حضور میں کوئی سردار نہیں ہے، اور بادشاہ بے زور ہے۔ غالب (گمان یہ) ہے کہ مرہٹے کا دَور دَورہ ہو جائے گا۔[۲]

اِن سانحوں کے بعد مرہٹہ اور محمد بیگ ہمدانی کی فوجوں میں جھڑپ ہوئی۔ جب اس پر غلبہ نہ پا سکے تو دھوکا دے کر ہمدانی[۳] مذکور کو قید کر لیا۔ ادھر صاحب (وارن ہیسٹنگز) نے جو شہزادہ (جوان بخت) کو اپنے ساتھ لے گیا تھا[۴] (اُسے وہاں سے) رخصت کر دیا۔ چنانچہ وہ (شہزادہ) — واپس آ گئے ہیں۔ (اب) یا تو اطراف میں (کہیں) رہیں گے یا بادشاہ کے حضور میں پہنچ جائیں گے۔ فی الحال تو نواب عالی جناب کے سایۂ دولت میں ہیں۔ جو کچھ (نواب وزیر) کہتے ہیں وہی یہ کر رہے ہیں۔

شکار نامے

محرم ۱۱۹۹ھ / نومبر ۱۷۸۴ء

یہاں فقیر (میرؔ) نواب عالی منزلت (آصف الدّولہ) کے ساتھ ہے اور اُن کی دعا گوئی میں بسر کر رہا ہے۔ بندگانِ عالی شکار کے لیے بہرائچ تک گئے۔ میں بھی رکاب میں تھا۔ ایک "شکار نامہ" موزوں کیا۔ دوبارہ[۵] پھر شکار کے لیے سوار ہوئے اور —

---

[۱] چہار گلزارِ شجاعی کے مؤلف کا بیان ہے کہ افراسیاب خاں سیندھیا سے ملنے کے لیے اُس کے ڈیرے پر گیا تھا وہاں تقریباً دو گھڑی رہا۔ جب اپنے گھر واپس آ کر پوشاک تبدیل کر رہا تھا تو اُس کے ملازم نے خنجر گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ (صفحہ ۵۳۸)۔ یہ فتح پور سیکری سے آٹھ میل جنوب مغرب میں مقام کھنوا کا واقعہ ہے۔ میرؔ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ افراسیاب "دو چار روز کے بعد" مرا۔ اُس پر حملہ ۳۰ اکتوبر ۱۷۸۴ء کو دن میں گیارہ بجے کے قریب ہوا تھا اور اُسی دن ساڑھے تین بجے وہ مر گیا تھا۔ البتہ اُس کی موت کو چند روز تک پوشیدہ رکھا گیا۔ لاش فتح پور سیکری ہی میں دفن کی گئی۔ اس دور کے سرکاری اخباروں میں قاتل کا نام مِدّو بیگ بتایا گیا ہے۔ (تفصیل: زوال ۳/ ۱۹۰)۔

[۲] "دَور دَورہ ہو جائے گا" یہاں تک میرؔ نے نومبر ۱۷۸۴ء میں لکھا ہے۔ اس کے بعد کے چند صفحے مختلف اوقات میں تقریباً پانچ سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔

[۳] میرؔ کا یہ بیان درست نہیں کہ مرہٹوں نے کوئی بہانہ کر کے ہمدانی کو قید کر لیا تھا۔ ہمدانی نے خود ہی اپنی پوزیشن کمزور دیکھ کر ۱۰ نومبر ۱۷۸۴ء کو صلح کر لی تھی۔

[۴] شہزادہ جوان بخت نے بنارس کا سفر ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ اکتوبر ۱۷۸۶ء میں کیا ہے۔ یہ سطریں اِس سے پہلے ہی لکھی گئی ہیں۔

[۵] چہار گلزارِ شجاعی کے بیان کے مطابق آصف الدّولہ دوسری بار، آخرِ ماہ محرم ۱۱۹۸ھ (دسمبر ۱۷۸۳ء) میں شکار کے لیے سوار ہوئے تھے۔ یہ سفر کوہستانِ پیلی بھیت کی طرف ہوا تھا۔ لیکن بظاہر یہ کتابت کی غلطی ہے۔ سنہ ۱۱۹۹ھ زیادہ صحیح ہوگا۔ یہاں سے تین ماہ کے بعد ربیع الاول ۱۱۹۹ھ/ جنوری ۱۷۸۵ء میں واپسی ہوئی تھی۔ (چہار گلزارِ شجاعی (قلمی) ورق ۲۶۵)۔ اِسی سال آصف الدّولہ بیمار ہوئے تھے۔ یہ غالباً انفلوئنزا کا اثر تھا (چہار گلزار ۲۷۰)

کوہِ شمالی (ہمالیہ) کے دامن تک تشریف لے گئے۔ اگرچہ لوگوں نے اِس دور و دراز سفر کے نشیب و فراز سے بڑی زحمتیں اُٹھائیں مگر اُنھوں نے ایسی فضا، ایسی ہوا، اور ایسا شکار کبھی نہ دیکھا تھا۔ تین مہینے کے بعد اپنے دارالقرار (لکھنؤ) میں آئے۔ فقیر (میر) نے دوسرا "شکار نامہ" کہہ کر حضور میں پڑھا۔ (نواب صاحب نے) شکار نامے کی غزلوں میں سے دو غزلیں انتخاب فرمائیں۔ بنفسِ نفیس اُن کو مخمّس کیا۔ ایسی خوبی سے جو ہونی چاہیے۔ ایک زمین میں غزل پسند آئی اُس میں دوسری غزل کی فرمایش کی۔ خدا کے فضل سے وہ بھی موزوں ہو گئی۔ زبانِ مبارک سے تعریف فرمائی اور سخن وری کی داد دی۔

اِن دنوں تبدیلِ آب و ہوا کے باعث عشرۂ محرم الحرام کے بعد مزاجِ مبارک ناساز ہو گیا۔ علاج کیا گیا۔ لیکن بیماری نے نصیبِ اعدا، طول کھینچا۔ ایک عالم خیرات و صدقات سے بہرہ اندوز ہوا۔ ہر شخص نے صحت یابی کے لیے دعا کی۔ بارے حکیمِ مطلق و شافیِ برحق نے شفا دی۔ ہم پر اور مخلوق پر احسان کیا ع "الٰہی تا جہان باشد تو باشی"

مرہٹوں کا تسلّط
۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء

چونکہ بادشاہ کے حضور میں نجف خاں کے آدمیوں میں سے، جو برسرِ اقتدار تھے، کوئی باقی نہیں رہا، مرہٹہ[1] (مادھوجی سیندھیا) جو قریب ہی (گوالیار میں) تھا، مسلّط ہو کر دندنانے لگا۔ بادشاہ نے مرہٹے کو مختار کر دیا، اور نجف خاں کے آدمیوں کو ذلیل کیا۔ (اب) اکثر معاملات میں مرہٹے ہی سے مشورہ کیا جاتا ہے اور تمام اُمور اُسی کی منشا کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ مرہٹہ کی فوج شاہجہاں آباد دہلی پہنچ گئی ہے، اور یہ مشہور ہے کہ اُس نے (پوری طرح) تسلّط کر لیا ہے۔ سکھ جو شہر کے آس پاس لوٹ مچا رہے تھے اب چوکنے ہو گئے ہیں، کیونکہ وہ مرہٹوں سے ٹکّر نہیں لے سکتے۔ اور میدان داری (جنگ) میں اِن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بادشاہ شہر (آگرہ) کے باہر خیمہ زن تھا، چند دن کے بعد دہلی کو روانہ ہو گیا

---

[1] مرہٹہ سے مادھوجی سیندھیا مراد ہے۔ اِسے شوّال ۱۱۹۸ھ/اگست ۱۷۸۴ء میں شاہ عالم کی طرف سے خلعتِ ہفت پارچہ اور منصبِ امیر الاُمرا ملا تھا۔ یہ بعد کو "وکیلِ مطلق" ہو گیا تھا۔ (دیکھو ۳/۱۹۷-۳/۲۰۶-۲۰۸)

اور عبدالاحد خاں کو قید کر کے علی گڑھ بھیج دیا۔ جو نجف خاں کی بہن کے قبضے میں ہے، اور نجف خاں کی فوج کے بہت سے آدمی وہاں جمع ہیں۔ (اب) مرہٹہ مالک الملک ہے، جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ بادشاہ کو دست برداشتہ کچھ دے دیتا ہے[۵۱] اور جہاں چاہتا ہے اُسے لیے پھرتا ہے۔ چنانچہ شہر میں ایک مہینے رہا، پھر (شاہ کو) علی گڑھ لے گیا۔ دس پندرہ دن تک جنگ رہی۔ آخر عہد و پیمان کر کے بیگم کو قلعے سے نکالا اور اُس سے نجف خاں کے اموال میں سے کچھ لے کر[۵۲] چھوڑ دیا۔

راجپوتوں پر چڑھائی
اگست ۱۷۸۷ء

وہاں سے بادشاہ کو راجپوتوں پر (چڑھا کر) لے گیا۔[۵۳] انھوں نے مقاومت کی۔ کچھ دنوں کے بعد راجپوتوں سے صلح کر کے بادشاہ کو شہر (دہلی) میں آ گیا اور مرہٹہ شہر آگرہ میں رہ گیا۔ لیکن وہ برابر راجپوتوں (پر دوبارہ حملہ کرنے) کی فکر میں تھا، چنانچہ پھر چڑھائی کر کے اُدھر پہنچا۔ (راجپوت) راجاؤں نے ہمدانی کو بلا کر — جو نجف خانی سردار تھا — اپنا رفیق بنا لیا۔ جنگ ہوئی۔ ہمدانی[۵۴] نے جرأت دکھائی اور (لڑتا ہوا) مارا گیا۔[۵۵] سرداری اُس کی جگہ مرزا اسمٰعیل کو ملی، جو اُس کا بھانجا تھا۔ یہ بھی بڑی جگرداری سے لڑا اور مرہٹے کے فتنے کو اُسی نے دُور کیا۔ شکستِ فاحش ہوئی۔ مرہٹے کے اسبابِ جنگ اور آلاتِ حرب سارے چھن گئے۔[۵۶] اپنی جان بچا کر بھاگا اور آگرے آ کر دم لیا۔ یہاں بھی مرزا اسمٰعیل (تعاقب

---

[۵۱] مادھوجی نے شاہ عالم کا وظیفہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دیا تھا (نیو ہسٹری آف دی مراٹھاز۔ جلد ۳ صفحہ ۱۴۷)

[۵۲] مادھوجی سیندھیا نومبر ۱۷۸۵ء کے تیسرے ہفتے میں علی گڑھ پہنچا تھا۔ نجف خاں کے اموال سے جو "کچھ" حاصل کرنے کا میر نے ذکر کیا ہے اُس نے ۶۵ توپیں ۱۶ من بارود ایک ہزار من سیسہ اور ۴۰ ہزار روپیہ نقد لیا تھا۔ (۳/۲۰۶-۲۰۸)

[۵۳] راجپوتانے کی طرف ۳۰ر نومبر ۱۷۸۵ء کو رُخ کیا تھا۔ ہمدانی اور راجپوتوں کا گٹھ جوڑ ۲۵ر مئی ۱۷۸۷ء کو ہوا تھا۔ میر نے جس جنگ کا حوالہ دیا ہے یہ جنگِ تُنگا (بر وزنِ مُنگا) کہلاتی ہے۔ "تنگا" جگہ کا نام ہے یہ لال سُوٹ (الواؤ مجہول) کے قریب ہے۔ تفصیلات دیکھو۔ زوال ۳/۲۵۶ تا ۲۶۵)

[۵۴] محمد بیگ ہمدانی اِسی جنگ میں ۲۸ر جولائی ۱۷۸۷ء کو مارا گیا تھا۔ چہار گلزارِ شجاعی کے مؤلف نے اوائل ۱۲۰۱ھ لکھا ہے جو اکتوبر ۱۷۸۶ء کے مطابق ہوتا ہے۔

[۵۵] میر کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ ہمدانی لڑتا ہوا مارا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک گولا آ کر لگا (دیکھو ۳/۲۵۸) جنگ تنگا کی تفصیل (۳/۲۶۱-۲۶۰)۔

[۵۶] میر کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ مرہٹہ کے آلاتِ حرب چھین لیے گئے تھے۔ تفصیل دیکھو۔ زوال ۳/۲۶۰۔ سیندھیا یکم اگست ۱۷۸۷ء کو لال سُوٹ سے روانہ ہوا تھا اور ۸ر اگست کو قلعۂ ڈیگ میں پہنچا تھا۔ ۳/۲۶۵۔)

کرتا ہوا) پہنچ گیا اور اُسے شہر سے نکال کر خود قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کی جنگ نے طول پکڑا۔ مرہٹے نے اپنا فائدہ دوسری طرف دیکھا[۵۱]۔ بادشاہ شہر سے نکل کر نجف قلی خاں کے پاس[۵۲] جو حصار کی جانب (ریواڑی میں) تھا، چلا گیا۔ وہاں بھی بڑی بھاری جنگ ہوئی۔ آخر الامر نجف قلی خاں سے کچھ زر و مال لے کر شہر (واپس) آ گیا۔

غلام قادر خاں روہیلہ
جولائی تا اکتوبر ۱۷۸۸ء

اِس دوران میں ضابطہ خاں[۵۳] کے لڑکے نے جس کا نام غلام قادر تھا --- اور وہ اپنے باپ کے بعد سہارن پور وغیرہ پر قابض تھا --- طاقت جمع کر لی۔ اور سکھوں کی فوج کو (اپنے) ساتھ لے آیا۔ اور اکثر شاہی محالات جو دو آبے کے درمیان تھے ہتھیا لیے۔ قریب آ کر بادشاہ سے کچھ (نقد) طلب کیا۔ بادشاہ نے (کورا) جواب دے دیا۔ اب وہ دریا کے اُس پار[۵۴] مورچے جما کر جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ ایک مہینہ یا کچھ زیادہ جنگ رہی۔ بادشاہ کے پاس اگرچہ فوج یا طاقت نہیں تھی، تاہم وہ جی جان سے لڑا اور اِس بلا کو دُور کر دیا۔ (غلام قادر) وہاں سے اُٹھ کر آگرے کے نواح تک قابض ہو گیا۔ یہاں مرزا اسمٰعیل نے جو شہر (آگرے) میں قلعے کا محاصرہ کیے پڑا تھا اُس کی طاقت دیکھ کر دوستی کر لی۔ اور عہد و پیمان کیا کہ ہم تم مرہٹوں سے باہم جنگ کریں گے۔ چند روز کے بعد مرہٹہ (مادھو جی سیندھیا) بھی یلغار کرتا ہوا آن پہنچا جو چنبل پار جانے کی نیت سے آ رہا تھا۔ ان دنوں یہاں

---

[۵۱] "مرہٹے نے اپنا فائدہ دوسری طرف دیکھا" اِس سے میر کی مراد یہ ہے کہ اُس نے راجپوتانے کی مہم چھوڑ کر مالوہ کا پروگرام بنا لیا تھا۔

[۵۲] شاہ عالم ۱۹ر جنوری ۱۷۸۸ء کو آگرہ سے نکلا تھا اور ۱۲ر مارچ ۱۷۸۸ء کو ریواڑی پہنچا تھا جہاں اُن دنوں نجف قلی خاں حکومت کر رہا تھا۔ ۳/۲۷۲۔ یہاں سے شاہ عالم کی دہلی کو واپسی ۲۳ر مارچ ۱۷۸۸ء کو ہوئی تھی۔

[۵۳] سرکار کا بیان ہے کہ ضابطہ خاں نے آخر عمر میں سکھ دھرم قبول کر لیا تھا اور اُس کا نام دھرم سنگھ رکھا گیا تھا۔ یہ اُس نے اِس توقّع پر کیا تھا کہ شاید سکھوں کی فوج اُس کی مدد کرے اور کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس دلا دے۔ اُس نے بڑی بے کسی کے عالم میں ۲۱ر جنوری ۱۷۸۵ء کو انتقال کیا اور احاطہ درگاہ حضرت قطب صاحبؒ میں دفن کیا گیا۔ غلام قادر خاں اُسی کا بیٹا تھا۔ (سرڈیسائی / ۱۴۷۔ زوال ۳/۲۹۴)۔

[۵۴] دریا کے اُس پار سے میر کی مراد شاہدرہ ہے جہاں شاہ نظام الدین قادری نے ۲۳ر اگست ۱۷۸۷ء کو بادشاہ کی طرف سے مقابلہ کیا تھا۔

شہزادہ صاحب عالم موجود تھا لیکن اُس نے تغافل کیا اور جنگ تنہا مرزا اسمٰعیل کے سر پر آپڑی مگر اُس نے بڑی جواں مردی سے مقابلہ کیا اور یہ میدان بھی مار لیا۔ مرہٹہ بھاگ کر گوالیار کے اُس طرف (کے علاقے میں) جا ٹھہرا جس پر وہ متصرّف تھا۔ کچھ دنوں کے بعد دوسری فوج منگا کر پھر لڑنے کو آیا۔ دس پندرہ دن تک آگرے کے[۵۱] اطراف میں جنگ ہوتی رہی آخر مرزا اسمٰعیل کو شکست ہوئی۔ غلام قادر خاں تماشائی بنا رہا، مرزا مذکور بھاگ کر غلام قادر کے پاس آیا، لیکن دیکھا کہ یہ اپنے ہی نقشے جمانے کی دھن میں لگا ہوا ہے اور میری طرف توجہ نہیں کرتا تو مجبوراً اُس کے پاس کچھ دنوں رہ کر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

غلام قادر خاں کے مظالم

بادشاہ کا ناظر[۵۲]، جس نے غلام قادر کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، (اس نے) لکھا کہ تم یہاں آجاؤ۔ بادشاہ میرا کہنا نہیں سنتا، یعنی مرہٹے کا ساتھ نہیں چھوڑتا[۵۳]۔ یہ دونوں شہر گئے۔ بادشاہ خود کچھ طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ناظر نمک حرام کے مشورے سے قلعے کا بندوبست کر کے بادشاہ کو علیحدہ کر دیا اور اُس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو نہ کرنا چاہیئے تھا۔ تمام قلعے کو کھسوٹ ڈالا۔ شہزادوں کے ساتھ بھی ناکردنی سُلوک کیا۔ بہت سازو مال اُس کے ہاتھ آیا۔ بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں[۵۴] اور دوسرے کو بادشاہ بنا دیا۔ جب پورا تسلّط

---

[۵۱] یہ جنگ مرزا اسمعیل کی شکست پر ۷ ار جون ۸۸ ۱۷ء کو ختم ہوئی (۳/ ۲۷۰)۔

[۵۲] بادشاہ کے ناظر کا نام منظور علی خاں تھا۔

[۵۳] مرہٹوں کے نمایندے دہلی میں شاہ نظام الدین قادری صوبہ دار دہلی تھے جن کے نام سے "شاہ جی کا چھتہ" آج تک دہلی میں موجود ہے۔ اُن کا مکان دہلی دروازہ اور ترکمان دروازہ کے وسط میں تھا۔ یہ سید علی غمگین گوالیاری کے چچا تھے (تفصیل "قصۂ مہر افروز و دلبر" از نثار احمد فاروقی مشمولہ "دراسات")۔ سیندھیا کا داماد لاڈو جی دیشمکھ بھی قلعہ میں مرہٹوں کی نمایندگی کرتا تھا۔ غلام قادر نے ۱۵ ار جولائی ۸۸ ۱۷ء کو قلعہ کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں لیا تھا اور ۳۰ ر جولائی کو شاہ عالم کو معزول کر کے بیدار بخت پسرِ احمد شاہ کو اُس کی جگہ تخت نشین کیا تھا۔ اُس کے لیے ملکہ زمانی بیگم محل محمد شاہ نے بارہ لاکھ روپیہ رشوت دی تھی۔ (۳/ ۳۰۷)

[۵۴] شاہ عالم کو ۱۰ ار اگست ۸۸ ۱۷ء کو اندھا کیا گیا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ خود روہیلہ نے اپنے خنجر سے نکالی تھی، دوسری آنکھ قندھاری خاں نے اُس کے حکم سے نکالی۔ اُس وقت شاہ عالم کے سینے پر سوار ہو کر ایک تصویر بھی روہیلہ نے بنوائی تھی۔

حاصل کرلیا تو ناظر کو بھی قید کر دیا[۵۱] اور شہر والوں کو بھی پریشان کرنا شروع کیا۔ جب غلبہ حد سے سوا ہوگیا تو کسی معمولی سی بات پر مرزا اسمٰعیل[۵۲] سے بدمزگی پیدا ہوگئی۔ اسے (غلام قادر نے) کچھ دینے میں کوتاہی کی، اُس عزیز نے مرہٹے سے صلح کرلی۔ اندریں اثنا، مرہٹے کی فوج بھی قریب پہنچ گئی تھی اور اُس کے بعضے سردار شہر میں داخل ہوگئے[۵۳]۔ روہیلہ قلعہ بند ہوگیا۔ پھر رات کے وقت خضری دروازے[۵۴] سے نکل گیا۔ فوج و اسباب زر و مال نیز شہزادوں کو، ناظر اور اُس کے لواحقین کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ شاہدرے کے قریب فوجوں کو صف آرا کرکے (مقابلے پر) ڈٹ گیا۔ آخرالامر (جب) مرہٹوں نے اُس کی یہ ڈھٹائی دیکھی تو (وہ بھی) دریا کے پار گئے[۵۵] اور اُسے جنگ پر مجبور کیا۔ کبھی یہ غالب آتے تھے، کبھی وہ ملعون۔ جب ایک ماہ کے قریب (انھیں جھڑپوں میں) گذر گیا تو علی بہادر[۵۶] نامی ایک سردار دکھن سے آیا اور روہیلوں سے جنگ کرنے پر تُل گیا۔ دو تین جھڑپوں کے بعد بڑی بہادری سے اُسے اسیر کرلیا۔ مال و اسباب مع شاہزادوں کے اُس (کے قبضے) سے چھین کر اُسے قید میں ڈال دیا۔ اور اُسی اندھے شاہ عالم کو بادشاہ مقرر کیا[۵۷]۔ قلعے کو جاٹوں کے حوالے کیا۔ اب سَو روپیہ روز بادشاہ کو دیتے ہیں اور تمام مُلک پر متصرف ہیں۔

---

[۵۱] ناظر منظور علی خاں کو ۱۳ر ستمبر ۱۷۸۸ء کو قید کیا تھا۔

[۵۲] مرزا اسمٰعیل نے ۱۸ر ستمبر ۱۷۸۸ء کو روہیلہ کے کیمپ سے الگ ہوکر مرہٹے سے گٹھ جوڑ کیا تھا۔ (۳۱۴/۲)

[۵۳] مرہٹہ فوج کے سردار ۲ر اکتوبر ۱۷۸۸ء کو شہر دلی میں داخل ہوئے تھے۔

[۵۴] خضری دروازہ سلیم گڑھ کی طرف ہے (آثار الصنادید/ طبع نامی کانپور) روہیلہ اپنے ساتھ بیدار بخت اور سلیمان شکوہ وغیرہ شہزادوں کو بھی لے کر قلعے سے نکلا تھا۔ اُس نے ۱۰ر اکتوبر ۱۷۸۸ء کو قلعہ چھوڑا تھا۔ یہ عشرۂ محرم کا دن تھا۔ [۱۲۰۳ھ]۔

[۵۵] مرہٹوں کی طرف سے جمنا پار فوج لے کر رایاجی پاٹل اور جیوا دادا گئے تھے۔

[۵۶] یہ وہی علی بہادر ہیں جن کا نام غالب کے ایک مقطع میں آیا ہے۔ یہ پیشوا باجی راؤ اوّل کے پوتے اور ایک مسلمان طوائف مستانی بیگم کے بطن سے تھے۔ انھیں باندہ کی ریاست مرہٹوں ہی نے دے دی تھی۔ غلام قادر سے لڑنے کے لیے یہ نومبر ۱۷۸۸ء کے آخر میں دلی آئے تھے۔ اور ۱۱ر دسمبر ۱۷۸۸ء کو میرٹھ پہنچ کر روہیلہ کا مقابلہ کیا تھا۔ آخر اِن کے ہاتھوں ۱۹ر دسمبر کو روہیلہ گرفتار ہوا (۳۲۰/۲)۔

[۵۷] شاہ عالم کو معزولی کے بعد دوبارہ ۱۷ر اکتوبر ۱۷۸۸ء کو تخت نشین کیا گیا۔ اُس دن جمعہ تھا۔ کئی ماہ کے بعد دوبارہ اُس کے نام کا خُطبہ مسجدوں میں پڑھا گیا۔

اُس ملعون (روہیلہ) کو بڑی ذلّت کے ساتھ مار ڈالا[۵۱]۔ اب مرہٹہ (سیندھیا) بادشاہ ہے۔ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ یہ (رنگ) کب تک رہتا ہے۔

عبرت و خاتمہ

(القصہ) یہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے۔ کیسے کیسے مکان خراب ہو گئے اور کیسے کیسے جوان مر گئے۔ کیسے باغ ویرانے ہو گئے۔ کیسی محفلیں افسانے ہو گئیں۔ کیسے پھول کُملا گئے۔ کیسے جوان گذر گئے۔ کیسی مجلسیں اُکھڑ گئیں۔ کیسے قافلے کوچ کر گئے کیسے عزیز خوار ہوئے اور کیسے لوگ بااختیار ہوئے۔ اِس عبرت میں آنکھ نے کیا کیا دیکھا اور اِن کانوں نے کیا کیا سُن لیا[۵۲]۔

هر کاسهٔ سر ز افسرے میگوید — هر کهنه خرابه از درے میگوید
دنیاست فسانه پاره ای ما گفتیم — وان پاره که ماند، دیگرے میگوید

(ہر کاسۂ سر کسی تاجِ سر کی کہانی کہہ رہا ہے۔ اور ہر اُجڑا ہوا مکان در (و دیوار) کی نشانی ہے، یہ دنیا ایک کہانی ہے جس کا کچھ حصّہ ہم نے بیان کر دیا، جو باقی رہ گیا وہ اب اَور کوئی سنائے گا۔)

اِس تھوڑی سی مدّت میں اِس ایک قطرۂ خون نے جسے دل کہتے ہیں انواع ستم جھیلے ہیں اور تمام خون ہو گیا ہے۔ میرا مزاج (پہلے ہی) ناساز تھا۔ ہر شخص سے ملنا جلنا چھوڑ دیا (تھا) اب کہ بڑھاپا آگیا ہے یعنی عمرِ عزیز ساٹھ[۵۳] سال کی ہو چکی ہے اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دنوں

---

[۵۱] بادشاہ کے میر منشی میر غالب علی اور حکیم اکمل نے ۳ مارچ ۱۷۸۹ء کو غلام قادر روہیلہ کی دونوں آنکھیں نکالیں اور ناک کان کاٹے پھر یہ تحفہ متھرا سے دہلی کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ اِس سے تقریباً دو دن کے بعد روہیلہ مر گیا۔ [۵۲] یہ رباعی عہد عالمگیری کے امیر ارادت خاں واضح کی ہے۔ اِن کی مثنوی آئینۂ راز اور انتخابِ کلیات (قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ) میں موجود ہے۔ مگر اس کے پہلے دُو مصرعے اِس طرح ہیں:

هر کهنه خرابه از درے میگوید
هر نقشِ قدم حرف سرے میگوید ۔۔۔ الخ

[۵۳] اس ترقیمہ کی روشنی میں زمانۂ کتابت کی بحث مقدمہ میں ملے گی۔

آنکھوں کے درد میں مبتلا رہا۔ بینائی کمزور ہوگئی عینک کی ضرورت پڑی۔ میں نے کفِ افسوس ملا اور اِس شعر پر نظر کرکے نظر بازی ترک کردی:

دیدہ چون محتاجِ عینک گشت فکرِ خویش کُن
بر نفسَ دارند روزِ والپسین آئینہ را [1]

(جب آنکھ عینک کی محتاج ہو جائے تو اپنی (آخرت کی) فکر کرو۔ کیونکہ عالم نزع ہی میں مریض کے سانس پر (ناک کے سامنے) آئینہ رکھا جاتا ہے۔)

دانتوں کے درد کی کیا کہوں۔ حیران تھا کب تک علاج کروں۔ آخر دل برداشتہ ہو کر ایک ایک کو جڑ سے اُکھڑوا دیا۔

روزیِ خود را بَرنج ، از دردِ دندان میخورم
نان بخون تَر میشود ، تا پارۂ نان میخورم

(میں اپنی روزی بڑی تکلیف کے ساتھ کھاتا ہوں۔ دانتوں کے درد کی وجہ سے روٹی بھی خون میں تَر ہو جاتی ہے تب کہیں ایک ٹکڑا حلق سے نیچے اُترتا ہے۔)

غرضکہ ضعفِ قُویٰ، بیدماغی، ناتوانی، دل شکستگی، اور آزردہ خاطری سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا۔ زمانہ بھی رہنے کے لائق نہیں رہا ہے اِس سے دامن جھٹک دینا ہی اچھا ہے۔ اگر خاتمہ بخیر ہو جائے تو یہی آرزو ہے ورنہ اُسے اختیار ہے۔

○

---

[1] یہ شعر مُلا اشرف مازندرانی کا ہے۔

ذکرِ میر

(متنِ فارسی)

بسم اللّٰه الرحمن الرحیم

حمد | حمدِ بیحد مرسخنوری راکه یکّه بیتِ یکتائیِ اُو بعالم دوید[1] و ثنای لاتُعدّ صنعت گری راکه گوهرِ معنی[2] در سلکِ نظم و نثر کشید۔ قادر سخنی که هزار رنگ سخن را جلوه برزبان میدهد[3]۔ تعلیم گرے که هر فردِ عاجز سخن را زبان میدهد۔ خالقی که خلقِ عالم را نوازد، صانعی[4] که خاک را آدمی سازد۔ دارنده که بی لطفِ اُو نگاهداشتنِ[5] خود مُحال است۔ نگارنده[6] که صورت[7] نویسیِ اُو کرا مجال است[8]؟ علیمی که در[9] احاطهٔ علمِ اُو هر مرکّب و بسیط اینجاست که اِنَّ اللّٰهَ علیٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ[10] حکیمے که دانای رازهاست، قدیمی که هستی اُورا سزاست۔ رازقی که نان دهد، مالکے که جان دهد، رحیمی که عذرِ گنهگار نیوشد، کریمی که عطا پاشد و خطا پوشد۔ شمس یک ذرّه از ظهورِ اُو۔ قمر یک شمّه از نورِ اُو۔ چیزے نیست که بے نورِ اُو کُنی (فرض[11]) که اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[12]۔ نازِ اُو از بسکه نیاز را دوست میدارد[13] هر که سر فرود[14] می آرد نومید نمی گذارد۔ آفریننده[15] که جهان آفرید[16] و بیننده

---

[1] ای مشهور شد۔ [2] گوهر سخن۔ [3] ای زبان دادن و تعلیم کردن۔ یعنی یاد میدهد۔
[4] ن ۱ و صانعی۔ [5] ن ۱ بی لطفِ اُو داشتن خود۔ [6] ن ۱ (نگارنده تا مجال است) ندارد۔
[7] نقل نویسی۔ [8] ن ۲ صورت نویسی نقشِ او۔ [9] ن ۲ عالمی۔ [10] قرآن میں دوسری طرح ہے۔
[11] مط: غرض۔ (تصحیح قیاسی)۔ ن ۲ کسی فرض۔ [12] قرآن ۲۴/۳۵ [13] ن ۲: که هر که۔
[14] ن ۲ فرد۔ [15] ن ۲ آفرینی۔ [16] ن ۲ جهان۔ [17] و ندارد

که نهانِ همه‌کس دید. هر چند چرخِ کج رفتار با من کج بازد، امّا چشم دارم که روی[1] مرا بر خاک نیندازد[2]. زبانی نیست که نامِ او از و نمی آید، جانی نی که نغمهٔ[3] وصفِ او نمی سراید. خبیرے که از حالِ همه‌کس خبر دارد. بصیری که همه را در نظر دارد. نیازی باید که گلهای نازِ او چیند، چشمی شاید که تازه کاریِ او بیند. فردیکه بفردانیت موصوف، احدیکه بوحدانیت معروف. رفیعی که بدرگاهِ او ملک نرود. سمیعی که الحاحِ هر عاجزی شنود. قلمِ دو زبان چه قدرت دارد که کمالاتِ او یک یک برنگارد. مگر او خود را خود ستاید و از عهدهٔ کمالاتِ خود برآید.

فی النّعت[3]

درودِ[4] نامحدود بر فصیحی که گوی فصاحت از میان بُرده[5] و تحیّاتِ نامعدود بر بلیغی که بخدا رسیده و برخود نسپرده[6]. شاهے که از سرتاپا قدر و جلال است. ماهی که زنگ زدای کفر و ضلال است. پیشوای که بی اقتدای او کاری نمیکشاید. رهنمائی که بی رهنمائیِ او راهی نمی نماید. امیرے که فرمانِ او بجان و دل پذیریم و[7] دستگیری که اگر دست دهد دنبالِ او گیریم. صبیحے که صباحتِ او روشنگرِ آینهٔ عالم ملیحی که ملاحتِ او نمکِ رخسارهٔ آدم. نگاری[8] که خاکِ زیرِ پای او بهای جانی. بهارے که سایهٔ رَوِ عَلَمِ سبزِ او جهانی. یاری گرے که چشمِ محشریان بر شفاعتِ او. نی نی، هر دو جهان را کار با عنایتِ او. صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ[9] که هر یکی اِمامُ المُؤمِنِیْن و شَفِیعُ المُذْنِبِیْن است.

بعد حمدِ خالقِ وَدُود، معبودِ کُلِّ موجود، و درودِ نامحدود[10] و ثنای نامعدود بر آن

---

[1] روی برخاک انداختن مذلّت کردن. [2] ن ۲ (روی) ندارد.
[3] ن ۱ و ن ۲ (فی) ندارد. [4] ن ۲ و درود. [5] ن ۲ (و) ندارد.
[6] بخود سپردن = مغرور شدن. [7] ن ۲ (و) ندارد.
[8] ن ۱ نگاری الخ و بهاری الخ مؤخر مقدّم. [9] ن ۲ (الطّاهرین) ندارد.
[10] ن ۲ (و درودِ نامحدود) ندارد.

صاحبِ مقامِ محمود۔ میگوید فقیر میر محمد تقی المتخلّص بمیر که درین ایّام بیکار بودم، و در[1] گوشهٔ تنهائی بی یار۔ احوالِ خود را[2] متضمّنِ حالات و سوانحِ روزگار و حکایات و نقلها نگاشتم و بنای[3] خاتمهٔ این نسخه موسوم به "ذکرِ میر" بر[4] لطائف گذاشتم اُمید از یارانِ زمان آنست که اگر بر خطائی اطّلاع یابند چشمِ عنایت بپوشند[5] و در اصلاح بکوشند۔

بزرگانِ من

بزرگانِ من با دار و[6] دستهٔ خود[7] از نامساعدتِ ایّام که صبح درین اوقات شام مینماید، از حجاز رختِ سفر بسته، بسرحدِ دکھن رسیدند[8]، ناکشیدنیها کشیدند، و نادیدنیها دیدند۔ ازانجا واردِ احمدآباد گجرات گشتند۔ بعضی فروکش کرده[9] ازهم گذشتند، و[10] بعضی همّت برین گماشتند که پیشتر بیایند و بازوی تلاش گشایند۔ چنانچه جدِّ کلانِ من بمستقرِ[11] خلافت اکبرآباد توطّن اختیار کرد۔ اینجا از آبگردش[12] به بستر اُفتاد[13] و جهانِ آب و گل را دُعا گفت[14]۔ از و پسرے باقی ماند که جدِّ من باشد۔ اُو کمرِ همّت[15] بر بسته بتلاشِ روزگار برخاست۔ بعد از استخوان[16] شکنی به فوجداریِ گردِ اکبرآباد سرافراز گشت۔ آدمیانه میزیست۔ چون سنِّ شریفش به پنجاه کشید[17] مزاج از اعتدال مُنحرف شد۔ چند روز به تبرید[18] پرداخت۔ هنوز صحّت کامل نشُده بود که به گوالیار رفت۔ بسببِ حرکتِ عنیفی[19] که در نقاهت[20] سَم است بجا[21] اُفتاد[22] و جامهٔ گذاشت۔ و از[23] دو پسر داشت۔ کلانی خالی از خللِ دماغ نبوُد، جوان مُرد، و حکایتِ اُو پسِ سر شد[24]۔

---

[1] ن ۲ برگوشه۔ [2] ن ۱ (را) ندارد۔ [3] ن ۲ بپای۔ [4] ن ۱ به لطائف۔
[5] ن ۲ نپوشند۔ [6] دار و دسته = قوم و قبیله۔ [7] ن ۱ (از) ندارد۔ [8] ن ۲ دکن رسیده۔
[9] توقّف نمودن و فرود آمدن۔ (ن ۱ = فروکش شده)۔ [10] ن ۲ (بعضی ... گذشتند) ندارد۔
[11] ن ۱ و ن ۲ مستقرالخلافت۔ [12] اختلافِ هوا۔ [13] ن ۱۔ اے تغیرِ آب و هوا۔ [14] بیمار شد۔
[15] ترک کردن۔ (ن ۱ اے رخصت کرد)۔ [16] ن ۱ (بر) ندارد۔ [17] اے محنتِ بسیار۔
[18] ن ۱ پنجاه سالگی۔ [19] ن ۲ تدبیر۔ [20] دشوار۔ [21] ن ۲ نقاهت۔
[22] بجا اُفتادن و جامه گذاشتن یعنی مکث (قیام) کردن و مُردن۔ [23] ن ۱ (د) ندارد۔
[24] یعنی فراموش شد۔

پسرِ خورد که پدرِ من باشد ترکِ لباس کرد و پا بدامن کشید. تحصیلِ علمِ ظاهر که بی اُو به[1] عالمِ معنی رسیدن دشوار است، در خدمتِ شاه کلیم الله اکبرآبادی که از کُمّلِ اولیای آنجا بود کرد، و از ریاضتِ[2] شاقّه[3] پی بباطن بُرد. در سعیِ ترک و تجرید تصدیع بیحد کشید و برہنمائیِ آن بزرگ بسرِ خانهٔ درویشی رسید[4]. ع

پس از خرابیِ بسیار دل بدست اُفتاد

جوانِ صالحی عاشق پیشه بود، دلِ گرمے داشت. بخطابِ علی مُتّقی امتیاز یافت.

نقل است[5] روزے در خدمتِ شیخ سُوال کرد که بنده آنچه عقائدِ خود درست کرده ام بخدمتِ عالی واضح است، امّا در حقِّ حاکمِ شام چه می فرمایند؟ فرمود: خواهم گفت. بعد مدّتی آخرِ شب که هنوز کاکلِ[6] صبح پریشان نشده[7] بود، در مسجدِ مَحرم خان خواجه سرای شاهجهانی تشریف آورد. غلامانِ پدرِ من دَویدند که برائے وضوءِ شیخ آب بهم رسانند پدر خود[8] برخاست و آفتابه بدست گرفت. دست و دهن بآب کشیده[9] گفت که "ای علی متّقی نامِ اُو در مدّت العُمر بزبان[10] من نیامده است، زبان ندارم که شکرِ این بجا آرم". پدرم گفت: "الحمد لله که از ان باز نامِ اُو[11] من هم نگرفته ام."

روز و شب بیادِ الٰهی می پرداخت[12]. حق تعالیٰ روی اُورا بر خاک نینداخت. چون دماغش می رسید[13]، می گفت که "اے پسر عشق بوَرز[14]. عشق است که درین کارخانهٔ مُتصرّف است[15]. اگر عشق نمی بود، نظمِ کُل صورت نمی بست. بی عشق زندگانی وَبال است، دل باختهٔ[16] عشق بودن کمال است، عشق بسازد، عشق بسوزد، در عالم هر چه هست ظهورِ

---

[1] ن ۱ بی آن. [2] ن ۱ ریاضات. [3] ن ۲ سابقه. [4] بمعنی حدّ معیّن. [5] ن ۲ (نقل است) ندارد.
[6] یعنی خیطُ الاسود (ن ۲ کاکل). [7] ن ۲ شده. [8] ن ۲ پدرم. [9] ای دَست و رو شُست (ن ۱ کشید و). [10] ن ۱ برزبان. [11] ن ۲ (او) ندارد. [12] ن ۲ بپرداخت. [13] رسیدن دماغ بمعنی شگفته شدن. [14] ن ۱ نواز. [15] ن ۲ مغرلیست (کذا). [16] ن ۲ (عشق نمی بود . . . تا باخته) ندارد.

عشق است، آتش سوزِ عشق[1] است، آب رفتارِ عشق است[2]، خاک قرارِ عشق است، باد اضطرارِ عشق است[3]، موت مستیِ عشق است، حیات هُشیاریِ عشق است، شب خوابِ عشق است، روز بیداریِ عشق است، مُسلم جمالِ عشق است، کافر جلالِ عشق است، صلاح قُربِ عشق است، گناه بُعدِ عشق است، بهشت شَوقِ عشق است، دوزخ ذَوقِ عشق است. مقامِ عشق از عبودیّت و عارفیّت و زاهدیّت و صدّیقیّت و خُلوصیّت و مشتاقیّت و خلّیت[4] و حبیبیّت برتر است. جمعی بر آنند که حرکتِ آسمانها[5] حرکتِ عشقی[6] است یعنی بمطلوب نمی رسند. و سَرگردانند:

بی عشق نباید[7] بود، بی عشق نباید زیست
پیغمبرِ کنعانی عشقِ پسرے دارد

روز حیرانِ کار[8]، شب زنده دار، اکثر روی نیاز بر خاک. مُدام مستِ شوق و دامن پاک. چهرهٔ نورانیش رونق افزای بزمِ صبح خیزان[9]. آفتاب بود اما از سایهٔ خود هم گریزان. هرگاه بخود آمدے گفتے که "اے پسر عالم هنگامه بیش نیست، باید که بدین[10] آستین بیفشانی، و گردِ علائق بر دامنِ خود ننشانی. عشقِ الٰهی را پیشهٔ خود کُن. روزے در پیش است، اندیشهٔ خود کُن. هر که اهل است میداند که دنیا[11] سَهل است. زندگانی وهمی است، بنا بر وهم گذاشتن آب را با ریسمان بستن است[12]، و در بند فُسحتِ[13] اَمل بُودن مهتاب[14] بگز پیمودن. اندازِ رفتنی داری، بے خبر آه نشوی[15] فکرِ زادے کُن[16] تا خرجِ راه نشوی[17].

---

[1] ن ۱ موخر.　[2] ن ۱ مقدم.　[3] ن ۲ مقدم.
[4] ن ۲ غلیلست - این را غلیلیت هم میتوان خواند.
ن ۱ حالیت　[5] ن ۲ آسمانی
ن ۱
[6] ن ۲ عشق.　[7] ن ۱ واد دارد.　[8] ن ۱ وشب زنده دار.　[9] ن ۱ خیزان ندارد.
[10] ن ۲ برین.　[11] ن ۱ دهی بیش.　[12] از (زندگانی وهمی تابستن است) ن ۲ ندارد.
[13] ن ۲ این.　[14] ن ۲ آفتاب.　[15] ن ۱ ای بیهوده　[16] ن ۱ برادی بکش.
[17] ای تنگ شدن درراه.

رُو بکسی آر که عالَم را آینهٔ اُو میگویند. اختیارِ خود بکسی سپار که اُو را[1] در خود میجویند. اگرچه مقصود حاصل است، امّا طلب شرط است. هر چند همه اوست لیکن اَدب شرط است.

نُکته[2] | معیّتِ حق با خلق[3] چون معیّتِ روح است با جسم. تُرا بی اُو وجودے نَے، و[4] اُو را بی تو نمودی نَے. عالم پیش از ظهور عینِ[5] اُو بود، و بعد از ظهور اُو عینِ عالم است[6].

مشکل حکایتے است که هر ذرّه عینِ اُوست
امّا نمی توان که اشارت بَدو کنند[7]

درویش[8] درویش پرستے، شکسته دلے، مشتاقِ شکستی، نیاز مندِ عجیبے، دَر وطن غریبے، وسیع المشرب، فقیرِ کامل، چون آب در هر رنگ[10] شامل. هرگاه مرا در بغل[9] کشیدے، و بنظرِ شفقت رنگِ کاهیِ مَرا دیدے[11]، گفتے که اے سرمایهٔ جان این چه آتشی[12] است که در دلت نهان است، و چه سوزیست که ترا با جان است؟ من خنده میکردم، اُو میگریست. قدر نشناختم تامی زیست. مَردے بود بحالِ خودے[13]، کسے را بارِ دوشے نشدے[14].

یکے بعد از نمازِ اشراق روی توجّه بمن آورد، و[15] مرا سرگرمِ بازی یافت گفت "اے پسر زمانه آنِ سیّال است، یعنی بسیار کم فرصت. از تربیّتِ خود غافل مَشو. درین راه نشیب و فراز بسیار[16] است، دیده دیده بِرَو."

۱؎ ن۲ اورا خود.
۲؎ ن۲ ندارد.
۳؎ ن۲: باحق.
۴؎ ن۲. واوَ ندارد.
۵؎ ن۲: عین ندارد.
۶؎ ن۱: (نکته).
۷؎ ن۱: کنند.
۸؎ ن۱: درویش و درویش.
۹؎ ن۲: به بغل.
۱۰؎ ن۱: برنگ.
۱۱؎ ن۱: من - ن۲: میزندی.
۱۲؎ ن۱: آتش.
۱۳؎ ن۱: اے وارفته حال خود.
۱۴؎ ن۲ باد دستے (کذا)
۱۵؎ ن۲ واوَ ندارد.
۱۶؎ ن۱ بسیار ندارد.

نشانِ پای تو فردِ حسابِ زندگی است
قدم شمرده درین[1] کهنه خاکدان بردار

این چه بازیست که اختیار کرده ای، و چه ناهمواری است که بر خود[2] هموار ساخته ای محوِ کسی شو که بلاگردانِ رنگین رفتنِ او آسمانها، رفته[3]. آن باش که قربانِ هر آنِ او[4] دلها، وجانها. عندلیبِ گُلی باش که همیشه بهار است (...[5]) آن سادهٔ[6] شو که یک پُر کار است. دَورِ[7] آسمان دو رنگ درنگ ندارد، بشتاب، فرصت غنیمت شمار، و خود را دریاب.»

صورتِ متبرکش معنیِ مجسّم، در تمام عالمِ اجسام. یک آدمِ موقّرے که عنانِ اختیار از دستِ خود نداد. متقی که چشمِ نامحرم بر دست و پای (اُو[8]) نیفتاد. اگر میدیدی میگفتی که شاید مَلک و این عزیز[9] سر از یک گریبان بر آورده اند، و رفتگان هم پای استقامت باین خوبی کم فشرده اند[10]. متخلق باخلاقِ سنجیده، متصف باوصافِ حمیده. طبعش مشکل پسند جانش دردمند. مژگان نم. حال درهم.

نقل است[11] یک روز سرکن پرکن[12] بخانه در آمد، کهنه دا[13]یے نشسته بود گفت: «اے دَاه امروز بسیار گرسنه اَم طاقتِ صبر ندارم، اگر پارهٔ نانے بهم رسد زنده میمانم.» اُو گفت: «فقدانِ اسباب است.» باز گفت[14]: «گرسنه ام.» داه برخاسته رفت و از بدّال آرد و روغن آورد تا نان ببیزد. این بار بی طاقتی بسیار[15] کرد.

---

[1] ن ۲ ازین. [2] ن ۱ خود ندارد. [3] ن ۱: اے واله و عاشق.
[4] ن ۲: قربان بران او دلها و جانها. [5] ازین جا یک لفظ ساقط شده است.
[6] ن ۱: اے غبار وکذا در ن ۲. [7] مط: در. [8] مط: او ندارد (ن ۱ و ن ۲: اُو).
[9] کنایه از اتحاد. [10] ن ۱ و ن ۲: اند ندارد. [11] ن ۲: ندارد.
[12] مضطرب. [13] ماما. [14] ن ۲: باز گفت کر.
[15] ن ۲: بسیاری.

داه[1] بیدماغ[2] شد وگفت که "صاحب این فقیری است اینجا ناز را دخلی نیست." گفت: "اے داه، تو با دلِ جمع نان بپز. من برای دیدنِ درویشی به لاهور میروم[3]." رومالیکه از گریهٔ شبَش لکّهٔ ابرِ ترے شده بود بَرداشت و پا براه گذاشت. چون داه دید[4] بیمزه[5] شده[6] میرود، دَوید[7] وگریه کُنان در دامن آویخت. هیچ فائده نکرد. ناچار آیی بَرآینه رَیخت

هر جا که فرود می آمد رزّاقیتِ خدائے کریم کار میکرد.

بعد از چندے به لاهور رسید و آن درویشِ ریاکار را دید. برکنارِ رودخانه که به "راوی" شهرت دارد نشسته میماند، دعالمی را بآب میراند[8]. بنام "خفشان نَمود" مشهور بُود. چند الفاظِ زبانِ دَری برزبان داشت نافهمے چند که نمی فهمیدند، پیشِ اُو خط (از[9]) بلینی میکشیدند. گفت که من تائیدِ دینِ محمّد علیه الصلٰوة والسّلام[10] میکنم، بی حقیقتان مرا مُغوی میدانند." پدرم بر آشفت وگفت که: "اے بے تہ دینِ پیغمبرِ ما محتاجِ تائیدِ همچو توئی نیست. فهمیده بگو که اینجا شمشیر در میان است، مبادا که کُشته شوی[11]." آخر در اوّلِ ملاقات[12] صحبت بیمزه شُد[13]. به ترش روئیِ تمام ازانجا[14] برخاسته، در تکیهٔ فقیرے شب گذرانید. چون صبح سفید شد، آن سیه گلیم از درِ معذرت درآمد. پدرِ من گفت که: "حالا سُودے ندارد، دیروز سفید گفته اَم[15] امروز سفید تر خواهم گفت." چون پرده از روی کار برخاست، بی لُطف است. برَو سرِ خود گیر. نشود که بدَهنها اُفتی[16]. هر چند از عرقِ خجلت تر آمد،

---

[1] ن ۲ واُو.
[2] ن ۱: بے مزه.
[3] ن ۱: وملاقات کرده می آیم.
[4] ن ۲: دیدکه.
[5] ن ۱: بے دماغ.
[6] مط: ىشد.
[7] مط: دویده ن ۱ و ن ۲ دوید.
[8] یعنی فریب میداد.
[9] مط: به بینی.
[10] ن ۲: والسلام ندارد.
[11] ن ۲: شوی ندارد.
[12] ن ۲: ملاقات ندارد.
[13] ن ۲: آخر در اوّل صحبت ملاقات قردنی شد ن ۱: قردتی (بیمزه) شد.
[14] ن ۲: ازینجا.
[15] ن ۲: ام ندارد (بے پرده گفته ام).
[16] ای بدهن افتاده رسوا شوی.

اما بسیار از آب بد برآمد. وقتیکه آن مجلسِ بی لطف برشکست[۱]، دفعةً این عزیز بارِ سفرے
که نداشت، تَوَکَّلتُ عَلَی اللّٰہِ بر بست. و[۲] در عرصهٔ ده دوازده[۳] روز از گردِ راه به ـــــ
شاهجهان آباد دهلی رسید، و بخانهٔ فخرالدین خان[۴] پسرِ شیخ عبدالعزیز عزّت، که دیوانِ صوبه[۵]
بود، و قرابتی قریبه داشت، رَحلِ[۶] اقامت انداخت. عزیزانِ شهر هجوم آوردند و به
اعتقادِ تمام آب بدستش ریختند[۷]. آن مرد را که شرابِ عشق از هوش بُرده بود، اگر نشستے
بیخود نشستے[۸]، و اگر برخاستے چون مستِ سَرانداز برخاستے، مستانه و بیخودانه حرف سرکردے،
دمِ جان سوزش آتشِ شوق بَرکردے[۹]. بسیارے دستِ ارادت بدست اُو دادند،
اکثرے بتاثیرِ نگاهش از پا اُفتادند. غُسالهٔ[۱۰] وضوے اُو از کمالِ رُسوخ میگرفتند، و به
بیمارانِ شهر میدادند، هرکه میخورد به می شد. از بس گریستے گریه اش در گلو گره گشتے نالهٔ که
از دلش سر بر زدے، از آسمان گذشتے. آوازه در اُفتاد که درویشے باین حالت واردِ شهر
است. اُمراء التماسِ ملاقات نمودند[۱۱]، قبول نکرد، که "من فقیر و شما امیر، میانِ ما و
شما نسبت نمی گنجد." امیرالامراء صمصام الدّوله نظر[۱۲] بر حقوقِ سابق باز آغاز[۱۳] کرد که
مرا از دولتِ دیدار محروم نباید گذاشت، اگر از لطف اشاره رَود، این روسیاه داخلِ
صحبتِ رُوسفیدان شود. تبسّمی کرد و گفت: "برائے ملاقات مناسبت شرط است
اُمید که معذور داری و بحالِ خودم واگذاری." چون از کثرتِ خلق تنگ شد، دلِ شب[۱۴]

---

۱ ن ۲: بدنیا افتی که آن صحبت بے مزه پاشیده شد و آن مجلس بے لطف برشکست.
۲ ن ۲: واو ندارد. ۳ ن ۱، ۲] ده روز.
۴ در سط: قمرالدین خان، ولی اینجا نام فخرالدین باید. برای تشریح رجوع کنید مقدمهٔ کتاب.
۵ صوبه بمعنی صوبه دار باشد، دیوان صوبه، یعنی دیوانِ صوبیدار.
۶ ن ۲: رخت. ۷ کنایه از خدمت کردن. ۸ ن ۲: بے خود نشستی ندارد.
۹ مشتعل کردن. ۱۰ ن ۲: غلوله. ۱۱ ن ۲ کردند.
۱۲ ن ۱ برندارد. ۱۳ ن ۲: تاز آغاز کرد. ۱۴ نصف شب.

برخاست، وبعد از نمازِ تہجّد از شہر بدر زد۔ ہر چند در تلاشش[۵۱] نفس سوختند، امّا بگردِ او نرسیدند، ونقشِ پای که نشان از و دہد ندیدند۔ (لمصنّفہ[۵۲]):

بپاکان کار کے گیرد فلک تنگ
کہ عیسٰی از سرِ سوزن برون شد[۵۳]

در دو سہ روز بہ "بیانہ" کہ سَرمنزلی[۵۴] اکبرآباد شہریست قدیم، وآبادی شرفاء است، غریبانہ وارد شد۔ وبیکسانہ بر درِ مسجدے نشست۔

حکایت[۵۵] سیّد پسرے، لالہ رخسارے، خوش پرکارے، بنظر درآمد، چشمے[۵۶] چرانْد و از جذبۂ کاملش بسوی خود کشید۔ تغیّرے در احوالِ آن غیرت پری راہ یافت۔ چون پریدار بیہوش اُفتاد، وسَر در پای این دیوانہ وَش نہاد۔ عزیزان فہمیدند کہ[۵۷] حالِ پسر کہ دگرگون است از تاثیرِ نظرِ درویشِ جگرخون است۔ گفتند کہ رحمے بر حالِ این جوان کُن۔ دمِ آبے طلبید و دُعای برؤ دَمید۔ چون آب از گلو فرو رفت[۵۸] آن پسر بخود آمد، ومعتقدانہ زانو زدہ گفت: "اگر چندے مہمانِ من باشند، و قدمے کہ بَردارند بر چشمِ نیازمند گذارند، عینِ بندہ نوازی است، وگرنہ در عالمے کہ حضرت تشریف دارند ناز پیش نمی رَود، کہ آن جایِ نیازی است۔" فرمود کہ در عالمِ دوستی مضائقہ ندارد، امّا من[۵۹] بسرِ پا نشستہ ام، فردا رفتنی در پیش دارم۔ حاضران گفتند: "ما تابعِ مزاجیم۔ مبالغہ کردن سوءِ ادب است، لیکن اینقدر ہست کہ اگر بخانۂ این پسر تشریفِ شریف ارزانی فرمایند، وچیزے تناول نمایند، دور از عنایتے نخواہد بود۔" چون پاسِ عزّتِ اکابرانِ آنجا منظور داشت گفت: "قبول است۔ امّا خاطرِ فقیر گاہے شاد و گاہے ملول است، کسی

---

[۵۱] ن ۱ تلاش۔
[۵۲] ن ۲ ندارد۔
[۵۳] از سرِ سوزن برون شدن۔ ازراہِ دشوارگذار آسان گذشتن۔
[۵۴] ن ۱: سرمنزلی۔
[۵۵] ن ۲ ندارد۔
[۵۶] ن ۲: قسمی خواند و ازجذب ن ۱: جذب۔
[۵۷] ن ۱: کہ ندارد۔
[۵۸] مط: فرو ریخت۔
[۵۹] ن ۱: من ندارد۔

مُتعرّضِ احوال[۱] نشود.» گفتند: «چه یارا، و کرا گوارا، اگر خلاف مزاج بظهور آید، این سعادت بشقاوت گراید.» غرضکه آن جماعت بخانهٔ پسر بُرد، و این مرد[۲] هم آن جا چیز(ے) خورد[۳]. اِتّفاقاً همان شب شبِ[۴] کدخدائیِ اُو بود، پارهٔ از شب گذشته با کدخدایانِ شهر پیش آمد و گفت: «اگر حضرت هم قدم رنجه فرمایند، و رونقِ بزمِ عروسی افزایند موجبِ سربلندی است.» گفتا: «مبارک است. امّا افسوس کدخدائی مانعِ خداپرستی[۵] است.»

فائده ای عزیز نمیدانی که لفظِ «داماد» مرکّب است از دام و آد. که فارسیان برائے نسبت می[۶] آرند، از عالم آباد و نوشاد. یعنی هر که کدخدا شد، گرفتارِ دامِ بلا شد. من مردے ام وارسته، و چون برق ازین دامگه جسته، مرا باینها چه کار؟ بر دکه آدم درین امر ناچار است. بنده نیز در ابتداے جوانی از شرابِ عیش مست بودم، آخر غیر از خُمار که رنجے است[۷]، حاصلی ندیدم. چون خدای عزّ و جلّ ازین گرفتاری رهائی ام داد، خود را بسمار دوختم و بسانِ شمع بر سرِ یک[۸] پا سوختم. اکنون تُودهٔ خاکسترے بیش نیستم[۹]. دل کجا که هوس انگیزد[۱۰]، دماغ کو که فقیر بهرِ تماشا برخیزد. ازین مشعلها که همراهِ تواند بوی فتیله می آید، تو که غزالی، عجب است که رَم نکنی[۱۱]، اگر فهم درستی داری بگُنهِ این نکته بِرس که الله بس باقی هوس.»

الحاصل آن پسر بخانهٔ عروس در آمد، و این فقیرِ لاابالی از شهر[۱۲] بر آمد. در مدّتِ یک و نیم روز به اکبرآباد رسید، و بادلِ جمع در خانهٔ خود وَا کشید[۱۳].

حکایتِ[۱۴] شوق وقتیکه آن جوانِ گل رخسار، و آن سروِ تند رو رفتار، آگاه شد

---

[۱] ن ۲: حال. [۲] ن ۲: مردم. [۳] ن ۲ خبر خورد (محتمل که این خُبز خورد بمعنی نان خورد باشد). [۴] ن ۱ همان شب کتخدائی. [۵] ن ۱: خدارسی است. [۶] مط: نسبت آرند. [۷] ن ۱: که رنجیست ندارد. [۸] ن ۲ یک پاندارد. [۹] ن ۲: نیست. [۱۰] ن ۲ و دماغ. [۱۱] ن ۲ نمی کند. [۱۲] ن ۲ بشهر. [۱۳] ن ۲: بخانه خود درکشید. [۱۴] ن ۲: ندارد.

که درویشِ دل آگاه شد، عروس را بخانه آورد، و آن جا آب هم نخورد، یعنی همان دم اشک ریزان، اُفتان[51] و خیزان سر بصحرا نهاد، و قدم در تلاشِ اُو کشاد. هر کرا در راه میدید احوالِ درویش می پرسید. گاهے این طرف، گاهے آن طرف می شتافت، پا سنزے که ازو نشان دهد، نیافت. ناچار آهے از جگر برکشید و گفت: "اے خضرِ راه چون منِ نابلد بے رهنمائیِ[52] تو هر طرف سرگردانم ازطرفے برآ ـــــ از خاک برگرفته باشی اگر بدین اُفتادگی دستگیری نمائی. گنجے یافته باشم اگر درین خرابه بنظر درآئی. جیبے که گُل دردِ[53] می انداختم چاک است، سرے که بر بالشِ ناز داشتم برِ خاک است. رحمے که پاے رفتنم کوتاهی همیکند، لطفے که جز آوارگی کسے همراهی نمیکند. وقت است از لطفِ بی پایان دریاب. خورشیدی آخر بر ذرّهٔ خود بتاب. چه واقع[54] شد که آسودگی ازمن رُو بتافت[55]. چه پیش آمد که آوارگی مرا دریافت. (لمصنّفه[56]):

سخت در کارِ خویش حیرانم

چه بدل خورد من نمیدانم

چون گردباد وحشت آماده ام، مگر از طاقِ دلت اُفتاده ام. هرچند از کمیائیِ خود درآزارم امّا هنوز سرِ توقّع میخارم. گر بدشتم آوارهٔ راغم. ور بکهسارم سنگداغم. رخسارم که بر گلِ نو نوَاخوانی کردے، از تابِ آفتاب تفسیده. چشم که بر غزال سیاهی زدے، قریب بسفیدی رسیده، تو آفتابی و من سایهٔ اُفتاده[57]، تو سوارِ دولتی و من پاپیاده[58]. از هر غبارے که بلند میشود منتظرِ تو میباشم. چون بچشم نمی آئی، ناچار از ناله گلو میخراشم. تو تمام اجزائی یعنی کاملی، از حالِ غافلان[59] چرا غافلی. ناله میکشید و راهے میرفت. گاهی می ایستاد و گاهی[60] میرفت،

---

[51] ن ۲: واوَ ندارد.
[52] ن ۲: بے رو نمائیِ تو.
[53] ن ۲: درو گل.
[54] ن ۲: واقعه.
[55] ن ۲: بتافت و.
[56] ن ۲: ندارد.
[57] ن ۲: فتاده.
[58] ن ۲: دمن پیاده.
[59] ن ۲: ناقصان.
[60] ن ۲: ناله میکشید و گاهی میرفت و گاهی می ایستاد ناگاه.

که[۵۱] ناگاه پیرے از پسِ پشت رُو نمود، و زبان بلطف و نرمی کشود که "اے جوان کرا میجوئی؟ و اینها چیست که میگوئی؟ علی متقی در اکبر آباد است، برو دست[۵۲] پاچه مشو"۔ چون این مژده بگوشِ اُو رسید، دلے که در سینه قرار نمیگرفت تسلّی گردید۔ قدم بآرمیدگی در راه نهاد لب بادای شکرِ الٰهی کشاد۔

شب درمیان داخلِ شهرِ مذکور شد۔ نشان جویان، نام پُرسان رسید، و[۵۳] بقدمبوس مُستسعد[۵۴] گشت۔ اشکِ شادی برخسارهٔ[۵۵] اُو که رنگِ مهتابی داشت دوید۔ رنجِ ناکامی براحت[۵۶] حصولِ کامے که در خیالش نبود انجامید۔ درویشِ جگر ریش[۵۷] نظرے بر جمالش[۵۸] کرد که همان نظرِ پاک صاحب کمالش کرد۔ لطفی فرمود که بتحریر نمیگنجد، دلدهی کرد که بگفتن راست نمی آید۔ سرش درکنار کشید و از لطفِ بی اندازه پُرسید که اے میر امان الله بسیار در آب و آتش[۵۹] بودی، یعنی گرم و سرد زمانه آزمودی، غمِ جدائی اقران[۶۰] نخواهی خورد۔ خانمانِ من خانمانِ تو، من و غلامان همه از آنِ تو۔ خشکی که طرفه دریائے بجوی خویش[۶۱] بسته ای۔ شادی که چون سروِ دامن بالا زده برجسته ای۔ باید که دل جمع کنی، و دروازه را بر روی خود کشی، چندے بخود فرو روی تا خدا را سُوئے خود کشی۔

(فائده) بشنو که وقت دلخواه است، و نکته ها در راه۔ جامهٔ که عبارت از جسم باشد عاریتی است، لباسِ عاریت را پاک باید داشت و جان را که اشارت بآنست در بندِ این و آن نباید گذاشت۔ (لمصنّفه[۶۲]):

پاسِ جان کُن، تن ندارد اعتبار
قالبِ خاکی مزارے بیش نیست

---

[۵۱] ن ۲: که ندارد۔
[۵۲] ن ۲: و دست۔
[۵۳] ن ۲: واو ندارد۔
[۵۴] ن ۲: مستفید۔
[۵۵] ن ۲: بر رخساره۔
[۵۶] ن ۲: پرداخت۔
[۵۷] ن ۲: دل ریش۔
[۵۸] ن ۲: جمالش۔
[۵۹] ن ۱: آتش و آب۔
[۶۰] ن ۲: احزان۔
[۶۱] ن ۲: خود۔
[۶۲] ن ۲: ندارد۔

خود را مبین[۵۱] و در خود تأمّل کن۔ نظر بر خدا دار و توکّل کن۔ نیازے بہم رسان کہ نماز دوام بکار نمی آید۔ گداختہ شو کہ دلِ بی گداز کارے نمیکشاید۔ بخود سپردن عیب است، کارہا را بخدا سپار، و از خود زبون ترے را ہم بدست کم برمدار۔ غرور بد نمود است، زینہار زینہار از و رو بگردانی۔ مشقِ نیازے کن کہ بدل چسپیدنی بہم رسانی۔ تا توانی علائق را بر گردنِ خود[۵۲] مبند بہ عبث خود را زیرِ این بار مپسند۔ دل از نقشِ غیر بپرداز[۵۳]۔ تا خانہ را رُفت و رُوب نکنی قابلِ مہمان نشود۔ با موافق و ناموافق بساز تا آدم اخلاق پیدا نکند انسان[۵۴] نشود۔ رنگی با ہمہ کس کن[۵۵] کہ ہمین مذہبِ درویش است۔ چون غریبان بسر بر، کہ رفتنی در پیش است۔ عالم پُرسگاہیست[۵۶] آن جا رسِم دیر ماندن نیست۔ عالمیان ماتمیان[۵۷] اند برائے تسلّیِ ایشان دمے بایست[۵۸]۔ این دشتِ خوفناک است[۵۹] این جا مار و مور بعصا راہ میرود۔ در فکرِ زادِ راہ باش، کہ قافلہ ناگاہ میرود۔ خواہی کہ صحیح برآئی ازین[۶۰] بیمار خانہ آب حکیمانہ بخور، طعام پرہیزانہ۔

(نکتہ) فقیر آنست احتیاج بچیزے کہ داشتہ باشد، نداشتہ باشد، و غنی آنکہ مملکتِ عدم بغیرِ[۶۱] خود گذاشتہ باشد[۶۲]۔ فقر بسامی اُفتد "اَللّٰہُ غَنِیٌّ وَّاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ[۶۳]" بدانکہ درین چمن یک گلِ تر است امّا بہزار رنگ جلوہ گر است، یعنی یکی[۶۴] است دلدار و جلوہ ہا بسیار۔

معشوق در حقیقت گر بنگری یکی است

ہر کس بجلوۂ دلِ خود شاد می کند

---

[۵۱] ن ۲: بین۔ [۵۲] ن ۲: خود ندارد۔ [۵۳] ن ۲: پرداز۔

[۵۴] ن ۲: آدم۔ [۵۵] ن ۲: کن ندارد۔

[۵۶] ن ۲: پرسہ گاہیست این جا۔ [۵۷] ن ۲: ماتمی۔ [۵۸] ن ۲: دل چاکست۔

[۵۹] ن ۲: است ندارد۔ [۶۰] ن ۲: این۔ [۶۱] مط: بغیر از خود۔

[۶۲] ن ۱: باشد ندارد۔ [۶۳] قرآن ۴۷:۳۸ وَاللّٰہُ الغَنِیُّ وَأنتُمُ الفُقَرَاءُ

[۶۴] ن ۲: یک است

یکی را ببین و یکی را بدان
یکی را بجو و یکی را بخوان

دوئی کجاست ز نیرنگِ احولی[1] بگذر
که یک نگاه میانِ دو چشم مشترک است

برو چیزے بخور و بخواب. که از گردِ راه رسیده ای. پا را بفراغت[2] دراز کن که محنتِ بیحد کشیده ای - به غلامے اشارت کرد که بالشِ نرم زیرِ سرش بگذارد[3]، و خود را در ہیچ وقت از خدمتِ او معاف ندارد[4]۔

حاصل که آن عزیز به فراغتِ دل میماند، و پدرم "برادرِ عزیز" ش میخواند صبح و شام بخدمتِ درویش آمدے و کسبِ کمال کردے - یک لحظه از مراعاتِ خاطرِ او غافل نمی بود- ہر روز درے از مقاماتِ درویشی بُرُخش[5] می کشود- باندک مدت فقیرِ کامل شد- کارش بجائے کشید که اگر چشمک زدے عجائبات نمودے، و اگر آستین افشاندے، کرامت ظاہر شدے[6]- اَقرانِ او چون خبر[7] یافتند مشتاقانه از وطن شتافتند- ہمسرش به رنجِ باریک مبتلا گشت و بعد از چندے ازین عالم بگذشت -

القصه آوازۀ درویشیِ این[8] مرد بلند شد- خلق برو گرد آمدند- عزلت گزید و در ملاقاتِ مردم مصلحت ندید- چون سالے برین بگذشت پدرم گفته فرستاد که اکنون درِ فیض بر روے عالمیان باید کشاد- شام که از حجرۀ خود برآمد باندازے که ملک ترآمد- درویش را سلام داد و

---

[1] ن ۲: اودمی بگذر۔
[2] ن ۲: بفراغت تمام۔
[3] ن ۲: بگذار۔
[4] ن ۲: مدار۔
[5] ن ۲: بررخش۔
[6] ن ۲: شدے نداره۔
[7] ن ۲: خبرش۔
[8] ن ۲: آن۔

در قدم اُفتاد. گفت[1] : " اے سید عجب سگّہ دُرست مردی کہ سگّہ بزر کردی[2]. هوس آدم را سگِ رُوے یخ مینماید، ونفسِ سَرکن سرشخ. تو سنگِ قناعت بر شکم بستی وتمنا بر تمنا شکستی. ع
" این کار از تو آید[3] و مردان چنین کنند ".

من دران آیام هفت ساله بُودم، باخود مأنوس ساخت و در گریبانم[4] انداخت. یعنی با مادر و پدرم نگذاشت[5] وبفرزندیِ خویشم برداشت. لمحہ از خود جدایم نمیکرد و بناز و نعم می پَرورد. چنانچہ روز و شب با اُو می[6] ماندم و قرآن شریف بخدمتِ او میخواندم.

(نقل[7]) روزے برائے سیرِ جمعہ[8] بازار رفتہ بود[9]، نظرش بر پسرِ روغن فروشے اُفتاد. جوان چیزے[10] بُود، دل از دست داد. پاے ثباتے کہ داشت از پیش رفت، یعنی تاب نیاورد و از خویش رفت. چون روے دل از و ندید، دست بر[11] دل بر گردید. هر چند بضبطِ خود می پرداخت امّا دلِ بیتاب باو نمی ساخت. دست بر دوشِ غلام داشتے تا قدم بر زمین گذاشتے. بدینسان راه میرفت، باخود[12] میگفت[13] : " اے عزیز کسی این چنین بدمی بازد[14] کہ تو باختی؟ وخود را رُسواے کوچہ و بازار ساختی[15]! یا آن عنان داری، یا این بے اختیاری! حرکتی کہ تو کردی از طفلے نشود، راهے[16] کہ تو رفتی کورے نَرود. دل هیچ چیزے نبوَد کہ کسی تواضعِ طفلِ تہ بازار کُند. دل تفتہ کسی شدی کہ در آفتابِ گرم[17] بیرون نیامده. وارفتہ شخصے گردیدی کہ در پئے دل گامے نرفتہ. این چشم گریان تر شود، گوئی کہ منتظر[18] بود، همین کہ دید بدل چسپید. و این دل تپان تر گردد، همانا کہ بهانہ می جُست همین کہ دیدهٔ من

---

[1] ن ۲: وگفت.
[2] ن ۲: زدی.
[3] ن ۲: واو ندارد.
[4] ن ۲: بگریبانم.
[5] ن ۲: نگذاشت ندارد.
[6] ن ۲: باوے.
[7] ن ۲: ندارد.
[8] ن ۲: جملہ بازار.
[9] ن ۲: بود ندارد.
[10] ن ۲: خوبے.
[11] مط: بدل
[12] ن ۲: وباخود.
[13] ن ۲: می گفت کہ.
[14] ن ۲: میکند کہ تو کردی.
[15] ن ۲: نمودی.
[16] ن ۲: و راهے.
[17] ن ۲: گرم از خانہ.
[18] ن ۲: منتظر.

واشد تپید۔ چشم را تا کے نگهدارم[51]، از دل تا کجا خبردارم۔ درجوانی چشم نکشودم اکنون پیرافشانی نمودم۔ اگر خود را جمع میکنم دل از تپیدن قیامت می انگیزد، وگر بضبط میپردازم، اشک سیلاب سیلاب[52] میریزد۔ حیرانم که چه سازم، وچه تدبیر نمایم، تا این گرهِ سخت از کارِ خود کشایم۔ چارهٔ بجز توجهِ پیر[53] نمی بینم، هرچه بادا باد، میروم و می نشینم۔ بهمان حالتِ تباهے، در دیده اشک و برلب آهے، نزدیک بنمازِ شام دست بر دوشِ غلام، درصحبتِ درویش آمد۔ حاضران برائے او جا کشادند۔ اشارت کردند تا درصدرِ مجلسش[54] جا دادند۔ گفت که:
"اے برادر کجا بودی؟ امروز دیر تر روی نمودی۔" عرض کرد که "برائے سیرِ جمعه[55] بازار رفته بودم"۔ فرمود: "مگر نشنیده بودی (لمصنّفه[56])

مستمندِ[57] عشق میداند که سودا میکند

دیدنِ طفلانِ ته بازار رسوا میکند

برو، از تاریکدانِ[58] خود تا هشت شبانه روز بیرون میا۔ و سرِ این داستان زینهار مکشا۔ حق تعالیٰ کریم است شاید که اورا بیارد و ترا عزیز نگهدارد۔"

اتفاق چنین افتاد که هنوز یک هفته نشده بود، که شانگه آن ماهِ دو هفته از منزلِ خود برآمد، و بیتاب بر دکان نشست۔ پا دکانیے اِستاده بود، پرسید: "چه حال داری؟ که امشب برنگِ دیگر بنظر می آئی۔ و بیقرار تر می نمائی؟" گفت: "حالتے که می کشم نمی توانم برزبان آورد۔ امّا ترا آشنا میدانم، اگر با تو گفته شود مضائقه ندارد۔ امروز روزِ ششم است که درویشے ازین راه میگذشت۔ چشمش بر عنائیِ من افتاد۔ ساعتی بخود فرو رفته باستاد۔ من که پیشِ خود بَرپا بودم[59]، ملتفت نشدم۔ ناچار دمِ سرد از دلِ گرم برآورد، و رفت۔ حالیا صورتِ او از نظرم نمی رود، و خیالش از خاطرِ من[60] محو نمی شود۔ اگر بیدارم

[51] ن ۲: نگاهدارم۔ [52] ن ۲: یک سیلاب ندارد۔ [53] ن ۱: توجه درویش۔
[54] ن ۲: درمجلس جا دادند۔ [55] ن ۲: جمله بازار۔ [56] ن ۲: ندارد۔
[57] ن ۲: مستجید (کذا)۔ [58] ن ۲: ناکمدان (کذا)۔ [59] ن ۲: بودم ندارد۔ [60] ن ۲: خاطرم۔

شوقش نمی گذارد، وگر در خوابم چشم بر نمی دارد۔ چہ سازم و[1] دل را بچہ پردازم۔ نامش ازکہ پُرسم، نشانش ازکہ جویم؟ راہ[2] را بکجا برم غم را بکہ گویم؟"۔ گفت: "آن — درویشے است نام بر آوردہ۔ مردے است بخود نسپردہ، خلقے بر آستانش رُو نہادہ، عالمی دستِ ارادت باُو دادہ۔ برادرِ خُرد علی متّقی کہ مشہورِ آفاق است، و در زیرِ این سقفِ منقّش طاق۔ آستانۂ اُو کہ خاکش تبرّک میبرند بیرونِ شہر پناہ، متّصلِ عیدگاہ است۔ ہمراہِ من بیا و از بندِ غم برآ۔" غرضکہ آن مردِ کم بغل[3]، جوان را بحضرتِ پدرم آورد۔ حقیقتِ حال شنیدہ گفت کہ: "آخر عشقِ بے پروا حیفِ بے پروائی گرفت، ایمار بغلامے کرد کہ برود[4]، و با برادرِ عزیز بگوید[5] کہ بیا مطلوبِ تو ترا می جوید، ہرگاہ این اشارت مع البشارت[6] بآن جگر خستۂ در بروے خود بستہ رسید، دست افشان و پای کوبان از کلبۂ اَحزان بیرون دَوید۔ نخستین سرِ نیاز را بپابوسِ پیر برا[7] افراخت، آنگاہ دستِ شوق در بغلِ جوان انداخت یعنی بکامِ دل در بر کشید، و آن نخلِ مُراد را بمُرادِ خود دید۔ پیر[8] ہر دو[9] را دست بسر کرد[10]، تا بطورِ خود بنشینند۔ چون صحبت درگیر شد، و سرِ حرف وا۔ درویش گفت کہ "اے جوانِ رعنا من فقیرام[11]، و دلِ بے مدّعا دارم۔ وابستۂ زلفِ خودم نخواہی دانست۔ خدا داند کہ سر رشتۂ دل در کجا بند است، و این جانِ سراپا[12] خواہش برائے چہ آرزومند۔ زینہار بر خود نچینی[13] و حرف بسرِ زلف نزنی، مبادکہ کفِ افسوس کنی۔ درویشان اگرچہ از دائرۂ سپہرِ واژون بیرون اند، اما ایشان را بیک پرکار[14] نمی گذارند۔ یعنی احوالِ ما مردم مختلف است۔ برو کہ رنجے

---

[1] ن ۲: واؤ ندارد۔ [2] ن ۲: رہ۔ [3] ن ۲: کم عقل۔
[4] ن ۲: برود۔ [5] ن ۲: بگو۔ [6] ن ۲: مع بشارت۔
[7] ن ۲: بر ندارد۔ [8] ن ۲: پیر ندارد۔ [9] ن ۲: را ندارد۔
[10] ن ۲: دید ہر دو دست را بسر کرد تا بطور خود بنشینند۔ [11] ن ۲: من فقیرم۔
[12] ن ۱: ہمہ خواہش۔ [13] ن ۲: نہ چینی۔ [14] ن ۲: بیک کار۔

کشیده باشی.» گفت که[1] «رنجے کشیدم لیکن گنجی یافتم. جاروبکشیِ این آستان را شرف میدانم امید که محروم نگذاری، و چشمِ لطف از من برنداری.» هر صبح می آمد و می نشست. کمرِ خدمت[2] بر میانِ جان می بَست.

یکے[3] درویش در حالتی نشسته بود، جوان بسرِ وقتِ اُو اُفتاد. جوانِ عزیزش خواند، و برابرِ خود بنشاند. نظرے در کارش کرد که بکامِ دل رسید، و بهمان لقب شهرهٔ عالم گردید. اکابرانِ شهر عزّتش میکردند، مریدانِ خاص رشک برو[4] میبُردند. آخر برو حالتی طاری شد که بی دُہل رقصِ میدانِ معنی شد. آرے چون نظرِ درویشان[5] اثر میکند، خاکِ ناچیز را زَر میکند.

حکایت[6]

درویشِ جگر ریش، یعنی عمِّ بزرگوار، در هفته دو بار برائے دیدنِ فقیرے[7] «احسان الله» نام، که بادشاهِ وقتِ خود بود، میرفت. چار دیواری سیم گِل کرده، بکمال پاکیزگی دربند، دیوار[8] های بلند مشهور به «تکیهٔ فقیر» آنطرفِ عیدگاهِ اکبرآباد داشت. بر دروازهٔ آن دل برشته این دو مصرعه بزر نبشته:

خاطرِ آسوده خواهی، راهِ آمد شُد ببند
چاک در پیراهنِ دیوار، از دستِ دَر است

هر که درِ اُو را میزَد[9] و آواز میداد، خودش می آمد و لب بجواب میگشاد که «احسان الله در خانه نیست زود بَرو اینجا مایست[10].»

یکی عمِّ من[11] قصدِ دیدنِ اُو کرد و مرا همراه بُرد. چون نزدیک بدروازه رسید همان جواب شنید، یعنی: «احسان الله در خانه نیست.» این مرد گفت: «اگر احسان الله

---

[1] ن ۲. که ندارد.
[2] ن ۲: وکمر.
[3] ن ۲: روزے.
[4] ن ۲: برو رشک.
[5] ن ۲: نظر درویشان چون.
[6] ن ۲: 'حکایت' ندارد.
[7] ن ۲: فقیر.
[8] ن ۲: دربند و دیوارها.
[9] ن ۲: واو ندارد.
[10] مط: مالیست. ولی اینجا مایست فعلِ نهی از ایستادن درکار است.
[11] ن ۲: من و عم.

نیست امان اللہ است." خندید و در را واکرد۔ چولنے دیدم سیر اندام، خورشید[1] سوار،
ہیبتِ حق از جبہۂ[2] او نمودار۔ چادرِ یزدی بر سر۔ آفتابی[3] در کمر۔ چشم سرخش آبِ چشم از
عالمی گرفتہ۔ شیر از عشقِ الٰہی بر درش خوابیدہ۔ مصافحہ بمیان آمد۔ در سایۂ اَراک بہ
تپاک[4] بنشستند و احوالِ ہمدیگر[5] گرفتند۔ گفت کہ: "اے میر امان اللہ، من کہ در بروی[6]
خود کشیدہ ام، آدمی بابِ صحبت ندیدہ ام۔ دل ترا بسیار می خواہد، تا نمی آئی میکاہد۔ بارے
این پسر از کیست؟" گفتا: "فرزندِ علی متقی، و گریبان[7] انداختۂ عاصی است۔" فرمود کہ
"این بچہ ہنوز سوزہ بال است، امّا چنین معلوم میشود، کہ اگر بخوبی پر برآورد، بیک پرواز[8]
آن طرفِ آسمان خواہد رفت، باین بابا بگو، بدیدنِ درویشان ہمّت برگمارد، کہ ـــ
ملاقاتِ ایشان برکت بسیار[9] میدارد۔ پارۂ نانِ خشک در آب تر کردہ، بخوردِ من داد۔
طعامی باین لذّت نخوردہ بودم، ہنوز ذائقۂ من بیادِ او خمیازہ[10] میکشد، و مزۂ او فراموش
نمی شود۔

(نکتہ[11]) گفت کہ[12]: "اے یارِ عزیز، معرفتِ الٰہی غزالِ وحشیِ این صحرائے پُرغبار
است، و جسمِ آدمی مرکب و جانِ او شہسوار۔ اگر صید شد، از ضائع شدنِ مرکب چہ میرود؟
وگر مرکب رو بعدم کرد، و آن صید ہم رم کرد، حسرتی دست[13] بہم میدہد، کہ عذابی[14] الیم تر
از و نباشد[15]۔ عذابِ قبر عبارت ازہمین حال است۔"

(موعظہ[16]) "بیا و بگذر از غرور و ہوس۔ نفسِ شوم، سگیست[17] ہرزہ مرس[18]۔ اگر بگفتۂ

---

[1] ن ۲: سوار از۔ [2] ن ۲: جبہ اش۔ [3] ن ۲: برکمر۔
[4] مط: اراک بے تاک۔ [5] ن ۲: ہمدگر۔ [6] ن ۲: برروئے۔
[7] ن ۱: دور۔ [8] ن ۲: پرواز بر آسمان خواہد رفت۔ [9] مط۔ بسیاری دارد۔
[10] ن ۲: ذائقہ اش خمیازہ می کشد۔ [11] ن ۲: ندارد۔ [12] ن ۲: کہ ندارد۔
[13] ن ۲: دست ندارد۔ [14] مط: عذاب۔ [15] ن ۲: نمی باشد۔
[16] ن ۲: موعظہ ندارد۔ [17] ن ۲: سنگیست۔ [18] ن ۲: برس۔

اُو راه رفتی[1] بر ریسمانِ او، بچاه رفتی۔ وگر[2] بخود کشی از خود بگذری، راہے بسرِ کوچۂ[3] آدمیت بری۔ نادان قباحتِ طولِ اَمل را در نمی یابد، عاقل از پے خود ریسمان نمی تابد۔"

(نکتہ[4]) "آسمان[5] خیمۂ شب بازی است، اشکالِ عجیب وصُورِ[6] غریب، از پردہ برون می آیند، ومیروند۔ این آمدن و رفتن باختیارِ شکل وصورت نیست۔ سر رشتۂ کار بدستِ دیگرے ہست۔ دل بدُنیا منہی کہ دنیا زالِ بی حفاظیست، چون پدر از میان میرود، ہمبسترِ پسر میشود۔ کسانیکہ اہلِ سیرت[7] اند، وغیرت دارند، مطلقاً روی توجہ باین نمی آرند۔"

(حرفہای فقیرانہ[8]) "شیخانِ ریائی، از راہِ خودنمائی، باین عمرِ کوتاہ کہ تا چشم بہم میزنی[9] بپایان میرسد، خرِ خود را چقدر دراز بستہ اند؟ و در چار دیواریِ عناصر، کہ عبارت از دنیا باشد، واز سرِ اُو زود باید برخاست، چون خشت چسان مربّع نشستہ اند[10]۔ بمعنی بی خبر، و[11] بظاہر ہُشیار اند، یعنی از تہِ کار خبر ندارند۔ خلوتِ باصفای ایشان سراسر کدورت است، ملاقات باچنین مردم چہ ضرورت است؟ شایستۂ صحبت آن بینوایانِ برگ بندند، کہ بارِ سایۂ درخت ہم برخود نمی پسندند۔ یا آن فقیرانِ برہنہ تن اند، کہ باخدا[12] دریک پیرہن اند۔ یا آن پہلوانانِ نطعی پوش اند[13]، کہ در جہادِ نفسِ اَمارہ میکوشند۔ یا درویشانِ جگر ریش، بیگانۂ یار و خویش، سرہای نیاز بر خاک، چون آبِ روان پاک۔ شیران این آجام، خونِ دل[14] آشام، بحر اند ونمیجوشند، سیل اند ونمیخروشند۔ خاک شویانِ سرکوچۂ محبت نمد مویانِ بیابانِ وحشت، بندگانِ باخدا واصل، دُور گردانِ نزدیک بدل۔ دلدادگانِ جلوۂ یار، خاک اُفتادگانِ سایۂ دیوار۔ آشنایانِ بحرِ حقیقت، مجردانِ بادیۂ طریقت

---

[1] ن ٢: رفتنی را۔
[2] ن ٢: اگر۔
[3] ن ٢: بہ سر کردہ۔
[4] ن ٢: نکتہ ندارد۔
[5] ن ٢: حر (کذا)۔
[6] ن ٢: صورت۔
[7] ن ٢: اہل شرم۔
[8] ن ٢: ندارد۔
[9] ن ٢: بہم زنی۔
[10] ن ٢: اند ندارد۔
[11] ن ٢: واوَ ندارد۔
[12] ن ٢: باخدا یک پیرہن۔
[13] ن ٢: "یا آن تا پوش اند" ندارد۔
[14] ن ٢: دل ندارد۔

آوارگانِ بمنزل رسیده، آفتابی از سایهٔ شان دَمیده. خاک نشینانِ بر فلک رفته، عزلت گزینانِ نام گرفته. آشفتگانِ دشتِ مهر و وفا، غنچهٔ چسپانِ[1] گلزارِ حیا. سنگِ سخت بالینِ سَر، علامتِ شیدائی در بَر. سنگ بر شکم بندند، و ننالند[2]. نانِ خود را بر شیشه نمالند. طعامِ لذیذ اگر دست دهد، بسوی اُو ننگرایند[3]، نانِ جوان[4] را بنانخورشِ پیر تناول نمایند. طُرفه زرد رخسارانند، نامِ بَرگشته بیمارانند. مزاجِ غیورے دارند برائے دیدنِ کسے که می میرند[5]، بسوی اُو نمی بینند. در سر غرورے دارند تا تیغِ نازِ معشوق نه نشانند[6]، از پا نمی نشینند. محبوبِ حقیقی که متحد باُویند از کمالِ شوق روز و شبش میجویند. جنگ آورانند، که به هفتاد و دو ملّت سَر بسر کرده اند. کیمیا گرانند، که خاکِ ناچیز را هزار بار زر کرده اند. متصرّفِ این[7] کارخانه درویشانند، یعنی هر چه هستند همه[8] ایشانند. آنچه خواهی، دست بدعا افراشته میدهند، یعنی حاصلِ هر دو جهان دست بَرداشته میدهند. سخنِ درویشان بگو. همّت از ایشان بجُو. تا باشی، از ایشان باش، یعنی از آنِ درویشان باش. راهِ دریاے لنگر دارِ حقیقت، که قُفل است، کلیدِ آن زبانِ ایشان. سجّاده بر آب افگندن[9] و بی اندیشه رفتن تصرّفِ ایشان[10]."

چون شام خندید گفت: "اے یارِ عزیز، نمازِ مغرب رسید، اگر چه دل نمیخواهد که ترا دل دهم، امّا پیش از غروبِ آفتاب و طلوع که وقتِ خضوع و خشوع است نمیتوان نشست، برو سلامِ من بعلی متّقی خواهی رسانید." دست بسَر کرد و در را بَر بست.

عمِ من از انجا که آمد، پیشِ پدر رفت و سلامِ فقیر گفت[11]. هر دو دست را بسر بُرد و فرمود که "دیدنِ احسان الله را[12] احسان الله باید شمرد، میرفته باش و سلامِ من نیز

---

[1] ن ۲: چپان. [2] ن ۲: وننالند ندارد. [3] ن ۲: ننگرند.
[4] ن ۲: نان جوین. [5] ن ۲: بمیرند سوی اُو. [6] مط: نه نشیند.
[7] ن ۲: آن. [8] ن ۲: همه. [9] ن ۲: افگنده.
[10] ن ۲: رفتن درویشان. [11] ن ۲: گفته. [12] ن ۲: را ندارد.

میگفته باش۔"

روزِ چهارم دستِ مرا گرفته باز بدرش رفت، و دستک زد۔ آواز داد که در خانه نیستم، گفت "اگر نیستی، بارے کیستی که به خانهٔ آشنائے من جا گرفته ای؟" خنده کرد، و در را گشاد۔ سعادتِ عجیبے دست بهم داد۔ یعنی[۱] سخنانِ نغز شنیدم، و لطفِ بسیارے ازو دیدم۔

گفت "که[۲] اے یارِ عزیز، عشق از روزے که مرا بر کار بسته است، و نقشِ محبّت دُرست در دلم نشسته، هیچ چیز اینجا بچشمِ من نمی آید، و دل[۳] مطلقاً بدنیا نمیگراید۔ تجرّد پیشه ام، بے اندیشه ام۔ اگر عالمے برهم خورد، جمعیّتِ خاطرم[۴] پراگنده نشود، و اگر آسمانے برزمین بیافتد دلے که[۵] دارم، از جا[۶] نرود۔ هرگاه چشم می بندم، نظر بروے کسے میکشایم که از گلِ صد پرده نازکتر است، یعنی از نگاهِ گرم رنگ میبازد۔ چون[۷] سر بگریبان فرو میروم[۸]، تماشائیِ دلبرے میشوم که جلوهٔ او از برق هزار مرتبه شوخ تر است، یعنی دمے با دلم نمیسازد۔ محشر خرامِ من، اگر خرامد، عالمی ته و بالا گردد۔ بلند[۹] بالائے من، چون قد برافرازد، قیامت برپا شود۔ خاکِ راهِ او شو، که سران را تاجِ سر گردی[۱۰]۔ پایمالِ او باش که سرمهٔ چشمِ اہلِ نظر گردی۔ دلے بهم رسان که او پسندد، جانے[۱۱] پیدا کن که با او پیوندد۔ دست[۱۲] بدستِ بے از خودے ده، که ازین[۱۳] راه این راهِ دور دست، دست بدست است[۱۴]۔ زینهار دست بر سرِ دست مَنِه، که چون دست و پا خشک شوند، راه پست است[۱۵]۔"

(نکته[۱۶]) "اے یارِ عزیز، مرگ عجب استحاله ایست که در پیش است۔ از خصمانهٔ

---

۱ ن ۲: بے سخنانِ نو۔ ۲ ن ۲: که ندارد۔ ۳ ن ۲: دل ندارد۔
۴ ن ۲: خاطر۔ ۵ ن ۲: که ندارد۔ ۶ ن ۲: که از جا۔
۷ ن ۲: وچون۔ ۸ ن ۲: می برم۔ ۹ ن ۲: و بلند۔
۱۰ مط، شوی۔ ۱۱ ن ۲: وجانے۔ ۱۲ ن ۲: ودست۔ ۱۳ ن ۲: که درین راه دور دست بدست است۔ ۱۴ ن ۲: آید۔ ۱۵ ن ۲: به پست است۔ ۱۶ ن ۲: نکته ندارد۔

خود غافل مباش۔ یعنی خود را بچشمِ دشمن ببین، کہ دوستی ہمین است۔ حالِ جانِ ہشیار بعدِ مفارقتِ بدن حالِ مستے است معشوق درکنار۔ چون آنجا تجددِ امثال نیست، پس از روزگارِ دراز آن مستی، کہ عبارت از لوثِ دنیا باشد، زائل شود، دفعتہً ذوقِ وصل را دریابد۔ وائے برحالِ جانِ ناآگاہ کہ ازین عالم دور اُفتد، وبآن عالم[1] نسبت نداشتہ باشد، متأسف[2] بماند۔ ہمین دو حال را عارف دوزخ و بہشت میخواند۔"

(موعظہ[3]) "اے یارِ عزیز۔ دل اگر درد خور است، در خور است[4]۔ غم اگر دل خور است، شایستہ تر است۔ دل محزون میجوید نہ شایستۂ طرب۔ جانِ دردناک میخواہند، نہ درمان طلب۔ روے نیاز بسوے اُو آر، کہ بی نیاز است[5]۔ کارہا را باُو سُپار کہ کارساز است۔ پا را در دامن کش و توکل کُن۔ سر را بگریبان اَندر از و تامل کن۔ اگر جان بہ نیاز آید، عنقا است، دل اگر گداز شود، کیمیا است۔" (لمصنفہ[6]):

مدعا نایاب و راہِ جستجو دُور و دراز
پا بدامن، ہمنشین، ناچار می باید کشید

(نکتہ[7]): "اے یارِ عزیز۔ آن معشوقِ یکتا پیرہن، بہر رنگے کہ میخواہد، جامہ میپوشد، گاہے گُل است، وگاہے رنگ، جائے لعل است، وجائے سنگ۔ بعضی از گُل دل خوش میسازند، برخے با رنگ عشق میبازند[8]۔ جمعے لعل را معتبری دانند، جماعتے سنگ را خدا میخوانند۔ ہشیار کہ این مَقام مُزِلّۃُ الأقدام[9] است۔ چشمے باید کہ برغیرِ اُو وانشود، دلے شاید کہ از جاے خود نرود۔ دشمن و دوست ہمہ از اُوست، کہ دلہا در تصرفِ اُوست۔ ہدایت و ضلالت ہر دو مظہرِ اُویند۔ مست و ہشیار ہمہ اُورا[10] می جویند۔ محراب از ابروے اُو پیدا آمد، میخانہ از چشمِ او ہویدا[11] شد۔ مناجاتیان عبادت و طاعت گزیدند خراباتیان

---

[1] ن ۲: عالم ندارد۔ [2] ن ۲: بتاسف۔ [3] ن ۲: موعظہ ندارد۔
[4] ن ۲: درخواست ندارد۔ [5] ن ۲: است ندارد۔ [6] ن ۲: لمصنفہ ندارد۔ [7] ن ۲: نکتہ ندارد۔
[8] ن ۲: ببازند۔ [9] مط: منزلۃ۔ [10] ن ۲: اوراہمہ۔ [11] ن ۲: پیدا۔

جام بر سر کشیدند۔ در محراب بقامت[۱] خم باید شد و در شیره خانه با حالِ درہم۔ یعنی مراعات ہر شان لازم، و پاسِ ہر مرتبه واجب۔

(نکته[۲]) "ای یارِ عزیز۔ ہستیِ واجب، محتاجِ برہان نیست۔

ہر که بر حق دلیل می گوید
به چراغ آفتاب می جوید

ہمین[۳] که آفتاب برآمد[۴]، روز شد۔ اگر مالکے درمیان نباشد، فلک بیافتد، جبل نایستد، خور نتابد، مه نتابد، آتش نسوزد، ہوا نسازد، ابر نبارد، برق نتازد، آب نرود، گیاه نشود، گل ندمد، چمن نخندد، ثمر نیاید، شجر نپاید۔ حق سبحانه[۵] و تعالیٰ را[۶] که کریم می گویند نظر بر غلبهٔ این صفت سررشتهٔ بندگی از دست نباید داد، که آنجا صاحبی است، وقتیکه مینوازد، خاک را آدمی میسازد، دمیکه به[۷] بی نیازی پردازد، آدمی را خاک، پیغمبرِ ما، که در شانِ اوست لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ" تمام تمام[۸] شب نماز خواندے، و اینہمه ایستاده ماندے، که قدمِ مبارکش آماس بہم رساندے، کسانیکه میدیدند، میگفتند: "یا رسول الله، چرا کار را بر خود تنگ گرفته ای؟ تو آنی که عالمے را از بندِ غم دارہانی[۹]"، متبسم شدے و فرمودے: "چه باید کرد، عالم بندگی است۔"! عزیزِ من، نسبتِ بندگی و صاحبی بسیار نازک است، بندگی پیش آر، که از روے صاحب شرمندگی نکشی۔"

سخن اینجا رسانیده بود، که جلودارے از صوبه دارِ شہر رسید، و نیاز و التماس[۱۰] نمود، گفت که "نصرت یار خان براے قدمبوس میرسد۔" فرمود که "خوش باشد ہرچند ذہنِ ملاقاتِ فقیران ندارد، امّا مرا از روے او شرم می آید، که بارہا برگشته رفته است۔ اگر این بار ہم برود، خدا داند که باز ملاقات شود یا نشود۔"

---

۱ ن۲: باقامت۔ ۲ ن۲: نکته ندارد۔ ۳ ن۲: ہمین۔
۴ ن۲: برآید۔ ۵ ن۲: سبحانه ندارد۔ ۶ ن۲: که ندارد۔
۷ ن۲: به ندارد۔ ۸ ن۲: تمام شب۔ ۹ مط: وا رہاندی۔ ۱۰ ن۲: عرض نمود۔

چون بدروازه رسید، از فیل فرود آمده دَوید[1] بسعادتِ پابوسی سر برآسمان[2] رسانیده، پنج اشرفی نذر گذرانید، و گفت که "خوش آمدی و صفا آوردی." عرض کرد که "نہے طالعِ من که بخدمتِ شریف رسیدم، و روے مبارک را بکامِ دل دیدم." چون روے دل از فقیر دید رُو انداخت که گاہے بنگاہے[3] این روسیه را باید نواخت. گفت که[4] "دل قوی دار[5] که روے تازه داری، یعنی خداے عزّ وجلّ ترا اینجا[6] بر روے کار آورده است، اغلب که آنجا هم رُو سفید برآئی. بشکرانهٔ[7] این نعمت رُو انداختگان را بنواز، یعنی رُو از سنگ آهن مدار، و روے ایشان بر خاک میانداز. از خدا رُو دار و بر خود مچین[8]. در کارِ غربا، روے کسے مبین. زینهار که از بیکسان رو نتابی. مبادا که در عرصات[9] رُو نیابی[10]. حالا برو که این یارِ عزیز شیشه جان و[11] نازک مزاج است، و من در پاسداریِ این مرد لاعلاج صوبه دار چون غریبانِ خاکسار پارهٔ رُو بر زمین مالیده[12]، آستانهٔ فقیر را بکمالِ اعتقاد بوسید، و رفت.

در همان حال، پسرِ خوانندهٔ[13]، ساده روئے، مرغوله موئے، عُودی رنگے، سیر آہنگے، طنبور بر دوش، حلقهٔ زر در گوش، ازان راه گذشت، نظرِ فقیر بران اُفتاد، اختیارِ دل بدستش داد. به عمّ من گفت که "این را بخوان و بنشان." چون آن[14] پسر آمد، و نشست، خود بخود این شعرِ آمدی قُبلان[15] را در دوگاه[16] که پرده ایست مشهور، و بیگاه میخوانند، برخواند:

بیا که عمرِ عزیزم بجستجوے تو رفت
ز دل نرفتی و جانم در آرزوے تو رفت

---

[1] ن ۲: دویده. [2] ن ۲: سر بآسمان. [3] ن ۲: بیگاہے. [4] ن ۲: که ندارد.
[5] ن ۲: دل جوی داری. [6] ن ۲: اینجا ندارد. [7] ن ۲: شکرانهٔ.
[8] ن ۲: نچین. [9] ن ۲: عرفات. [10] ن ۲: نتابی.
[11] ن ۲: واؤ ندارد. [12] ن ۲: سوده. [13] ن ۲: خوانده.
[14] ن ۲: جوان بسر آمد. [15] مط: آمده قبلان. ن ۲: آمده فیلان. [16] ن ۲: درگاه.

فقیر را تواجُد دست بهم داد، و حَظِّ بسیارے برداشت۔ گفت که[۱] "اے عزیز امشب پیشِ فقیر بمان و چیزہا[۲] را که میدانی بطورِ خود بخوان"۔ التماس نمود که[۳] "سعادت و بَرجان منّت[۴]"، چون شام قریب بود، مارا رخصت کرد، و در را بربسته بیادِ الٰہی بنشست شنیده شُد که فقیر قصدِ نمازِ خفتن نموده، اشرفی ہارا زیرِ بالین گذاشت[۵]۔ خوانندۂ سیه دل دید، و[۶] بعد از ساعتے ببازار رفت۔ کاسۂ شیرے، درو زہر داخل کرده، آورد، و بمبالغۂ بیش از بیش بخوردِ فقیر داد۔ بمجرّد خوردنِ شیر حالش دگرگشت[۷]۔ دست و پا زدن آغاز نمود، یعنی زہر کارگر اُفتاد۔ آن بے چشم و روے نادرست، اشرفیہارا گرفت و گریخت۔ نصف شب آه آهِ دلخراشِ فقیر، خواب از چشمِ ہمسایگان برداشت۔ مضطرب[۸] دویدند، مُحتَضَر ش دیدند۔ کسان تلاشِ آن عیّارِ طرّار بسیار کردند، چنان در پردۂ گلیمِ شب پنہان شد که بنظر کسی نیامد۔ چون شب بسر دست آمد، چشمِ فقیر بطاق افتاد و جانِ شیرین را بتلخیِ تمامی داد۔ اعیانِ شہر افسوس کُنان پشتِ دست گزان، بر جنازۂ اُو حاضر شدند، و موافقِ وصیّتش در "تکیۂ فقیر"، بخاک سپردند۔ ہنوز آن مکان زیارت گاهِ عزیزان است۔ (لمصنّفہ[۹]):

فلک زین گُونه خون بسیار کرد است

عزیزان را بسے آزار کرد است

آسمانِ خم تنک[۱۰]، عشوه ہای لاجوردی دارد، و نازہای سُہرمزی۔ ہر روز با[۱۱] خاک اُفتادگان می ستیزد۔ ہر شب[۱۲] فتنۂ تازه می انگیزد۔ کسے را بزہرِ ہلاہل ہلاک می سازد، و کسے را بہ تیغِ ستم بخاک می اندازد۔ مستانِ شوق را باید، که از گردشِ این ایمن نشوند، تا سخت نخورند و[۱۳] از جاے خود نروند۔

---

۱ مط۔ که ندارد۔ ۲ ن ۲: را ندارد۔ ۳ ن ۲: عرض کرد۔
۴ ن ۲: سعادت برجان منت۔ ۵ ن ۲: گذاشته۔ ۶ ن ۲: واوٌ ندارد۔
۷ ن ۲: شد۔ ۸ ن ۲: مضطربانه۔ ۹ ن ۲: ندارد۔ ۱۰ ن ۲: چشم تنک۔
۱۱ ن ۲: با ندارد۔ ۱۲ ن ۲: خنده زنان فتنۂ تازه۔ ۱۳ ن ۲: واوٌ ندارد۔

بایزید درویش

(حکایت[1]) عمر مرا ذوقِ صحبتِ درویشان، و شوقِ دیدنِ این مگر ریشان بیشتر بود. روزے از شخصے شنید کہ درویشے بایزید نام متصل "سرائے گیلانی" کہ بنایش سیلاب بآب رسانیده بود[2]، در یکی از حجره های اُو، کہ چون دلِ عاشقان ہزار رَه دارد، اُفتاده میباشد. دیدنی است. چون ازو نشانِ درویش یافت، دلش را آرزو گرفت و ہمہ چیز از فکر اُفتاد. مرا از سَر وا کرده، بسُرعت تمام رفت. جوانے دید[3]، بلند بالا، با کمالِ استغنا. مَلکے واردِ این عالمِ نَی نَی، عزیز تر از جانِ آدم. بالش از سنگ، بستر از خاک، ہر ساعت مُہیّاے ہلاک. شکستہ دل و کُشاده رُو[4]. برشتہ جان و فتیلہ مُو. دلداده، خاک اُفتاده. خود را بخدا سپُرده، راہے بکامِ دل بُرده. اگر خوش چشمے[5] از پیشِ اُو رفتے، بالاے چشمت اَبرو نگفتے[6]. با کسے بر نخوردے، بہ بیکسی بسر بُردے. چشم را اکثر اوقات بستہ میداشت، و دل[7] را بے یادِ حق نمیگذاشت. نان را برغبت ندیدے. آب را از گلو بُریدے. باریک بین و مشکل پسند. در لباسِ قلندرانِ برگ بند[8]. پرسید کہ "چہ نام داری و از کجائی؟ دردمند و عاشق پیشہ مینمائی." گفتا: "اینجائی ام. و میران اللہ نام دارم." گفت: "بنشین کہ با تو دَمے[9] چند خوش بر آرم." میگفت کہ[10] چون زبان بازی بمیان آمد، سر کرد کہ: "اے عزیز راه ہا بُریدم. رنجہا کشیدم. از خود رَمیدم، در کوچہ ہا دَویدم، چون اَبر ایستادم، چون برق اُفتادم، عمرے سرگردان[11] شدم، مدّتے دل پریشان شدم. چندے با چشمِ تر گشتم، آوارهٔ دشت و دَر گشتم. شبہا نخفتم، روزہا نگفتم. دست در دامنِ امیران زدم. سَر[12] بر دروازهٔ فقیران زدم. تا آن شوخ چشم را بر من گذرے اُفتاد، و[13] بحال دگرگون گشتہ[14] من نظرے کرد.

---

[1] ن ۲: ندارد۔ [2] ن ۲: بود ندارد۔ [3] ن ۲: دید ندارد۔ [4] ن ۲: کشاده ابرو۔
[5] ن ۲: چشمے ندارد۔ [6] ن ۲: باداے چشمک نگفتی۔ [7] ن ۲: واو ندارد۔
[8] ن ۲: برگ بید پوشیده۔ [9] ن ۲: دم۔ [10] ن ۲: کہ ندارد۔ [11] ن ۲: سرکرد این۔
[12] ن ۲: و سر۔ [13] ن ۲: واو ندارد۔ [14] ن ۲: گشتہ ام نظر کرد۔

دیر بر سرِ آن غزالِ دُور گرد آمد مرا

از تپیدنہای دل، پہلو بدرد آمد مرا

اگر میخواہی کہ در زُمرۂ سختی کشانِ اُو باشی، باید کہ دل از آہن وجگر از سنگ تراشی[۱]۔"

(سخنانِ غریب[۲]) "اے عزیز- اگر آن محبوب سراپا ناز، پیش چشم است، بہشتِ جاوید[۳]- و اگر از نظر رفت ہمان دوزخِ عاشقِ نااُمید- بدانکہ سرِ کلافہ پیدا نمی شود، یعنی بر ما ہیچ ہویدا نیست- نمیدانم کہ زاہدانِ ریاضت پیشہ چہ در سَر دارند، و بیخودانِ شوقِ آن مستِ سرانداز، از کہ خبر- جمعی را خلشِ خواہشے- جماعتے را کاوشِ کاہشے- کسانیکہ حق شناس اند، مُبَرّا از اُمید و یاسند[۴]- عزیزانیکہ با خدا آیند[۵]، دلدادگانِ رضایند[۶]- جانِ عاشقان را کہ تلخی کار است، خونِ ایشان شیرینِ بسیار است- رنج را[۷] بر خود گوارا کن، تا شایانِ راحت شوی- کار را بسیار با خود[۸] تنگ[۹] بگیر، تا بفراغت رَدی- دل بَرداشتن ازین عالم خوب است- اگر معرفتِ حق[۱۰] میسّر نشود، این ہم خوب است- عمارتِ[۱۱] دنیا در گر دیدنی[۱۲] است، بنای این بر وَہم گذاشتہ اند- طاقِ آسمانِ نیلی اُفتادنی است، در ہوایش مُعلّق داشتہ اند- اگر بمقصود رسیدنی خواہی، در دلے راہ کن- ہر چہ از دستِ کوتہ خدمتت بر آید للّٰہ کن[۱۳]- اگر آشنائے دریاے تہ دارِ حقیقت نمی توانی شد، بارے بر کران باش- یعنی اگر دفعۃً[۱۴] بر مُردنِ خود قادر نیستی، آمادۂ دادنِ جان باش- خود را از قیدِ دَیر ومسجد وارہان- یعنی با خدا باش و در ہمہ جا بمان-"

فائدہ[۱۵] "عارفان دو گروہ اند- مردمِ یک جماعت نقشِ دیوار اند، گوئی کہ زبان

---

۱ ن ۲: خراشی- ۲ ن ۲: ندارد- ۳ ن ۲: است-

۴ ن ۲: امید او باشند- ۵ ط: تاخدایند- ۶ ن ۲: ریاضت رضایند

۷ ن ۲: را ندارد- ۸ ن ۲: بخود- ۹ ن ۲: نیک-

۱۰ ن ۲: حق ندارد- ۱۱ ن ۲: وعمارت- ۱۲ ن ۲: دنیا گردیدنی-

۱۳ ن ۲: روکن- ۱۴ ن ۲: واقعۃ ۱۵ ن ۲: ندارد-

ندارند- یعنی حیرانِ تازه کاریِ آن صنعت گرِ پُرکار اند[1]- دیده اند، آنچه دیده اند- فهمیده اند، آنچه فهمیده اند- مردمانِ جماعتِ دیگر را چون بادام زبانِ مغز دار است، یعنی هر یکی زباندان چشمِ سخنگوی دلدار است- هرگاه شرحِ طرزِ دیدنِ او[2] میکند، هزار رنگ لب میکشاید کیفیتِ مژگان بهم زدنش بقصد[3] زبان آدا مینماید- چنانچه کمالاتِ آن مستِ ناز از حدِّ شمار افزون- کلماتِ این بی اختیار هم از حیزِ بیان بیرون-"

اوّل صحبت بود[4]، زود برخاست- رنجِ فقیر زیاده برین نخواست- پیشِ پدرم آمد، و احوالِ او همگی بیان نمود- او گفت[5]:

هر گُلے را رنگ و بُوئے دیگر است

درویشانِ اهلِ بخیه کجا بهم میرسند- اکثرش میدیده باش-"

یکی بعد از نمازِ پیشین قصدِ دیدنِ او کرد و مرا همراه بُرد- درویش به عنایتِ تمام برخواند[6]- رُو بارُوے خود به عزّت بنشاند- چون خورد سال بودم، رُو بعمِّ من کرد و کلاه از سرم برداشت، یعنی متفحصِ احوال شد، التماس نمود که فرزندِ علی متقی است- گفت: "چه پُرسیدنست[7]؟ پدرِ این بابا مردیست کلان کار- دانائے اسرار- خورشیدِ آسمانِ درویشی- مشهورِ جهان، جانِ درویشی- دریائے است کز[8] و گوهرِ تر برون می آید- ما فقیرانِ کنارِ خشک داریم، از ما چه میکشاید- اے پسر، بعد از نیازِ من خواهی گفت، که کوتاهی از شوقِ بے پایان نیست- شکسته پائی کوچه نمیدهد- و زبختِ کم مدد نیز[9] گذر نیست- میخواهد که ازین[10] خرابه سر بیرون نه نهد- تو قلندرِ مضبوط الاحوال، من به نسبت[11] تو کوچک ابدال- در حقِّ چون منِ بے سر و پائے، بشرطِ مساعدتِ وقت دعائے-"

طرحِ سخن بطورِ دیگر انداخت- عمِّ بزرگوار را مخاطب ساخت[12] که "اے عزیز- همه گوش

---

[1] ن۲: است-
[2] ن۲: او ندارد-
[3] ن۲: رابقصد-
[4] ن۲: بود ندارد-
[5] ن۲: او ندارد-
[6] ن۲: برخوانده-
[7] مط: پرسیدنت تصحیح از ن۲-
[8] ن۲: از-
[9] ن۲: نیز ندارد-
[10] ن۲: این-
[11] ن۲: کہ نسبت-
[12] ن۲: مخاطب بخود-

شَو و سخنِ فقیران بشنو۔"

سخنانِ درویش

(نکتہ)[1] "عبادتِ ما برائے ماست۔ آنجا خدائی است، کرا پَرواست۔ طاعتِ ما این ہمہ نیست کہ بر خود بچینیم، و بر و تکیہ کردہ بنشینیم۔ اگر بپذیرند[2]، احسان بہشت کنند[3]، ما بندہ ایم۔ وَر بحساب نگیرند، جز این نمیتوان گفت کہ شرمندہ ایم۔ اینکہ نفس، ترا چیزے قرار دادہ، شومیِ محض است۔ چون خوب بگُنہِ خودرسی، محرومیِ محض۔ آن سَروِ[4] ناز مائلِ رنگین رفتنِ خود است، و جلوۂ اُو بہزار رنگ سرگرمِ آمد وشُد۔ چہ گمان بُردہ ای، چہ قرار دادہ ای؟ چہ خیال کردہ ای، چہ بدل نہادہ ای؟ گاہے گِل در آب[5] می افگند، گاہے گُل بر سرِ خاک میزند۔ زینہار کہ دل شکنیِ کسے نکنی، و سنگِ ستم بر[6] شیشۂ نزنی۔ دل را کہ عرش میگویند ازین راہ است کہ منزلِ خاصِ آن ماہ است۔

نیازارم زخود ہرگز دلے را
کہ می ترسم درو، جاے تو باشد

(نکتہ)[7]: "اے عزیز۔ آن محبوب محبّت دوست است، یعنی با عاشقان سرے دارد، و با آن بے پروائی بحالِ ایشان نظرے۔ چون مُراقب میگردند، در دل جلوہ گر است۔ چون چشم می بندند در پیشِ نظر۔ از ہر دریکہ میخواہند، می آید۔ بہر رنگے کہ میجویند رو[8] می نماید۔ انقباض و انبساط وابستہ بحالِ ایشان است۔ اگر خوش میشوند، گرفتگی ازین چمن میَرود، وگر محزون میگردند غنچہ وانمیشود۔ امّا طورِ ایشان از راہ و روش بیرون۔ معشوق در آغوش و دلہا ہمہ خون۔ گاہے متفکر، گاہے متحیّر، قرار نمیگیرند تسلّی نمیشوند۔ خدا داند کہ از خدا چہ می خواہند، خواہشے ندارند و میکاہند۔ نشنیدہ ای؟

حکایتِ تمثیلی[9] | کہ در عہدِ[10] مُوسیٰ علیہ السّلام خشک سال شد، مردم[11] در معرضِ تلف اُفتادند۔

---

[1] ن ۲: ندارد۔
[2] ن ۲: بپذیرد۔
[3] ن ۲: کند۔
[4] ن ۲: سرمایۂ ناز۔
[5] ن ۲: را آب۔
[6] ن ۲: برین۔
[7] ن ۲: (نکتہ) ندارد۔
[8] ن ۲: او مینماید۔
[9] ن ۲: ندارد۔
[10] ن ۲: وقت۔
[11] ن ۲: و مردم۔

گفتند که یا موسیٰ[1] در جناب احدیت عرض کن که باران نمیبارد۔ خلق عالم تاب تعب ندارد۔ مُفت ہلاک میشوند، و بربادِ فنا میروند۔ موسیٰ علیہ السّلام برطُور رفت، عرض[2] داد، خطاب آمد که کلک[3] خسپ پریشان گوئے دارم که[4] در فلان گلخن اُفتاده میباشد[5] ماگپ زدنِ اُوخوش داشتیم ازچندے رُو بآسمان نمیکند، و بطورِ[6] خود حرف نمی زند۔ نزولِ باران موقوف برواشدن اُوست۔" چون ازان جناب این جواب شنید، بسوے ہمان گلخن شتافت۔ بارے آن پلاس پوش[7] را دریافت۔ مردے دید بالاے توده، خاکستر، گلیمِ سیاہے دربر۔ ازسرتا پا ہمہ ذوق، مستغرقِ دریاے شوق۔ یکہ بیتِ دیوانِ تجرید فردِ اوّلِ جریدهٔ تفریدِ مجرّد دوچارشدن زبان بکشاد که " یا مُوسیٰ گذرت بر مَزابِل ازچہ اُفتاد؟ بچہ دل نہاده ای که اینجا اُفتاده ای۔ " گفتا که "اِمساکِ باران است، کارے از دستِ[8] دعاے کس نمیکشاید زندگانی دشوار مینماید۔ روے نیاز بجنابِ پاکِ حق بُرده بودم، چنین ظاہر شد توکه سُکوت اختیار کرده ای اِنقباض است۔ تا بَعادتِ قدیم سخن سَر نکنی، اَبر را باد نیارد،[9] و بارانِ رحمت نَبارد۔ خدارا، دَمے رُو بآسمان بنشین، چیزے بگو، واین بلارا برچین۔" گفت: "اے مُوسیٰ تو آن[10] فریبنده را نشناخته ای، و[11] بطورِ من دل را در راهِ او، نباخته ای[12]۔ عبارتِ آن[13] طرّار کنایہ ہا میزند۔ اِشارتش دل بصد جامی افگند۔ استغفر اللّٰہ من بگفتہٴ او کے راه[14] میروم۔ امّا اگر پاسِ رسولِ اُو، نکنم، کافر میشوم که گفته اند ع

با خدا دیوانہ باش و با نبی ہُشیار باش

غرض[15] که آن مقیدِ عشقِ مُطلق و آن حیرتیِ کمالاتِ حق، رُو بفلک کرد و بساطِ سخن را بطورِ

---

[1] ن ۲: که یا ندارد۔ [2] ن ۲: دعرضہ داد۔ [3] مط: کلل خسپ۔ ن ۲: کمال خسپ۔
[4] ن ۲: که ندارد۔ [5] ن ۲: می ماند۔ [6] ن ۲: بوضع۔ [7] مط: پلاش شوق ن ۲: بلاکش شوق۔ [8] ن ۱ و ۲: دست ندارد۔ [9] ن ۲: نکنی باران نبارد و ابر را باد نیارد خدارا۔ [10] ن ۲: ازان۔ [11] ن ۲: واو ندارد۔ [12] ن ۲: نیافته۔
[13] ن ۲: عبارت از طنز و کنایہ می زند۔ [14] ن ۲: براه۔ [15] ن ۲: غرض آن۔

خودگستردکه "اے سراپا فریب، واے دشمنِ شکیب، پیش ازین ابر و باد و باران مسخرِ تو بودند، اکنون حکم کشِ من اند، که[1] اگر من خواهم گفت باد خواهد وزید و[2] ابر خواهد آمد، بارش خواهد شد- بلے حق برطرفِ تُست- ترا دخلے نیست، متصرفِ این کارخانه منم- بیا این فریبندگی[3] را بگذار و برحالِ خلائق رحم آر-"

دوسه بار ازین قسم سخنانِ پریشان گفته بود که ناگاه بادے وزید و ابرِ سیاہے سفید شد- سیلاب سیلاب[4] بارید-

"اے یارِ عزیز- کدام معشوق این قدر پاسِ عاشق میکند- حیف است اگر تعلق بدو نگیری- و در طلبِ آن سرمایهٔ جان نمیری- دل اگر برائے او خون شود بهتر، جان اگر در راهِ اوُ رَود خوشتر- محوِ اوُ برنگے شَو که برنگِ اوُ برآئی- بطریقے گم کُن[5] (؟) که باز رونمائی- رباعی[6]:

نَے دل بخیالِ زلف و روُ باید داد
نے جان بهواے رنگ و بوُ باید داد
اینجا دل را چه قدر، و جان را چه محل
خود را همه اوُ کرده[7] باوُ باید داد

درین حال وقتِ نمازِ عصر[8] رسید، برخاستیم، و باو[9] نماز گذاردیم- بَعدِ فراغ رو بمشرق — نشست و گفت: "اے میر امان الله، امروز چیزے خورده ام که نخورده بودم و دست بچنین طعامے نکرده بودم-" عمِ من قدرے[10] گستاخ شده بود، گفت[11]: "اے درویش مبالغه را[12] حدے و تکلف را نهایتے است- قامتت[13] از بارِ فاقه ها خم است، و سنگِ قناعت بر شکم- برائے

---

۱ ن ۲: که ندارد- ۲ ن ۲: واوَ ندارد- ۳ ن ۲: فریبندگی هارا-
۴ ن ۲: سیلاب بارید- ۵ مط: گم کرد- ن ۲ کم گیرک- ۶ ن ۲: ندارد-
۷ ن ۲: رو- ۸ ن ۱: نماز مغرب ن ۲: عصر ندارد
۹ ن ۲: باد- ۱۰ ن ۱: بالجمله-
۱۱ ن ۲: گفت که- ۱۲ ن ۲: را ندارد- ۱۳ ن ۲: قامت-

یک دمِ آب استخوان می شکنی[1]۔ نانِ گربه را به تیر می زنی۔ هر روز برائے مرگ آماده ای۔ با صد[2] خرابی درین خرابه اُفتاده ای۔ کجا طعامِ لذیذ و کجا تو۔ از دهنِ خود زیاده مگو۔"
گفت: "والله که[3] من زیاده پَر و سُبک پا نیستم۔ جائیکه احتمالِ دروغ باشد نایستم۔ بشنو که از صبح آتشِ جوع زَبانه میکشید، و نفسِ شوم چون سگِ پا سوخته میگردید۔ یعنی میخواست که بشهر بروم و پیشِ کس و ناکس سائل شوم۔ بارے سنگ زیرِ[4] سر گذاشتم و غیرت خود را بزور[5] نگهداشتم۔ یکایک موشے نیم نانِ خشک در دهن گرفته برآمد، و درین حجرهٔ شکسته تر از دلِ عاشق در آمد[6]۔ من که بمعنی شیر شرزه بودم، و بظاهر از فاقه کشیها گربهٔ لاوه، چون مرا دید، آن نیم نان را انداخته گریخت[7]۔ نصف دل خوش برخاستم، و برداشتم، آبے میسّر نبود که پاکش کنم۔ منتظرِ خضر[8] سے نشستم۔ بعد از ساعتے آواز سقّائے بگوشم خورد، کوزهٔ[9] دسته شکسته خود را بُرده آب آوردم و آن نیم نانِ خشک را شُسته تَر کردم و خوردم۔ خدا شاهد است که لذّتِ نعیمِ بهشت میداد۔"

"عزیزِ من۔ در سخنِ درویشان تصنّع و تکلّف نمیباشد۔ ایشان شاگردِ چرخِ دولابی نیَند، که اگر صد کوزه بسازد یکی دسته ندارد۔ در صحبتِ این طائفه شیشه بند کردن سنگ بدل[10] زدن است۔ زبان را نگه باید داشت که شکر آبِ[11] ایشاں شربتِ شهادتِ بے ادب میشود۔"

عمِّ بزرگوار از خطاب[12] خجالت کشید، و عذرِ هرزه چانگی خواست[13]۔ چون تنبیه[14] یافت، بر سرِ عنایت آمد[15] و گفت که "اے عزیز۔ من تُرا از جان عزیز تر دارم، این قدر تنبیه ضرور

---

۱ ن ۲: نمی شکنی۔ ۲ ن ۲: باچند۔ ۳ ن ۲: که ندارد۔ ۴ ن ۲: در زیر سر۔
۵ ن ۲: بزور ندارد۔ ۶ ن ۲: در آمد، آن نیم نان را انداخته گریخت من که بمعنی شیر الخ۔
۷ ن ۲: چون مرا دید . . . تا گریخت ندارد۔ ۸ ن ۲: فقیرے۔
۹ ن ۲: کوزه . . . تا خوردم۔ ندارد۔ ۱۰ ن ۲: بر دل۔ ۱۱ ن ۲: سکرات۔
۱۲ ن ۲: خطاب از۔ ۱۳ ن ۲: نمود۔ ۱۴ ن ۲: متنبّه۔ ۱۵ ن ۲: آمده گفت۔

بود که چانہ[1] بیجا زدن از ادب[2] درویشی دُور است۔"

ہمدران ہنگام شب افتاد[3]، رخصت خواستیم[4]۔ گفت: "خدا[5] برو۔"

ازانجا که آمدیم بخدمتِ شریفِ پدر رفتہ، سلام و پیامِ فقیر رسانیدیم۔ گفت[6] که "عنایتِ ایشان۔ اگر باز باعمِّ خود بروی، البتہ نیازِ من ہم برسانی۔"

(صحبتِ سوم[7]) بخدمتِ او رسیدیم۔ دیدیم کہ بے حضور[8] است، و بیک پہلو افتادہ آه آه[9] میکند۔ چون عمِّ مرا دید، دم سرد کشید و پیش خواند، و این بیتِ شفائی[10] بر زبان راند:

پرستارے ندارم بر سرِ بالینِ بیمارے
مگر آہم ازین پہلو بآن پہلو بگر داند

پرسید کہ[11] "چہ حالت است۔ کہ اینقدر ملالت است؟" گفت: "اے عزیز، سینہ ام بحدّے میسوزد کہ گوئی در درونِ من کسی آتش می افروزد۔ نالہ کہ میکشم[12] زبانۂ آن آتش است آہے کہ میکنم لائحۂ ہمان شعلۂ سرکش۔

من نمی دانم کہ دل می سوزد از غم یا جگر
آتش افتاد است درجائے و دودے میکند

اگر مرگ بفریادِ من رسد خوش بہشتے است، وگرنہ دوزخے است کہ نتیجۂ عملِ زشتے است۔ اکنون باربستنِ جان فتوح است، کہ آمد و رفتِ دم سوہانِ روح است۔ شب بیخوابم، و[13] روز بیتابم، چہ سازم، بچہ پردازم، کہ تا بمیرم قرار بگیرم[14]۔

روزے[15] بشب کنم بصد اندوہِ سینہ سوز
شب را سحر کنم باُمیدِ کدام روز؟

---

[1] ن۲: جامہ۔ [2] ن۲: آداب۔ [3] ن۲: روز تمام شد و شام افتاد۔
[4] ن۲: خواستم۔ [5] ن۲: جلد برو۔ [6] ن۲: فرمود۔ [7] مط: سیم۔
[8] ن۲: بحضور۔ [9] ن۲: آه میکند۔ [10] ن۲: حکیم شفائی۔ [11] ن۲: کہ ندارد۔
[12] ن۲: نالہ میکشم کہ زبانہ۔ [13] ن۲: واوٗ ندارد۔ [14] ن۲: گیرم۔ [15] مط: روز۔

بادے کہ میوزد دامن بر آتش میزند' آبے کہ میخورم کارِ روغن میکند۔ دوائے مناسب مناسبتے ندارد۔ تدبیرِ[1] موافق موافقتے نمیکند۔ اگر بباغم ببری' از سوزِ درون ناخوشم۔ در بعمانم بیندازی من ہمان در آتشم۔ کاش سینۂ من بشگافند و[2] دل وجگر را زود برآرند۔ یا مرا ازینجا ببرند و زندہ بزیرِ خاک بسپارند[3]۔"

القصہ' احوالِ آن دل[4] سوختۂ جگر کباب' تا بزوالِ آفتاب بہ ہمین[5] یک وتیرہ بود۔ گاہے دست بدیوار[6] دادہ می ایستاد' گاہے[7] می نشست ومی اُفتاد۔ گاہے چشم میکشاد و نومیدانہ می دید۔ گاہے چون ماہیِ بے آب می تپید[8] ناگاہ از زبانِ من شنید کہ وقتِ نماز ظہر[9] رسید۔ بخضوع وخشوع سجودے برد[10] "سبحانَ رَبیّ الاَعلیٰ[11]" گفت وبمرد۔

آتشِ عشقش بسے را سوختست

لیک زین سان کم کسی را سوختست

عمِ بزرگوار[12] باچند غلام بہ تجہیز وتکفینِ اُو بپرداخت و در ہمان حجرۂ شکستہ تراز دلِ عاشق' مدفون ساخت۔ از شنیدنِ این خبر' جنابِ پدرم پشت دست گزید وگفت کہ "آدمی رُوشے اینچنین دیر پیدا میشود۔ صد حیف کہ زُود رفت۔"

نقل[13] شبے در خوابِ عمِ من آن دل سوختۂ از جہان رفتہ می آید[14] ومیگوید: "دیدی کہ عشق چہ آتشی در من زد و چسانم[15] سوخت۔ چارۂ کار جز[16] مرگ نبود۔ چون بیتابیِ جانِ مرا دیدند' در بحرِ مواجِ رحمتم انداختند' و باگوہرِ مقصود ہمکنارم ساختند۔ یعنی تسلی گردیدم وآرام گرفتم۔ وبکامِ جان ازان نگارِ بہشت رُو کام گرفتم۔" از دیدنِ این واقعہ[17]

---

[1] ن ٢: وتدبیر۔ [2] ن ٢: واوَ ندارد۔ [3] ن ٢: سپارند۔ [4] ن ٢: دل ندارد۔
[5] ن ٢: ہمین۔ [6] ن ٢: بردلوار۔ [7] ن ٢: وگاہے۔ [8] مط: طپید۔
[9] ن ٢: نماند وظہر۔ [10] ن ٢: نبود۔ [11] ن ٢: سبحان اللہ علی۔ [12] ن ١: بزرگ۔
[13] ن ٢: ندارد۔ [14] مط: آمد۔ [15] ن ١ و ن ٢: جانم۔
[16] ن ٢: کارمن۔ [17] ن ١: واقعۂ حیرت فزا۔

وحشتے[1] در مزاجِ شریفِ او پیدا آمد۔ مدّتے باکس اُنس نگرفت۔ اکثر اوقات میگفت کہ "بایزید عجیب سوختہ جانے بود، داغِ جدائیِ او کہ[2] بر جانِ[3] منست، تا زندہ ام سیاہی نخواہد افگند۔" برسبیلِ حکایت این خواب را بخدمت پدرم[4] نقل کرد گفت: چہ عجب کہ حق تعالیٰ کریمِ مطلق است۔ نشنیدہ ای

حکایتِ تمثیلی[5]

کہ[6] عارفِ نامی بایزیدِ بسطامیؒ ہمسایۂ دیوار بدیوارِ ترسائے بود[7] و از چہل سال با او آشنائی داشت۔ او ہر سحر تختہ میزد، و[8] این میگفت کہ اے ترسا از این تختہ زدن در فردوس بر روے[9] تو باز نخواہد شد۔ اگر نجات میخواہی بیا اسلام قبول کن۔" یکے بخاطرش رسید کہ بایزیدؒ آدمے سہلے نیست، چہل سال است کہ دعوتِ اسلام میکند، خالی از چیزے[10] نخواہد بود۔" سر زدہ در مجلسِ او رفتہ میگوید: "اے شیخ تو کہ ہر صبح میگوئی مسلمان شو ضامنِ نجاتِ من میتوانی شد؟" شیخ را حالتِ سُکر بود، کاغذے از کاغذگر طلبید و ضامنیِ نجاتِ او نوشتہ داد۔ رفت و مسلمان شد۔ اتفاقاً در ہمان ہفتہ فجأۃً بمرد۔ ورثہ آن نوشتۂ شیخ را بگریبانِ کفن چسپاندہ بخاکش سپردند۔ چون شیخ بخود آمد[11]، بخود فرو رفت۔ مریدے باعثِ حیرت پرسید۔ گفت: "در حالتِ مستی[12] متعہدِ امرے شدہ ام کہ از عہدۂ آن بیرون[13] نمیتوانم آمد۔" گفتا دران حال ترسائے دوست[14] روئے از دستِ شیخ ضامنیِ نجاتِ خود نویسانیدہ بُردہ بود، میگویند کہ مسلمان شد و مرد۔" شیخ غش کرد، چون این سخنش بگوش آمد۔ آب بسیارے بر رویش زدند[15] تا بہوش آمد۔ سر کرد کہ "من در نجاتِ خود تردّدے داشتم۔ این جگر از کجا بہم رسانَدم کہ متکفّلِ نجاتِ دیگرے شدم[16]۔" اُفتان و[17]

---

[1] ن ۲: وحشت۔ [2] ن ۲: کہ ندارد۔ [3] ن ۲: جگر۔

[4] ن ۲: برسبیلِ حکایت بخدمت پدرم این خواب را۔ [5] ن ۲: ندارد۔

[6] ن ۲: کہ ندارد۔ [7] ن ۲: واؤ ندارد۔ [8] ن ۲: واؤ ندارد۔ [9] ن ۲: بر روئے۔

[10] ن ۲: خیرے۔ [11] ن ۲: بخود در آمد۔ [12] ن ۲: مستی ندارد۔ [13] ن ۲: آمدن نمی توانم آمد

[14] ن ۲: دوست ندارد۔ [15] ن ۲: زد۔ [16] مط: شوم۔ [17] ن ۲: واؤ ندارد۔

خیزان برگورِ آن نَومسلمان شده رفت و متوجّہِ باطن شد۔ در معاملہ اش دید کہ ہمان کاغذ بدست دارد و میگوید کہ: "اے بایزید۔ نوشتۂ تو ہیچ بکارِ من نیامد۔ پیش از نمودنِ این پرچہ کہ دست پیچِ نجاتِ خود کردہ بودم، بطرزے کریم[۵۱] سوے خودم خواند کہ چشمِ فرشتگانِ مقرّب حیرانِ کارِ من ماند۔ موجبِ دلِ پریشانیِ خود مَشو۔ قلمبند کردۂ توانیست، بگیر و بَرَو۔"

ہرگاہ کرمِ اُو بدان را اینچنین دَرمی یابد، آن فقیر خود از خوبانِ روزگار بود اگر بدریاے رحمتش غوطہ ہا نخوردے، این ماجرا آب[۵۲] بُردے۔"

سخنانِ نغز[۵۳] "اے برادرِ عزیز۔ چون دانستی کہ آن گلِ ہمیشہ بہار بہزار رنگ بَرمی آید، و این چمن رسانیدۂ اُوست، و این رنگہا ریختۂ اُو۔ اگر بینا شوی[۵۴] بتأمل شو۔ وگر قدم کُشائی، فہمیدہ رَو۔ در ہمہ ذرّاتِ کائنات، پرتوِ ہمان آفتاب است۔ اگر شناساے طرزِ اُو شدہ ای، دولت کامیاب است۔ کسی را کہ دیدہ و دل بیناست، میداند کہ حباب و موج از دریاست۔ حق برطرفِ غافل است، اگر غافل ماند[۵۵] برساحل اُفتادہ از دریاچہ داند۔ بیا کہ برخیزیم، و از میان رَدیم[۵۶]، شاید کہ بکامِ جان ہمہ اُو شویم۔ موسمِ جوانی رفت، لطفِ زندگانی رفت۔ عمر بشست[۵۷] سالگی کشید۔ پیرانہ سالی دررسید۔ قامت خم شد۔ طاقت کم شد۔ دماغ ضعیف، جسم نحیف، روانی از طبیعت رفت، و تیزی از ہوش۔ بینائی از چشم و شنوائی از گوش۔ ذوق بیذوق۔ دندان بے زور۔ پا ناتوان سر بے شور۔ مُوے سفید، دل نا اُمید[۵۸]۔ زنگ و زنجیر از کمر واکن، ایامِ آرایشِ فقیری رفت۔ زنجیرِ سر در پاکن، ہنگامِ زینتِ قلندری گذشت۔"

نکتہ[۵۹] "در معاش پاسِ مشہور کن و در مَعاد مراعاتِ معقول۔ یعنی ظاہر را ــــ

---

۵۱ ن ۲: کرم کریم۔
۵۲ ن ۲: بسیار آب بردے۔
۵۳ ن ۲: ندارد۔
۵۴ ن ۲: مائل شو۔
۵۵ ن ۲: عاقلیست اگر غافل ماند۔
۵۶ ن ۲: بردیم۔
۵۷ ن ۲: شصت۔
۵۸ ن ۲: نومید۔
۵۹ ن ۲: ندارد۔

مطابقِ باطن[1] بیارا،[2] و باطن را مطابقِ[3] عقل نما۔ اگر یار در حرم جلوه گر است، مسلمان شدن هنر[4] است۔ مقصودِ دل اوست، از هر دریکه برآید۔ دگر[5] جلوۂ او در دیر لاریب است، پس کافر شدن چه عیب است۔ منظورِ چشم اوست، از هر جا که رُو نماید۔

بدیر و کعبه میگردیم، گاه[6] اینجا و گاه آنجا
که مطلب جستجوے اوست، خواه اینجا و خواه آنجا

نصیحتِ درویشانه[7]

"باید که عزلت گزینی و چندے تنها نشینی۔ سرمۂ خفا در چشم کش و بر هیچ چیز التفات مکن۔ نظر[8] بر خدا دار، و هرگز باکسی ملاقات مکن۔ بسیار با مردمِ سَر در[9] هوا برخوردی، وقت آنست که مژگان برهم[10] زدی و مُردی۔ سر پیچ زدن تا کجا؟ غفلت را بگذار۔ اگر دقیقه فهمی سَر ازین مضمون برآر۔

دیده ام در علمِ صحبت های رنگین صد کتاب
کرده ام یک مصرعۂ تنها نشینی انتخاب

نمیدانم که چه میسگالی، که سَرِ زخمِ خود نمی مالی۔ بیش ازین سرگرانِ هوا و هَوس ممان۔ سر را از نشۂ یادِ حق سبک گردان۔ نظر بر ریشِ سفید شانه کاری ننمائی۔[11] قصدِ خرقِ عادت نکنی۔ گاوَ در خرمنِ اُو نه بندی۔[12] چون خدا بستن خود را بَخریت[13] شهرۂ شهر کردن است۔ ور بے اراده کرامتے ظاهر شود چون شجر شاخ بر دیوار نکنی، که ثمرۂ آن شاخ از پشیمانی برآوردن۔ شاه اندازی را فقیران عیب میدانند، یعنی مُتکبّر و مُغتر[14] را آدمی نمیخوانند، وقتیکه رخصت شد، با خود قرار داد که آینده جائے نَروم، و روزے دو بار حاضر شوم۔

---

[1] ن ۱ و ن ۲: نقل۔ [2] مط: بیار۔ [3] ن ۲: موافق۔ [4] ن ۲: بهتر۔
[5] مط: دگر۔ [6] ن ۲: گر۔ [7] ن ۲: ندا: د۔ [8] ن ۲: با خدا۔
[9] ن ۲: سرد هوا۔ [10] ن ۲: بهم۔ [11] ن ۲: نمائی یعنی بفریب و تملّق تا یاری نمائی قصد الخ۔
[12] مط: گاوَ در خرمن زور مندی۔ مط: کار در خرمن (تصحیح قیاسی از مرتّب)۔
[13] ن ۲: بحیرت۔ [14] ن ۲: متغیر۔

یکے پدرم گفت کہ "اے برادرِ عزیز۔ دماغ آخر میرود، یعنی ہر روز ضعیف میشود۔ اگر صرفِ حفظِ قرآن[1] شود چہ طور است؟" التماس کرد کہ "خوب بخاطر گذشت۔" چنانچہ در مدتِ یک[2] و نیم سال مصحفِ مجید را یاد گرفتند۔

نقلِ عجیب[3]

روزے باہم نشستہ بودند، و دَور میکردند، کہ درویشے[4] اسد اللہ نام، پیراہنِ نیلی دَربر، و کُلاہِ[5] نمد بر سَر، وارد شد۔ چون دوچار[7] پدرم گشت، گفت[6]: کہ "اے سیرابہ پزِ کبود جامہ، چرا[7] سفرِ دور و دراز اختیار کردی، و شدائدِ راہِ خوابیدہ بر خود ہموار ساختی۔" آن عزیز دَوید[8] و درقدم اُفتاد۔ سَرش در کنار گرفت و قریبِ[9] خود جا داد۔ عمِ من حیرانِ این اختلاط شدہ[10] پرسید کہ "این بزرگ کیست؟" گفتا: "آشنائے قدیمِ ماست۔" حیران تر شد، و التماس نمود کہ "برائے رابطۂ این چنین، ملاقات بسیار شرط است۔ (من) کہ[11] این مرد را گاہے ندیدہ ام۔" گفت کہ: "من و این مرید یک پیریم۔ در دو سال یک بار بخدمتِ ایشان حاضر میشد۔ یکی سوال کردم: "چہ شود کہ آثارِ مرگ بر من ظاہر شود، تا بکارِ گور پردازم، و دل را بچیزے[12] دیگر مشغول نسازم۔" ارشاد شد کہ "ہرگاہ این[13] سیرابہ پزِ کبود جامہ را بینی، یقین بدانی کہ تا سالِ دیگر زندہ نمانی۔" دانستہ باش فرصتِ[14] عمرِ من بسیار کم است۔"

عمِ بزرگوار[15] از استماعِ این کلمات، سخت متألم شد و گفت[16]: "اِن شاء اللہ من این واقعہ را نخواہم دید۔ یعنی آن روز در جہان نخواہم بود، و این غم نخواہم کشید۔" و میکہ باآن تازہ وارد سرِ حرف واشد، نقل کرد کہ از چندے دُکانِ من نمیگردید، یعنی سیرابہ

---

[1] ن ۲: قرآن شریف۔ [2] ن ۲: واو ندارد۔ [3] ن ۲: ندارد۔
[4] ن ۲ و مط: درویش۔ [5] ن ۲: واو ندارد۔ [6] ن ۲:
[7] ن ۲: چارا۔ [8] ن ۱: دُوید و دَر قدم۔ [9] ن ۱: پیش خود۔
[10] ن ۲: شدو۔ [11] ن ۲: (من) کہ ندارد۔ [12] ن ۲: بچیز (نیز مط)۔
[13] ن ۱۲: این ندارد۔ [14] ن ۲: کہ فرصت۔ [15] ن ۲: بزرگ۔ [16] ن ۲: کہ۔

مرا کسی نمیخرید۔ شب می پختم و[1] روز می انداختم، دم و دُود یکه داشتم، صَرفِ خسارت شد ناچار دل بدریا افگنده، لب خشک وچشم تر برخاک اُفتاده بودم، ناگاه خوابم در رُبود۔ دیدم که پیر[2] برسر ایستاده است ومیگوید که: "اے اسد اللہ ہر چند صعوبتِ سفر بسیار است و راه دور۔ اما یکبار برخوردنِ تو باعلی متقی ضرور۔ درمیانِ من و اُو اِشاره ایست همین که تو خواهی رسید، اُو خواهد فهمید۔ باید که زُود بِروی، واز کساد بازاری پریشان نشوی که چون ازانجا برگردی، دکانتِ آنچنان گردد، که سیرابهٔ تو تبرّک گردد۔" برخاستم ودکّان رابشاگرد گذاشتم و[3] نیم نانِ خشک بطریقِ زادِ راه برداشتم۔ باندک زمانے از جهانے بجهانے آدم یعنی ازکبود جامه باکبرآباد رسیدم، وتُرا بمرادِ دلِ مشتاق دیدم۔ اکنون رفتنِ من باختیارِ تست، هرگاه خواهی گفت، اندازِ آنطرف خواهم کرد۔"

پدرم متبسّم شد وگفت که "اے اسد اللہ اینهمه باهو سوار شدن از برائے چه؟ سیرابه ضائع نمیشود، که اینهمه[4] دست پا چه میشوی۔ ازگردِ راه رسیده ای، رنج بے[5] پایان کشیده ای۔ اگر مشتاقِ ما فقیران نه ای، چندے برائے رفعِ ماندگیِ خود بمان۔ شتاب چیست؟ رخصت هم اتّفاق میشود۔" بغلامے اشارت رفت که فرشِ خوابش در حجرهٔ عمِّ من درست کند، وآب بدستِ اُو ریزد۔ حاصل که، ساعتی از خود جدا نمیگذاشت، و بذلجوئی و مزاح گوئی میداشت۔

مسئلہ رُؤیت

(فائده)[6] یکی آن مهمانِ عزیز سوال کرد که "درمسئلهٔ رؤیت تردّدے دارم۔ خدا خوانان دو جماعت اند، جماعتے برآنست که روزے آن غیرتِ ماه را، چون بدرِ کامل تماشا خواهیم کرد۔ عقیدهٔ جماعتِ دیگر این که ادراکِ آن آفتاب ازبصرِ بشر[7] امکان ندارد۔ فرمود که: "ما فقیران را هیچ تردّدے

---

[1] مط: بیختم روز۔
[2] ن۲: پدر۔
[3] ن۲: واو ندارد۔
[4] ن۲: این همه ندارد۔
[5] ن۲: بیابان۔
[6] ن۲: ندارد۔
[7] ن۲: نظر بشر۔

نیست۔ چون مقرر شد کہ اُو عینِ عالم است، بہر جا[1] کہ نظر افگنیم[2] او بنظر می آید۔ در ہر کہ می نگریم[3] اُو رُو مینماید۔ آن معنی بہر صورت جلوہ گر است، و دیدارِ او بشرطِ نظر میسّر۔"

القصہ بعد[4] یک ہفتہ رخصت شد، و گلبانگ بر قدم زد۔

حکایتِ جانسوز[5]

صبح عیدِ عمّوی من، تبدیلِ رخت کردہ، بمصلّی رفت۔ ازانجا کہ آمد، در سینہ اش دردے[6] ظاہر شد، بشدّتی کہ رنگِ رُویش شکست، و قرار از دل رخت بست۔ والدِ مرا طلبید، و گفت: "دردے دارم کہ بکمالِ بیدردیست۔ یافتہ ام کہ[7] این درد عاقبت ندارد۔ وخفگی بمرتبہ ایست کہ نفس تنگی میکند۔ غالبًا جانِ ناتوان طاقت ندارد۔ عبائے[8] را از تنِ من بکشید کہ خوش نمی آید۔ کُلاہم دُور بیندازید کہ بر سر گرانی مینماید۔ جانم ناتوان است۔ بیمارِ من گران است۔ چون شام شد، آن درد عام شد۔ شورِ آہ آہش بلند گشت۔ ہمگی یک دلِ دردمند گشت۔ دمیکہ بضبط پرداختے، خود را غنچہ ساختے۔ گہے کہ از درد نالاں شدے، چوں گُل پریشاں شدے۔ وقتیکہ دلش[9] بسیار گرفتے، آہِ آتشناک کشیدے۔ دودِ جگر، کہ کبابِ گذشتہ بود، بآسمان[10] رسیدے۔ اگر سخن راندے، این رباعی[11] خواندے۔ (لمصنّفہ)

وقت است کہ رُو بمرگ یکبارہ کنیم
آن درد نداریم کہ ما چارہ کنیم
بیماریِ صعبِ عشق دارد دلِ ما[12]
گر جامہ گذاریم، کفن پارہ کنیم

---

۱ ن۲: ہر۔
۲ ن۲: افگنم۔
۳ ن۲: نگرم۔
۴ مط۔ بعہدِ۔
۵ ن۲: ندارد۔
۶ ن۲: دردے در سینہ اش۔
۷ مط۔ کہ ندارد۔
۸ ن۲: عبایی را۔
۹ مط۔ وقتے دلش۔
۱۰ ن۲: دردِ جگر او کباب گذشتہ۔
۱۱ ن۲: اگر سخن راندے، برخواندے (این رباعی ندارد)
۱۲ ن۲: مصرع سوم و چہارم ندارد۔

چون پاسے از شب گذشت[۵۱]، کار از بیطاقتی برو تنگ شد۔ با پیر گفت که: "آخر دلِ سختی کشیدهٔ من[۵۲] کبابِ سنگ شد، تو خود آگاهِ رازِ این میخانه ای۔ اگر ته شیشهٔ[۵۳] از عمرِ من باقی مانده باشد، بکسے دیگرے بده، که دُرد نوشی باین دَرد کشیدن جگرے میخواهد۔ من ازین جانِ شیرینِ تلخیِ مرگ را صد مرتبه گوارا تر می بینم[۵۴]۔ توجهی کن که[۵۵] آسان بمیرم۔ بخشای که آرام بگیرم[۵۶]۔" آخرِ شب، کلاهِ شب[۵۷] پوش را بمن بخشید، و چشم از غلبهٔ ناتوانی بپوشید۔ دمیکه شب شکست، یعنی سفیدهٔ[۵۸] صبح دمید، جانِ المناکِ اُو برلب رسید۔ مؤذّنِ مسجد "الله اکبر" گفت، آن بیمارِ شب زنده دار، بخفت۔ یعنی دست بردل نهاد، و جان بجان آفرین داد۔

پیرِ اُو دستار برزمین زد، و گریبان درید، وازین واقعهٔ جانکاه اَلفِها بَر سینه بُرید۔ مُریدانش خاک برسر، و داغ برجگر با صد پریشانی، چنانکه میدانی، برسمیاتِ مُردهٔ اُو پرداختند، و جنازهٔ آن دردمند را دُرست ساختند۔

عشق دردے بے دوائے بوده است
بَهرِ جان و دل، بلائے بوده است

هرگاه برائے نماز اِستادند، اکثرے برخاک اُفتادند۔ پدرم گفت که "اے ناواقفِ پاسِ آشنائیٔ دیر معلوم شد که بیوفائیٔ۔ آنچنان گرم رفتی که سینهٔ مرا تفتی۔ یاران اینچنین نمی رَوند غمخواران بے مروّت نمیشوند۔

چه شد آن وفا و عهدے، که تو وعده ها نمودی
بتو من چه گفته بودم، تو بمن چه گفته بودی!

بزرگانش دوش بر[۵۹] تابوت گذاشتند یعنی بعزّتِ تمامش بَرداشتند۔ آهِ پیرِ برسیم

---

[۵۱] ن ۲: چون پاسے گذشته۔ [۵۲] ن ۲: دل سختی دیدهٔ من کباب سنگ شد۔
[۵۳] ن ۲: از ندارد۔ [۵۴] ن ۱: دانم۔ [۵۵] ن ۲: که ندارد۔
[۵۶] ن ۲: بگیرم ندارد۔ [۵۷] ن ۲: سیه پوش۔ [۵۸] مط: سفید۔ [۵۹] ن ۲: بزیر۔

عَلَمِ مُردگان پیش پیش روان۔ معتقدانش سیلاب سیلاب سرشک اُفشان۔ مردہ اورا
بیرونِ شہر بُردند و بگوشۂ باغے[۱] بخاک سُپردند۔ گُلہا افشاندند، فاتحہ خواندند۔ ملالتِ بیحد
کشیدند، چارۂ جز صبر ندیدند۔

روزِ سوم[۲] کہ عزیزانِ شہر برائے فاتحہ آمدند، پدرم گفت: "کسیکہ این چنین — عزیزش مُردہ باشد اگر اُورا "عزیزِ مُردہ" گویند می اُفتد۔ از امروز مرا "عزیزِ مُردہ" میگفتہ باشند۔" چنانچہ در شہر بہمین[۳] لقب شہرت گرفت۔ روزے صد بار گریستے۔ بہ حالِ مردگان زیستے۔ منکہ بغل پروردۂ اُو بودم، حوائجِ خود را باو میگفتم، باو میخوردم، باو میخفتم، روزہا یاد میکردم، شبہا[۴] فریاد میکردم۔ درویشِ 'عزیزِ مُردہ' بدلجوئی میپرداخت، و ہیچ[۵] چہ آزردہ دلم نمیساخت۔ گاہ میگفت کہ: "اے پسر، من ترا بسیار میخواہم، امّا ازین[۶] غم میکاہم کہ من نیز بر سرِ راہم۔" گاہ میگفت کہ: "ماہِ من نہ طفلِ ہالہ ای، الحمدللہ کہ دہ سالہ ای۔ چہ بکاہش اُفتادہ ای، آخر درویش زادہ ای۔ دل را قوی دار، خود را بخدا سپار۔ شاد بزی، وخوش[۷] بمان۔ مرا طرحِ کشِ خود بدان۔ جانِ من مگر طفلِ شیری کہ ہر زمان دلگیری؟ اندیشۂ خود[۸] چرا داری، وارثے چون خدا داری۔ رفتگان باز نمی آیند۔ گذشتگان رُو نمی نمایند۔ اے پسر، دنیا در گذر است، و ہر کرامی بینی در جناحِ سفر۔ نہ پنداری کہ جائے بودنت جہان است[۹]۔ این قرار دادۂ مجلسِ رَوان است۔ حاضران رفتہ اند۔ نشستگان گذشتہ اند۔ غنچہ پیشانی مشو، چون گُل شگفتہ رُو می باش۔ بہارِ این چمن[۱۰] رفتنی است، بہ عبث دل مخراش۔ مقامرخانۂ آفاق را چنین ساختہ اند، کہ درو چون تو بسیارے دل باختہ اند۔ تا واقفِ راہ و رسمِ اینجا نشوی، زینہار کہ این راہ نَروی۔ در حریفانِ سخت باز و طرّار، مثلیست "قمار در راہ قمار"۔ ہر روز ازین قسم سخن کردے، و بنازِ تمام پَروردے۔

---

۱ ن ۲: باغ۔ ۲ مط و ن ۲: سیوم۔ ۳ ن ۲: ہمین۔ ۴ ن ۲: نالہ و فریاد۔
۵ ن ۲: ہیچ۔ ۶ ن ۲: درین۔ ۷ ن ۲: واو ندارد۔
۸ ن ۲: خود را۔ ۹ ن ۲: کہ جائے بودنست۔ ۱۰ ن ۲: غنچہ۔

(نقل است[۵۱]) روزے بتلخ کامیِ تمام، حلوائے مرگ قسمت میکرد، که جوانے سروانِدام احمد بیگ نام، شکّری رنگ، دانهٔ چند شکر انگور بر دست گذاشته، نذر گذرانید، وگفت: "تازه از ولایت آمده ام، وارادهٔ حج دارم. چون وارد شهر شدم، آوازهٔ درویشیِ تو شنیدم، مشتاق شده بخدمتِ سامیِ تو[۵۲] رسیدم." گفت: "مگر نشنیده ای؟:

چرا بپاے خود اے کعبه رَو، نمی اُفتی
همان توئی، که به فرسنگ مینمایندت.

اولاً خود را دریاب، آنگاه برائے کعبه شتاب. کعبه عبارت از دلهاے خستهٔ درویشان است، ومقصود دست وبغل با این جگر ریشان. اگر دلِ ایشان بدست آید، کعبهٔ مراد بے سعی رو مینماید[۵۳]. ازینجا[۵۴]ست که کسی گفته رفته است:

زکعبه آیم و رشک آیدم زخونتابے.
که از زیارتِ دلهاے خسته می آید

دلِ درویشان جائے خوشیست[۵۵]. این ویرانه را هوائے خوشیست[۵۶]. دل را منزلِ آن ماه میگویند مقصود ازهمین[۵۷] درمیجویند. سالکے بطوافِ کعبه رفته بود، کسی را دران خانه ندید، با دلِ پُر آرزو ناکام برگردید، در همان حال گفت:

کعبه را دیدم، دلم از دردِ تنهائی گداخت
مجلس آرائے که مارا خواند، خود مهمانِ کیست؟

آنچه تو میگوئی، محرمِ حرم نیز همین[۵۸] گوید. کسی را که تو میجوئی، کعبه هم اُورا میجوید:

هر کرا دیدم، چو من گم گشتهٔ تحقیق بود
کعبه را هم بے تکلّف در بیابان یافتم

---

۵۱ ن ۲: ندارد.
۵۲ ن ۲: تو ندارد.
۵۳ مط: بے سعی نماید. تصیح از ن ۲.
۵۴ ن ۲: وازین.
۵۵، ۵۶ ن ۲: خوشیست.
۵۷ ن ۲: ازین.
۵۸ مط: گویند ن ۲ نیزی گوید.

گردِ دلها بگرد، که طوافِ حرم اینست[1]. بلاگردانِ خود شو، که مطلبِ عمده همین[2] است. وجودِ غیر موجود نیست، وکسی بے اُو مشهود نے:

گفتم بحرم، محرمِ این خانه کدام است؟
آهسته بمن گفت که بیگانه کدام است؟

مرا برجوانیِ تو رحم می آید، که رنجها خواهی کشید، وبمطلب نخواهی رسید. سخنِ درویشان بگوشِ جان بشنو. چندے فروکش کن، و[3]ازینجا مرو. جوان چون[4] رُوے دل از درویش دید، سر را ازفرمان نه پیچید. یعنی رحلِ[5] اقامت انداخت، و به ریاضتِ شاقه پرداخت. ذهنِ سلیمے داشت. کسب کرد و درمدّتِ هفت ماه بمرتبۂ کمال رسید. پیرے باین خوبی، جوانے باین محبوبی. پیرے باین[6] حالت، جوانے باین کیفیت، پیرے باین کمال، جوانے باین حال، پیرے باین عنایت، جوانے باین ارادت، پیرے باین نظر، جوانے باین اثر، دیدۂ روزگار کم دیده، وگوشِ جهانیان کم شنیده. روز و شب چون شکّر و شیر، یعنی صحبت بسیار درگیر. پیر رادمے نمیگذاشت. بجوانِ عزیز شهرت داشت. اتّفاقاً[7] زرِ توفیقی از جائے بدستِ پیر[8] آمد، جوان را گفت که برین متصرّف شو، وبسفرِ حجاز برو. بعد از نمازِ صبح، زیر پیچ، دستار وسجّادۂ محرابی عنایت کرد، و رخصتش[9] نمود.

حکایت[10] جانکاه

روزے درویشِ "عزیز مرده" برائے عیادتِ همشیرزادۂ برادرِ عزیز که محمّد باعث نام داشت، عالم[11] فاضل متصوّف کامل بود، به "عالم گنج[12]" که محلّه الیست مشهور از اکبرآباد، در آفتابِ گرم رفت. چون

---

[1] ن ۲: همین است.
[2] ن ۲: این است.
[3] ن ۲: واوَ ندارد.
[4] ن ۲: جوان ... چون دید سر. الخ.
[5] ن ۲: رخت.
[6] ن ۲: حالت تا حال ندارد.
[7] ن ۲: اتّفاق.
[8] ن ۲: برآمد.
[9] ن ۲: رخصت.
[10] ن ۲: ندارد.
[11] ن ۲: عارف، عالم فاضل.
[12] ن ۲: درعالم گنج.

شام بروز[1] سیاہی زدن آغاز کرد، ازان جا باندازِ خانہ رَوان شد. عشائین را در مسجدِ خود آمدہ، ادا نمود[2]. ہرگاہ بر فرشِ خواب رفت و من حاضر شدم گفت: "اے پسر، حرارتِ آفتاب در مزاجِ من تاثیرے کردہ است. صُداعے دارم، از آثار معلوم میشود کہ تَب خواہم کرد." غذائے شب نخورد[3]، و خوابید. صبح کہ برخاست تَبے بشدّت داشت. طبیبے ابوالفتح نام، معالجِ قدیمِ اُو بود، آمد، و تبرید کرد. تسکین نیافت. مبالغہ در[4] مُبَرِّدات فوق الحد نمود، سُودمند نیفتاد. تبِ درویش بندی شُد، یعنی ہر روز شام می آمد و تمام شب میماند. برائے تبْ بستن تدبیر ہائے بیشمار میکردند، امّا از ہیچ یکے این عقدۂ سخت کُشادہ نشد. پس از ماہے مُشخّص گردید کہ این تبْ تشنّج بقلب است. و اُستخوانی شدہ است. یعنی این درویشِ نحیف کہ مشتِ استخوانے بیش نیست، مُبتلاے رنجِ باریک است. بمن گفت کہ: "اے پسر، جانِ من صَرفِ نیاز است، و جسم[5] وقفِ گداز. رغبتے با غذایم نیست، اگر میخورم گرانی میکند. دوائیکہ صبح طبیب میدہد، تا صبحِ دیگر کفایت است. میخواہم کہ تا بمیرم ترکِ غذا بگیرم. پنج شش دستہ ہای نرگس از بازار بطلب، کہ بشرطِ حیات گاہ گاہ بُو کردہ آید."
بموجبِ ارشاد طلب داشتم، و پیشِ اُو برابر گذاشتم. ہرگاہ چشم میکشاد، دستہ[6] بدست گرفتہ بُو میکرد و میگفت: "الحمدللہ کہ سیر شدم." چون بترکِ غذا پرداخت، مابکیان را، از خود نا اُمید[7] ساخت. (طاقت[8] از دست و پا رفت، کارِ ناتوانی بالا رفت، سخن بسیار کم راندے، نماز باشارت خواندے. بیست و یکم رجب، حکیم بعادتِ قدیم، کاسۂ تبرید آورد. درویش اَبرو تُرش کرد و نخُورد، و آن کاسۂ دَوا را بر زمین زدہ گفت کہ: "اے مُردہ شو بُردہ، تاثیرِ دَوا از روزِ اوّل ظاہر بود، من پاسِ تو میکردم، کہ میخوردم، افسوس کہ نفہمیدی برو دست از من بدار. نا قباحت فہمی مرضیست کہ علاج ندارد."

---

1. ن ٢: بر روز.
2. ن ٢: نمودہ.
3. ن ٢: بخورد.
4. ن ٢: در ندارد.
5. ن ٢: جسم.
6. ن ٢: دست بدست.
7. ن ٢: نومید.
8. ن ٢: از "طاقت از دست و پا رفت ... تا سجادہ نشینان" عبارت بین القوسین در نسخۂ رامپور نمی باشد.

آنگاه حافظ محمد حسن برادرِ کلانِ مرا، که برادر اندر[1] بود، طلب نمود، و فرمود که "من فقیرم و هیچ ندارم۔ مگر سه صد جلدِ کتاب۔ رو بروے من بیارید و حصّهٔ برادرانه کرده بگیرید۔" اُو التماس کرد که "من طالبِ علم۔ کرمِ این کار مرا بیشتر است، و این برادران ربطے به کتاب ندارند، کناره های اوراق چیده خواهد شد۔ یکی کاغذِ باد خواهد ساخت، یکی در آب خواهد انداخت۔ اگر پیشِ من امانت گذارند، خوب است۔ وگرنه مختار اند، پدر از مزاجِ ناسازِ اُو خبر بود۔ شانه گیر شد و گفت: "چه شُد که ترکِ لباس کرده ای، لیکن کج پلاسیِ تو هنوز نرفته است۔ میخواهی که طفلانِ بیچاره را بازی دهی، و پس از مرگ (من) دل بخرابیِ ایشان نهی۔ دانسته باش که حق تعالیٰ غیور است، و غیور را دوست میدارد۔ غالب که میر محمد تقی دست نگرِ تو نشود۔ اگر بنوعِ دیگر پیش خواهی آمد، کاسه بر سرت خواهد شکست و نقشِ عزّتِ تو پیشِ این بابا نخواهد نشست۔ خواهی دید، اگر بمراد خواهی رسید، برائے یک جلدِ کتاب پوستِ تو خواهد کشید۔ کم کاسه شایستهٔ بی اعتیاری است۔ بُخل و حسد دلیلِ ذلّت و خواری است۔ خوب است، کتابها را ببَر، و نگاهدار۔"

پس آنگاه روے سخن بمن کرد، گفت که: "اے پسر۔ قرضدارِ سه صد روپیهٔ بدّالانِ بازارم۔ اُمید که تا ادا نکنی، مردهٔ مرا بر نداری، که من سکّهٔ دُرست مردے بودم، و در همه عمر دغا بازی نه نموده ام۔" عرض کردم که "غیر از جلدهای کتاب، دم و پوستے بنظر نمی آید۔ آنها را به برادرِ کلاں سپردید۔ ادائے قرض چسان توانم کرد؟" چشم پُر آب نمود و گفت: "خدا کریم است۔ دل تنگ نباید شد۔ کاغذِ زر در راه است۔ قریب میرسد۔ میخواستم که تا رسیدنِ زر زنده بمانم، امّا فرصتِ عمر کم است، ماندن نمیتوانم۔" در حقِ من دعا کرد، و حوالت با خدا کرد۔ ساعتے نفَس شمرد، آخر حساب سپرد۔

بے مُروّتیِ برادر درویش چون چشم پوشید، جهان در چشمِ من سیاه گردید حادثهٔ عظیمے

---

[1] ن ا: برادر بے مات۔

رؤ داد- آسمان بر من بیفتاد- دریا دریا گریستم، لنگر از کف دادم- سر را بر سنگ زدم، بر خاک اُفتادم. کل کل بسیار شد- قیامت پدیدار شد- برادرِ کلانِ من، ترکِ مردم داری گرفت، و بے چشم و روئی اختیار نمود- دید که پدر آستینِ کهنہ داشت و بہ بیکسی جامہ گذاشت، قرض خواہان دامنگیرِ من خواہند شد، پہلو تہی کرد و گفت: "کسانیکه ہمگیر ناز و نعم بودند، آنہا دانند و کارِ آنہا — من در حیاتِ پدر دخیلِ کارے نگشتم، از وقفِ اولادی ہم گذشتم- سجّادہ نشینان[1] او سلامت باشند- سر را می کُنند، وجہ را میخراشند، آنچہ مصلحتِ وقت خواہد بود، خواہند نمود-"

منکه تازہ بیکس شدہ بودم، چون سخنانِ بے تہِ او را شنودم غم و غصہ بسیارے خوردم التجا باُو نبُردم- کمر را مُحکم بستم- نظر بر خدا نشستم- بدّالانِ بازار دُو صد روپیه دیگر آوردند و سماجت از حد بُردند- پاسِ وصیّتِ درویش بُود[2]، قبول نکردم- ہمہ (را) بزبان داشتم یعنی مَلول نکردم-

درہمین حال، آدمِ سید مکمّل خان، کہ مریدِ عمّ بزرگوارِ من بود، با ہنڈوی پانصد روپیه تازہ سکّہ رسید، و دردِ شریکِ من گردید- سہ صد روپیه بہ قرضخواہان دادہ، فارغخطی گرفتم، و بصد روپیه درویش را برداشتہ بُردم، و در پہلوے پیرِ اُو بخاک در آوردم-

(حقیقتِ منِ دلریش بعدِ واقعۂ درویش[3])

بیمروتیہاے آسمان را دیدم- ستمہای روزگار کشیدم- نَی نَی[4]، گناہِ فلک و جُرمِ[5] زمانہ چیست- من ستارہ نداشتم، کہ سایۂ چنین آفتابی از سَرِ[6] من رفت- ہر چہ کرد، طالعِ من کرد- غیر از دستِ خود بر سَر[7] نیافتم، یعنی کسی را سایہ گُستر نیافتم- خانمان بَر سرِ غیرت[8] نہادم، زینہار بر درِ کس نہ ایستادم- لبم بحرفِ طلب

---

[1] ازعبارتِ گذشتہ "طاقت از دست و پا رفتہ"... تا این جا، از نسخۂ رامپور اُفتادہ است۔
[2] ن ۲: بود ندارد۔ [3] ن ۲: عنوان ندارد۔ [4] ن ۲: نی ندارد۔ [5] ن ۲: جرم ندارد۔
[6] مط: از سرِ حدِ من۔ [7] ن ۲: بر سرِ خود۔ [8] ن ۲: غربت۔

آشنا نگردید، چشمِ من به هیچ چیز ندوید. سایهٔ دستِ کسی نگرفتم، (و سر دستے بمن کسی نگرفت یعنی خداے کریم مرا شرمندهٔ احسانِ کسی نکرد)[1] و دستِ نگرِ بردار که سر بسر[2] من داشت، نساخت، نُقلِ ماتمِ درویش قسمت ساختم، کار را بلُطفِ خداوند[3] انداختم. دمِ خود را برادرِ خورد سپرده، بتلاشِ روزگار در اطرافِ شهر استخوان شکستم، لیکن طرفے نه بستم. یعنی چارهٔ کار در وطن نیافتم، ناچار بغربت شتافتم. رنجِ راه بر خود هموار[4] کردم، شدائد[5] سفر اختیار[6] کردم. بشاہجہان آباد دہلی رسیدم، بسیار گردیدم، شفیقے[7] ندیدم.

خواجہ محمد باسط که[8] برادر زادهٔ صمصام الدّوله امیر الامرا بود[9]، عنایتے بحالِ من کرد و پیشِ نوّاب بُرد. چون مرا دید، پرسید که "این پسر از کیست؟" گفت: "از میر محمد علی است." فرمود[10]: "از آمدنِ این پیداست[11] که ایشان از جہان رفته باشند." پس از افسوسِ بسیار سخن زد که "آن مردِ بر من حقّہا داشت. یک روپیه روز از سرکارِ من باین پسر میداده باشند." التماس نمودم[12]: "اگر نوّاب لطف میفرماید، دستخط کرده بدہد[13] که جاے سخنِ متصدّیان نماند." التماسے که نوشته بودم، از کیسه برآوردم. ناگاه از زبانِ خواجهٔ مذکور برآمد که: "وقتِ قلمدان نیست." چون این سخن[14] شنیدم، بقاه قاه خندیدم، نوّاب در رُوے من دید، و سببِ خنده پُرسید. عرض نمودم که: "این عبارت را نفہمیدم. اگر ایشان میگفتند قلمدان بردار حاضر نیست، این حرف گنجایش داشت، یا آنکه وقتِ دستخطِ نوّاب نیست، بابتی بود[15]. "وقتِ قلمدان نیست" انشاے[16] تازه است. قلمدان چوبے بلش نمیباشد وقت و غیرِ وقت نمیداند، بہر نفر یکه اِشارت رود، برداشته بیارد."

---

[1] ن ۲: عبارت بین القوسین ندارد. [2] ن ۲: سر بر سر من. [3] ن ۲: خدا.
[4] ن ۲: اختیار. [5] ن ۲: و شدائد. [6] ن ۲: ہموار. (کردم ندارد).
[7] ن ۲: آما شفیقے. [8] ن ۲: که ندارد. [9] ن ۲: بود ندارد.
[10] ن ۲: گفت. [11] ن ۲: معلوم می شود. [12] ن ۲: که. [13] ن ۲: دہد.
[14] ن ۲: این چنین سخن. [15] ن ۲: یا وقت دستخط نواب بابتی بود (کذا) [16] ن ۲: عبارت تازه.

نواب بخنده درآمد و گفت که "معقول میگوید۔" غرض تکلیفِ مرا برخاک نیفگنده، قلمدان طلبید[1]، و آن التماس بشرفِ دستخط رسید۔ روزِ دربارِ بادشاه بود، کمربسته بایستاد[2]، به عنایتِ تمامَم میان داد۔ تا عهدیکه نادرشاه بر محمّد شاه که حالا به "فردوس آرامگاه" مُلقّب است، مسلّط شد، و نوابِ مذکور بسببِ پیش جنگی کُشته اُفتاد، آن روزینه می یافتم۔ نان[3] و نمک میخوردم، و بَسر می بُردم۔

بعدِ این انقلاب باز[4] روزگارِ سنگین دل، کار را برمن تنگ گرفت۔ کسانیکه پیشِ درویش خاک پاے مرا کُحلِ بَصر میساختند، یکبار از نظرم انداختند۔ ناچار[5] بارِ دیگر بدہلی رسیدم، و منّت ہائے بی مُنتہاے خالوے برادرِ کلان که سراج الدین علی خانِ "آرزو" باشد کشیدم۔ یعنی چندے پیشِ اُو ماندم، و کتابے چند از یارانِ شهر خواندم۔ چون قابلِ این شدم که مخاطَبِ صحیح کسے میتوانم شد، نوشتۂ اِخوان پناه رسید که "میر محمّد تقی فتنۂ روزگار است زینهار به تربیتِ اُو نباید پرداخت و در پردۂ دوستی کارش باید ساخت۔" آن عزیز دنیادارِ واقعی بود، نظر برخصومتِ ہمشیرزادۂ خود، بدِ من اندیشید[6]۔ اگر دوچار میشدم چار چار[7] میزد، وگر اعراض[8] میکردم، نَوا خوانی می نمود[9]۔ ہر روز چشمش بدنبالِ من می بُود۔ اکثر سلوکِ مدّعیانه میکرد[10]۔ چه بیان کنم که ازو چه دیدم، چه گویم[11] که چه حالت کشیدم۔ ہر چند نَیبه دهانی اختیار میکردم، اُو از حلاّجی دست[12] نمیداشت۔ باصد ہزار احتیاج یک روپیه ازو[13] نمیخواستم، امّا سلاّخی نمیگذاشت۔ خصمیِ اُو را اگر بتفصیل بیان کرده آید، دفترے جداگانه می باید۔ خاطرِ گرفتۂ من گرفته تر شد، سَودا کردم۔ درحجرۂ که می بُودم درش می بستم، و باین کثرتِ غم تنہا می نشستم۔ چون ماه بَر می آمد[14]، قیامت بر سَر می آمد[15]۔ ہر چند ازان ہنگام، که

[1] ن ۲: قلمدان طلبید - ندارد۔ [2] ن ۲: بایستاد۔ [3] ن ۲: نان ندارد۔
[4] ن ۲: باز ندارد۔ [5] ن ۲: ناچار باز بدہلی۔ [6] ن ۲: بدامن کشید۔
[7] ن ۲: خارخار۔ [8] ن ۲: اعتراض۔ [9] ن ۲: می کرد۔ [10] ن ۲: می نمود۔
[11] ن ۲: چگونه۔ [12] ن ۲: برنمی داشت۔ [13] ن ۲: ازو ندارد۔ [14]، [15] ن ۲: آید۔

دایه اَم دمِ زردُشستن "ماه ماه" میگفت و من بسُوے آسمان میدیدم، نظرے به ماه میداشتم، لیکن نه باین مرتبه که کارم بدیوانگی کشد، و وحشت بجائے رَسد که در حجرهٔ من باندیشه باز کنند و از صحبتم احتراز نمایند۔

نقلِ تحفه[1] در شبِ ماه، پیکرے خوش صورت، با کمالِ خُوبی، از جرمِ قمر اندازِ طرفِ من میکرد و مُوجبِ بیخودی میشد۔ بهر طرف که چشمم[2] می اُفتاد، بران رشکِ پَری[3] می اُفتاد۔ بهر جا که نگاه میکردم، تماشاے آن غیرتِ حور میکردم۔ در و بام و صحنِ خانهٔ من ورقِ تصویر شده بود، یعنی آن حیرت افزا[4] از شش جهت رُو مینمود۔ گاهے چون ماهِ چهار دهٔ[5] مُقابل۔ گاهے سیرگاهِ اُو منزلِ دل۔ اگر نظر بر گلِ مهتاب می اُفتاد، آتشے در جانِ بیتاب می اُفتاد[6]۔ هر شب بااُو صحبت، هر صبح بے اُو وحشت۔ دمیکه سفیدهٔ صبح میدمید، از دلِ گرم آهِ سرد میکشید، یعنی آه میکرد، و اندازِ ماه میکرد۔ تمام روز جنون میکردم، دل در یادِ اُو خون میکردم[7]۔ کف برلب[8]، چون دیوانه و مست۔ پاره هائے سنگ در دستِ من اُفتان و خیزان، مردم از من گریزان۔ تا چار ماه آن گلِ شب افروز، رنگِ تازه میریخت، و از فتنهٔ خرامِها[9] قیامت می انگیخت۔ تا گاه موسمِ گُل رسید۔ داغِ سَودا سیاه[10] گردید۔ یعنی چون پَریدار شدم۔ مطلق[11] از کار شدم۔ صورتِ آن شکلِ وهمی در نظر۔ خیالِ زلفِ مشکینش در سر۔ شایستهٔ کناره گیری شدم۔ زندانی و زنجیری شدم۔

همشیرِ[12] فخر الدین خان که مریدِ درویش بود، قرابتِ[13] قریبه داشت۔ زرے بسیارے خرچ نمود۔ پریخوانان اَفسون دمیدند۔ طبیبان خون کشیدند۔ تدبیرِ اطّبا سُود مند اُفتاد۔ پائیز آمد، و بهار ریخت، سلسلهٔ جنون از هم گسیخت۔ نقشیکه وهم بسته بود، از

---

[1] ن ۲: ندارد۔ [2] ن ۲: چشم۔ [3] ن ۲: ندارد۔ [4] ن ۲: آثار حیرت افزای
[5] ن ۲: چهار دهم۔ [6] ن ۲: اگر نظر بیتاب می افتاد آتشے در جان می افتاد۔ هر شب الخ۔
[7] ن ۲: دل در یاد اوخون میکردم۔ ندارد۔ [8] ن ۲: بلب۔ [9] ن ۲: خرابیها۔
[10] ن ۲: سیاه تر۔ [11] ن ۲: و مطلق۔ [12] ن ۲: همشیره۔ [13] ن ۲: و قرابت۔

صفوۂ خاطر محو شد ذرسیکہ از جنون خواندہ بودم، فراموش گشت۔ لب باسکوت مالوف شد، پریشان گوئی موقوف شد[1]۔ ترطیبِ دماغ کردند، خواب افزود۔ طاقتِ رفتہ باز رُو نمود۔ یعنی بحال آمدم، و بدخوابی رفت۔ از پیشِ نظر آن چہرۂ مہتابی[2] رفت۔ پس از چندے رُو بصحتِ کامل آوردم، و شروع بخواندنِ ترسّل کردم۔

میر جعفر عظیم آبادی

(نقل[3]) روزے بر سرِ بازار، جزءِ کتابے در دست، نشستہ بودم۔ جوانے میر جعفر نام، ازان راہ گذشت، نظرش بر من اُفتاد، وتشریف داد[4]۔ بعد از ساعتے گفت کہ "اے عزیز دریافتہ میشود کہ ذوقِ خواندن داری۔ من ہم کشتۂ کتابم، امّا مخاطبے[5] نمی یابم۔ اگر شوقِ[6] کاملے داشتہ باشی چندے میرسیدہ[7] باشم۔" گفتم: "دستے ندارم کہ خدمتے از من بیاید اگر[8] این رنج برخود گوارا کنی، عینِ بندہ نوازی است۔" گفتا: "اینقدر ہست کہ تہِ پا[9] تا نباشد پا بیرون نمیگذارم۔" گفتم: "خدائے کریم آسان خواہد کرد، اگرچہ من ہم چیزے ندارم۔" پا دَر قہاے آن نسخۂ درہم را مطابقِ سرِ صفحہ ہای آیندہ کردہ داد و رفت۔ از آنروز اکثر ملاقاتِ آن مَلک سیرت و آدم صورت، اتّفاق می افتاد، وبلطفِ نہایتم زبان میداد۔ یعنی دماغِ خود می سوخت و مرا چیزے می آموخت۔ تا مقدورِ من[10] نیز بالشِ نرم زیرِ سرِ اُو میگذاشتم یعنی صرفِ اُو بود آنچہ میسّر داشتم۔ ناگاہ خطّے از وطنِ اُو، کہ عظیم آباد بود، رسید، و[11] آن مرد رختِ خود، کام و ناکام، بآن صوب کشید۔

سَعادت امروہوی

بعد از چندے[12]، با سعادت علی نام سیّدے، کہ از امروہہ بُود برخوردم۔ آن عزیز، مرا تکلیفِ موزون کردنِ ریختہ

---

[1] ن ۲: شد ندارد۔ [2] ن ۲: آفتابی۔ [3] ن ۲: ندارد۔
[4] ن ۲: آورد۔ [5] ن ۲: مخاطب۔ [6] مط: شوق داشتہ۔
[7] ن ۲: پرسیدہ۔ [8] ن ۲: البتہ۔ [9] ن ۲: اگر تہِ پا نباشد۔
[10] ن ۲: من ندارد۔ [11] ن ۲: واوَ ندارد۔ [12] ن ۲: چندگاہ۔

— کہ شعر لیست بطورِ شعرِ فارسی بزبانِ اُردوے معلاے[1] بادشاہِ ہندستان و دران وقت
رواج داشت — کرد۔ خود کُشی کردم و مشقِ خود بمرتبہٗ رساندم[2] کہ موزونانِ شہر را مستند[3]
شدم۔ شعرِ من در تمام شہر دَوید و بگوشِ خورد و بزرگ رسید۔

یکروز، خالوے کذائیؔ بر طعامم طلبید۔ تلخے ازو شنیدم، بیمزہ شدم۔ دست[4] در
طعام ناکردہ برخاستم۔ چون پاے چراغے نداشتم، شام از خانۂ او بَرآمدہ راہِ مسجدِ جامع
پیش گرفتم۔ اِتّفاقاً راہ غلط شد۔ بَر حوض قاضی کہ آبگیر خوردے نزدیک بحویلی وزیر الممالک
اعتماد الدولہ واقع است رسیدم، و آب کشیدم۔ آنجا علیم اللہ[5] نام شخصے پیش آمد و گفت
کہ "شما میر محمد تقی میرؔ نباشید[6]؟" گفتم: "از چہ شناختی؟" گفتا: "طَورِ سودائیانۂ شما
مشہور است۔ رعایت خان کہ پسرِ عظیم اللہ خان، نبیرۂ اعتماد الدولہ قمر الدین خان، باشد
از روزیکہ زادۂ طبعِ نکتہ انگیز باُو رسیدہ است، اشتیاقِ ملاقات بیش از بیش دارد۔ اگر
بدستِ من اُورا دیدہ شود سببِ مجرائیِ من گردَد۔" رفتم و[7] دیدم۔ آدمیانہ برخورد و
باخود رفیقم کرد۔ تمتّعے اَزو بستم، و از قیدِ تنگدستی رَستم۔

ہنگامیکہ شاہِ درّانی بہ لاہور آمد و شاہنواز خان، پسرِ زکریا خان، کہ صوبیدارِ آنجا
بود، گریخت، وزیر و صفدر جنگ و ایشر سنگھ، پسرِ راجا جے سنگھ، کہ زمیندارِ کلانے بود،
بادشاہزادۂ احمد شاہ را باخود[8] گرفتہ بجنگِ اُو برآمدند۔ آنطرفِ سرہند بوزیر گولہ رسید،
و زمیندارِ مذکور پس خم زد، صفدر جنگ و مُعین الملک کہ پسرِ وزیرِ شہید باشد، احمد
شاہ را سوار کردہ، جنگِ افغانان[9] زدند۔ من درین سفر با خانِ مسطور بودم[10]، و خدمتہای
نمودم۔ ہرگاہ شکستِ فاحشے بر لشکرِ افغانان[11] اُفتاد، و گریخت، معینُ الملک ناظمِ

---

[1] ن ٢: معلّی بادشاہان۔
[2] ن ٢: رسانیدم۔
[3] ن ٢: مستفید۔
[4] ن ٢: و دست۔
[5] ن ٢: علیم الانام۔
[6] ن ٢: نباشند۔
[7] ن ٢: واوٗ ندارد۔
[8] ن ٢: باخود ندارد۔
[9] ن ٢: افغان۔
[10] مط: منظور۔
[11] ن ٢: افغان۔

لاهور شد- خانِ مذکور چون عفوِ از جا رفته، ترکِ رفاقتِ اُو گرفته، با صفدر جنگ روانۂ شهر شد-

قریبِ پانی پت، که شهریست مشهور، چهل کروهی شاهجهان آباد، خبر رسید که محمّد شاه بآن جهان خرامید- عالمے لکدِ روزگار خورد- صفدر جنگ لکد برابر زده، چتر و تختِ پیشِ احمد شاه آورد- نوبتِ سلطنت باُو رسید- باکرّوفرِ تمام داخلِ شهر شد- اینجا جاوید خان، که خواجه سرائے بادشاهِ مرحوم بود، بخطابِ "نوّاب بهادر" مخاطب گشت- و اختیارِ سلطنت بدستِ اُو اُفتاد-

هر روز اختیارِ جهان پیشِ دیگریست
دولت مگر گداست، که هر روز بر دریست

وقتیکه نظامُ الملک آصف جاه در دکن فوت گشت[۱]، منصبِ وزارت به صفدر جنگ رسید، و سادات خان ذوالفقار جنگ به بخشی گری سرفراز گردید[۲]- امارتِ وزیرِ حال بجائے رسید که یال و کوپالِ اورا شاه هم نداشت- بخشیِ حال، راجا بخت سنگه را، که زمیندارِ کلان کارِ نام گرفته بود، و برادرِ کلانش، ابهے سنگه[۳]، ریاستِ جودهپور داشت، نیابتِ صوبۂ اجمیر داده، بر روے اُو دوانید- راجۂ مذکور خان را سردارِ فوج نموده، با خود بُرد- در ظاهرِ سانبهر[۴] که قصبه ایست معروف، بیست کروه این طرفِ اجمیر، هر دو لشکر طرف شدند، و جنگِ توپخانه بمیان آمد- مردمانِ طرفِ ثانی پاسِ نمک نکرده[۵]، چون غیرت بحرامان، یک روز هم تن نداد ند، تا بجان دادن[۶] چه رسد! ناچار[۷] رئیسِ آنطرف تلهار را، که در سردارانِ دکن نام برآورده مردے[۸] بود، درمیان داده سر بسر کرد و رفت[۹]- من پس از صلح، برائے حصولِ سعادتِ زیارتِ درگاهِ فلک اشتباهِ خواجۂ بزرگ رفتم،

---

[۱] ن ۲: کرد- [۲] ن ۲: گشت. [۳] ن ۲: راجه ن ۱: ابهے سنگه-
[۴] ن ۲: سانبهر- مط: سامر- [۵] ن ۲: کرده [۶] ن ۲: داده-
[۷] ن ۲: ناچار ندارد- [۸] ن ۲: مردی- [۹] یعنی صلح کرد و رفت-

دسیرِ آن نواحی کرده برگشتم۔

اینجا در اَمرے زبانبازی بمیان آمد۔ راجا بخت سنگھ ابرو تُرش کرد۔ صحبتِ خان[1] و اُو قُروتی شد۔ ستار قلی خان کشمیری که صورتبازے بیش نبود، بروصد دہن خواند[2]۔ کار بنزاع کشید۔ خان صرفهٔ خود ندیده مرا فرستاد و عذرِ ده زبانی[3] خواست۔ رفتم، و از جانبِ او مصحف خوردم[4] که آینده چنین نخواہد شد۔ اما دلش آبے نخورد[5] و صرفه نداد[6]۔ زرِ تنخواہِ مردمانِ رساله ہمگی فرستاد، و خیر باد کرد۔ بارے بخیر گذشت۔ خان ازانجا واسوخته[7] بشہر آمد و چندے درخانه[8] نشست۔

نقل[9] شبِ ماه برمہتابی پسرِ خوانندهٔ[10] رو بروے خان نشسته بود و میخواند۔ چون مرا دید گفت که[11] "میر صاحب، دو سه شعرِ ریختهٔ خود باین بیاموزید که این طفل در لبتهٔ نگار درست کرده بخواند۔" گفتم که "من نقشِ این کار ندارم۔" گفت: "شما را بسرِ من!" چون[12] پاے تبعیّت درمیان بود، ناچار حکمِ او کشیدم۔ پنج[13] شعرِ ریخته به او آموختم۔ امّا بسیار بر طبعِ نازکِ من گران آمد۔ آخر بعد از دو سه روز، خانه نشین گشتم۔ ہر چند لطف فرمود، نرفتم۔ و ترکِ آن روزگار گرفتم۔ مُروّتِ ذاتیِ آن مرد نگذاشت که فقیر را ناکام گُذارد۔ برادرم میر محمّد رضی را، نظر برفاقتِ من، اسپ از خانهٔ خود داد و نوکر کرد۔ چون پس از مُدّتِ مَدید رفته ملاقات نمودم عذرِ بسیاری نمود۔ گفتم: "گذشته را صلواة۔"

ہرگاه چندے برین گذشت تلاشِ روزگار بخانهٔ نوّاب بہادر کردم، و نوکر شدم۔ اسدیار خان بخشیِ فوجِ اُو، احوالِ مرا نقل کرده، اسپ و تکلیفِ نوکری معاف کنانید،

---

[1] ن ۲: خان ندارد۔ ن ۱: "خان و اُو" ندارد۔ (قروتی شد۔ یعنی صحبت بے مزه شد۔)

[2] یعنی صد قسم سخن۔ [3] ہرزه گوئی۔ [4] یعنی قسم خوردم۔

[5] یعنی اعتبار نکرد۔ [6] یعنی فرصت نداد۔ [7] ن ۲: دل سوخته۔

[8] ن ۲: بخانه۔ [9] ن ۲: نقل ندارد۔ [10] ن ۲: خوانده۔

[11] ن ۲: که ندارد۔ [12] ن ۲: چو۔ [13] ن ۲: و چہار پنج۔

پاسِ من از حدّ بیشتر میکرد، پهلو میداد. خدا[1]یش خیر دهاد.

ایا[2]میکه قائم خان پسرِ محمد[3] خان بنگش بجنگِ روهیله با کُشته شد، وصفدر جنگ برائے ضبط کردنِ خانهٔ[4] او رفت، من بتقریبے[5]، با اسحٰق خان نجم الدوله، جهتِ[6] سیرِ آنطرف رفتم. چون با احمد خان برادرِ خوردِ قائم خان، جنگِ عظیم رُو داد، فوجِ وزیر شکست خورد، و اسحاق خان کُشته اُفتاد. بآن لشکرِ شکست خورده، باز بشهر رسیدم[7]، و تصدیعِ بیحد کشیدم. وزیر بارِ دیگر لشکر کشید، و افغانان را مغلوب ساخته، بتسلّطِ تمام در حضور آمد.

درحینیکه، ذوالفقار جنگ میر بخشی بسببِ خصومتِ نوّاب بهادر از پایهٔ خود اُفتاد، و[8] نوبتِ امیرالامرائی به غازی الدین خان فیروز جنگ، پسرِ آصفجاه رسید، او[9] برائے نظم و نسقِ صوبهٔ دکن رفت، و در راه هیضه کرده درگذشت. خلعتِ بخشیگری عماد الملک پسرش پوشید. بنده ترکِ ملاقاتِ عزیزان[10] گرفته، بخواندنِ مطوّل مشغول شدم.

موسمیکه، صفدر جنگ، نوّاب بهادر را بدغا کُشت، روزگارِ عالمے برهم خورد. من نیز بیکار شدم. مهانراین دیوانِ وزیر، بدستِ داروغهٔ دیوان[11] خانهٔ خود، میر نجم الدین علی (سلام) تخلّص، که پسرِ میر شرف الدین علی "پیام" بود، چیزے فرستاد، و باشتیاقِ بسیار[12] مرا طلبید. دست در دامنِ پهلودارِ او زدم، (و چند ماه بفراغت گذرانیدم.

هنوز خونِ خواجه سرائے مظلوم نخوابیده بود[13]) که روزگار سرپاے زده، فتنهٔ عجیبے[14] را از خواب بیدار[15] ساخت، و طرحِ هنگامهٔ عظیمے انداخت. یعنی وزیر را توهّمے پیدا شد، سر از

---

[1] ن ۲: خداش.
[2] ن ۲: در ایامے که.
[3] ن ۲: احمد خان.
[4] ن ۲: خانه ندارد.
[5] ن ۲: بتقریبے رخصت گرفته با اسحٰق خان.
[6] ن ۲: برائے.
[7] ن ۲: آمدم.
[8] ن ۲: واو ندارد.
[9] ن ۲: و، او.
[10] ن ۲: عزیزانِ شهر.
[11] ن ۲: توپخانه.
[12] ن ۲: بیش از بیش.
[13] ن ۲: "و چند ماه تا نخوابیده بود" ندارد.
[14] ن ۲: عجیبے.
[15] ن ۲: بیدار از خواب.

فرمانِ بادشاه پیچید- هر چند بدرِ صلح زدند، امّا سر از غرورِ ثروت فرود نیاورد، ناچار بادشاه از پئے او رسن تابید[1]- آخر از شهر برآمده، آمادهٔ جنگِ خداوندِ نعمت شد- اینجا عماد الملک نبیرهٔ آصفجاه، که منصبِ بخشیگری داشت، و انتظام الدوله خالوے او، پسرِ اعتماد الدوله شهید، و دیگر سردارانِ فوجِ بادشاهی بحفاظتِ شهر پرداختند- شهرِ کهنه تمام بغارت رفت. تا[2] شش ماه جنگ درمیان بود- اگرچه بالقوهٔ خصمانهٔ او نداشتند، لیکن کسانِ فوجِ شاه آنچنان پا فشردند، که کار را پیش بردند- پاے ثباتِ وزیرِ سرکش، از پیش بدر رفت- ناچار پیغامِ صلح فرستاد- بادشاه هزیمتِ او را غنیمت دانسته، دستوریِ صوبهٔ اش داد وزیر انتظام الدوله شد-

درین ایام، من از نا[3]مساعدتِ ایام، همسایگیِ خالو گذاشته، نظر برین که مرا چشم کم خواهد دید، در حویلیِ امیرخانِ مرحوم — که امیرِ کلانِ عهدِ محمد شاهی بود، و صوبه داریِ الهٰ آباد، و رگِ خوابِ سلطنت در دست داشت، و انجامِ تخلّصِ اوست — بخوش سلیقگی وطلاقتِ[4] لسان زبان زدِ مردم است، و موجبِ مُهمِ علی محمد روهیله شده، بادشاه را برآورده، او را بگیر آورده بود[5]- انجامِ کار از دستِ[6] یکی از نوکرانِ خود، بر دروازهٔ دیوانِ خاص کشته شد[7]— سکونت اختیار کردم، و بلطائف الحِیَل بسر بردم-

عماد الملک در اندک مدّت زور بهم رسانیده، سردارانِ دکن را از خود ساخته، بجرمِ رفاقتِ صفدر جنگ، بر[8] سورج مل، که[9] زمیندارِ زورآور[10] بود، لشکر کشید، و از سرِ تبوی قلعهٔ او محاصره کرده، کار را تنگ گرفت- پسرِ ملهار درهمان[11] جنگ کشته افتاد- زمیندارِ مذکور نوشت و خواندے با وزیر داشت- این معنی سببِ نفاقِ[12] طرفین شد-

---

[1] ن ۲: آتش- [2] ن ۲: تا ندارد- [3] ن ۲: نا ندارد-
[4] ن ۲: لطافت- [5] ن ۲: او را بگیر آورده بود ندارد- [6] ن ۲: بدست-
[7] ن ۲: گردید- [8] ن ۲: که بر- [9] ن ۲: که ندارد-
[10] ن ۲: زمیندار داری (کذا) [11] ن ۲: درهمان روز درجنگ- [12] ن ۲: اتّفاق-

بادشاه برآمده، بست[1] کروه آنطرفِ آبِ جمن، قریبِ سکندرآباد خیمه کرد۔ روزے شام خبر رسید که سردارانِ دکن و عمادالملک با سورج مل طرحِ آشتی انداخته، بارادهٔ غارتِ دائرهٔ لشکرِ بادشاه حاضر یراقِ جنگ گردیده، دویده[2] اند، قریب است که برسند۔ بادشاه ـــ بمصلحت، صمصام الدوله میر آتش، و حرام کوزهٔ چند، که بکار پردازانِ بخشیگری ساخته بودند، ناموس را هم گذاشته، مضطرب و سراسیمه گریخت۔ آنجا نزدیک بصبح، فوجِ دکن رسید، و لشکر را همگی بغارت بُرده، متعاقب آمدند، و آنروے آبِ جمن[3] خیمه ها زدند۔ نسق شد که از مردمانِ بادشاهی کسے در[4] قلعه نماند۔ اگرچه آن حرام[5] توشه ها پیشتر ازین برخاسته رفته بُودند۔ بعد از بند و بست عماد الملک آمد، و قلمدانِ وزارت گرفت۔ وزیرِ مغز خر[6] خورده، از غردلی[7] بکُنجے خزید، و بادشاهِ خردگم کرده، متوجهِ باغ گردید۔ بعد از ساعتے یارانِ غدار بغدر دستگیر نمودند، و میل در چشمش کشیدند۔ نبیرهٔ بهادر شاه را بر تخت نشاندند، و عالمگیر ثانیش خواندند۔ مردمانِ بے ته در عرصه در آمدند[8]۔ هرچه شد بیجا شد۔ صمصام الدوله که از عقل بهرهٔ نداشت، امیر الامرا شد۔ من درین سفرِ وحشت اثر[9] با احمد شاه بودم[10]، آمده عزلت اختیار نمودم۔

درین[11] حال خبر رسید که صفدر جنگ بساطِ حیات در پیچید۔ و ریاستِ صوبه به ـــ شجاع الدوله پسرِ اُو قرار یافت[12]۔ خالوے من بادیه پیمائے طمع[13] شد، یعنی در لشکرِ شجاع الدوله باین توقع رفت که برادرانِ اسحٰق خان شهید آنجا هستند، نظر بر حقوقِ سابق، رعایتے خواهند کرد۔ جُز بادِ بدستش نیامد۔ لگدِ زمانه خورد، و همانجا مُرد۔ مردهٔ اُورا آوردند، و در حویلی اش بخاک سپردند۔

---

[1] ن ۲: وبست۔ [2] ن ۲: دویده اند ندارد۔ [3] مط: جمن ندارد۔ اضافه از ن ۲۔
[4] ن ۲: ورقلعه کسے۔ [5] ن ۲: حرام زاده توشه ها۔ [6] ن ۲: ضربت خورده۔
[7] ن ۲: از غردلی ندارد۔ [8] ن ۲: درندارد۔ [9] ن ۲: اثر ندارد۔ [10] ن ۲: همراه احمد شاه۔
[11] ن ۲: ودرین حال خبر رسید که۔ [12] ن ۱: رسید۔ [13] ن ۲: طرح۔

بعد از دو سہ ماہ، راجا جگل کشور، کہ در وقتِ محمّد شاہ وکیلِ بنگالہ بود، و بہ ثروتِ تمام میگذرانید، مرا از خانہ برداشتہ بُرد و تکلیفِ اصلاحِ شعرِ خود کرد۔ قابلیّتِ اصلاح ندیدم، بر اکثرِ تصنیفاتِ اُو خط کشیدم۔

درین ہنگام، راجا ناگرمل کہ در سلطنتِ فردوس آرامگاہ بدیلوانیِ خالصہ وتن[1] ممتاز بُود، بہ نیابتِ وزارت و خطابِ مہاراجگی و عمدۃ الملکی، سرفراز شد۔ چون مظلومانِ شہر را در خانۂ خود جا میداد، و بدادِ ایشان میرسید، کارِ آن سرکردہ بدشمنی کشید۔ اگر بہ دربار می رفت، خودش با حزمِ تمام، و کمالِ طمطراق۔ و فوجِ اُو ہمہ حاضر یراق۔ فریبِ یارانِ بد پرداز[2] نمی خورد، بہ بالا چاقی بسر می بُرد۔

درین ولا، صمصام الدّولہ، کہ عبارت از میر بخشیِ حال باشد، بمرضِ سل درگذشت۔ پسرش کہ بے حقیقتِ محض است، بجاے او مقرّر شد۔

درین اثنا، شاہ دُرّانی، کہ ہزیمت خوردہ از سرہند رفتہ بود، و در سر خیالِ ہندستان داشت، با لشکر[3] گران بہ لاہور آمد۔ وضیع و شریفِ آنجا، چہ ستمہا کہ نکشیدند و[4] چہ جفاہا کہ ندیدند۔ چون مانعے نبود، ازانجا قصدِ شہر نمود۔ یعنی معین الملک پیشتر مغلوب[5] شدہ، بعد از چندے از اسپ اُفتاد و رُو بوادیِ عدم نہاد۔ و[6] از آمد آمدِ اُو رنگ از کلّۂ یاران پرید۔ از بادشاہ و وزیر ہیچ نشد۔ آخر برسمِ پذیرۂ اُو[7] رفتہ، قید شدند۔ راجا ناگرمل با بعضے رؤسا مثلِ سعد الدین خان خانِ سامان وغیرہ، برائے حفظِ خود بقلعہ جاتِ سُورج مل رفت۔ قریب یک ماہ بر شہر سختیِ مُصادرہ ماند۔ آنگاہ شاہ بعالمگیر سلطنت بخشیدہ، وزیر را با خود گرفت و اندازِ اکبر آباد کرد۔ فوجِ اُو دستِ[8] غارت کُشاد۔ متھرا کہ تیرتھ گاہِ ہنود است ... کردہ اینطرف شہرے بُود با کمالِ رونق و آبادی، قتلِ عام شد۔ چون ہوا متعفّن گردید، شاہ از

---

[1] ن ۲: وتن ندارد۔
[2] ن ۲: واوٴ ندارد۔
[3] ن ۲: او ندارد۔
[4] ن ۱: بے تہ۔
[5] ن ۲: مغلوب اُو۔
[6] ن ۲: دو دوست۔
[7] ن ۲: لشکر۔
[8] ن ۲: واوٴ ندارد۔

خوفِ طاعُون معاملتِ سورج مل[1] ملتوی گذاشته، دفعةً کوچید، و دخترِ محمّد شاه را به حبالهٔ نکاح درآورده، بالا بالا رفت. عماد الملک در نواحِ اکبرآباد ماند. نجیب الدّوله[2] که در جنگِ صفدر جنگ نوکرِ وزیر شده بود، ترقّیِ نمایان کرده میربخشی گردید و مختارِ سلطنت شُد.

اینجا، راجا ناگرمل، با سردار[3]ِ دکن برخورده[4]، وزیر و احمد خان و آنهارا بر نجیبُ الدّوله بُرد. اُو شهر بند گشت. جنگِ توپخانه بمیان آمد. بعضے از سرداران که برائے خویش بودند، باندک غلبه اندازِ خرابیِ شهر میکردند. راجهٔ مذکور که مدّعالش جز نیکنامیِ وزیر هیچ نبود، برائے ممانعت برکار سوار شده، آنهارا باز میداشت، و میگفت که "بر شهر زدنِ شما بر قالب زدن است. فوجِ دکن ناموسِ عالمے برباد خواهد داد. شما بره بندِ این کار نه اید، نشود که شهر بغارت رَود، و بدنامی عائد شود. اَصلح آنست که روهیله هارا بصُلح برآریم و شهر را سلامت نگهداریم". پایانِ کار با نجیب الدّوله سر[5]بسر کرد، و از شهر برآورد[6]. اُو به سهارن پور که در فوجداریِ خود داشت، رفت. وزیر و اَعزّهٔ دیگر داخلِ شهر شده فوجِ دکن را رخصت نمودند. دار[7]وغگی توپخانه به پسر[8]ِ راجا تقرّر یافت. میربخشی احمد خان شُد[9].

یکے پیشِ راجا جگل کشور شکایتِ روزگار کردم. آن عزیز از خجلت سرخ و زرد شده گفت که "من شالِ کُهنه دارم، اگر دستے میداشتم، چشم نمی پوشیدم." روزے سوار شده بخانهٔ ناگرمل رفت و تقریبِ من کرده، طلب داشت. رفتم و بدستِ اُو ملاقات نمودم، لطفِ بسیارے کرد و گفت: "ضیافتِ شیراز حاضر است." یعنی حصّهٔ شما هم خواهد رسید، بارے تسلّی شدم و برخاستم[10]. روزِ دیگر که صحبتِ شعرا اتّفاق شد گفت که "هر بیتِ میرِ ما نا بعِقدِ گُهر است. طرزِ این جوان مرا بسیار خوش می آید." بهمین و تیره چندے رفتم،

---

[1] ن ۲: را ملتوی۔
[2] ن ۲: نجیب خان روهیله۔
[3] ن ۲: سرداران۔
[4] ن ۲: برخورد۔
[5] ن ۲: کرده۔
[6] ن ۲: برآورده۔
[7] ن ۲: داروغگی۔
[8] ن ۱ و ن ۲: برائے بهادر سنگه پسرِ کلانِ راجا۔
[9] ن ۱ و ن ۲: میربخشی گری با احمد خان بنگش شد۔
[10] مط: برخواستم۔

امّا چیزے بدست نیامد۔ چون کارد باستخوان رسیده بود، اضطراب بسیارے لاحق شد۔ یکے بعد از نمازِ صبح بَر درِ ایشان رفتم[1]۔ جے سنگھ نام میردہِ چوبداران پیش آمد، وگفت[2] کہ "این کدام وقتِ دربار است؟" گفتم کہ "حالتِ اضطرار است[3]۔" گفتا: "شُما را مردمانِ درویش میگویند، مگر گوش زد نشده است کہ: لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ إِلَّا بِاِذْنِ اللّٰه اینجا از علوے مرتبت پَروائے کسے نیست۔ صابر و شاکر باید بود، همہ چیز درگرو وقت است۔ این راه اندکے دوُر است۔ دیدنِ پسرِ کلان[4] ایشان ضَرور است۔" ترآمدم وبرآمدم شبے بگفتۂ اوُ پیشِ پسرِ ایشان رفتم[5]۔ دربانے ممانعت کرد وگفت: "دیدنِ ایشان اینوقت اِمکان ندارد۔" ناچار برگشتہ آمدم۔ دیگر بعد[6] از نمازِ عشا باز رفتم۔ دیدم کہ در بے دربان است۔ پُرسیدم کہ دربان کجا رفت؟ گفتند: "اَمروز[7] دردِ سرش بحدّے گرفتہ بُود کہ نمیتوانست نشست۔" دانستم کہ ارادۂ حق تعالیٰ متعلّق است۔ بدیوان خانہ در آمده دریافتم وصحبتِ شعر داشتم۔ خواجہ غالب[8] کہ جوانِ زورمندے بود، و[9] بامن تعارف[10] داشت، احوالِ مرا مفصّل گفتہ چیزے مقرّر کُنانید۔ تا یک سال می یافتم۔ شبے بخدمتِ راجا حاضر شدم، ایشان زرِ یک سالہ مرا تنخواہ نموده، گفتند: "اکثر مرا می دیده باشید[11]" ازان روز بعد نمازِ عشا، بطریقِ ملازمان درخانہ باغِ ایشان میرفتم وتا دوپہرِ شب میماندم۔ گُلِ این خدمت آن بود کہ بشگفتگیِ خاطر اَوقات میگذرانیدم۔

اکنون خامۂ زبان دراز طرحِ سخن بطورِ دیگری اندازد۔

سَانحہ[12] | سردارانِ دکن ملک را از (آنِ) خود[13] میدانستند وخیالِ جنگِ شاه در سر

---

[1] امّا چیزے تا ایشان رفتم در نسخہ ۲ ندارد۔ [2] ن ۲: وپرسید۔ [3] ن ۱: از تنگدستی بجان آمده ام۔
[4] ن ۱ و ن ۲: دیدنِ صاحبزاده ضرور۔ [5] ن ۱ و ن ۲: بر درِ رائے بہادر سنگھ رفتم۔
[6] ن ۲: شب دیگر۔ [7] ن ۲: کہ امروز۔ [8] ن ۱: خواجہ جالب۔ [9] ن ۲: واوٗ ندارد۔
[10] ن ۲: کہ ترا۔ [11] ن ۲: باشند۔ [12] ن ۲: ندارد۔
[13] این جا "از آنِ خود" می باید امّا در نسخہ ۲ همین است۔ تصحیح قیاسی۔

میداشتند- تیمور شاه پسرِ شاهِ دُرّانی و جهان خان سردارِ فوج را با مردمِ قلیل شنیده، و از دنبالهٔ آن پروا نکرده، یلغر به لاهور رفتند- فوجِ کمِ شاهی، تابِ جنگ نیاورده، گریخت- اینها تا برودخانهٔ "اٹک"[1] متصرف شده صاحبا نام سردارے را برائے ضبطِ آن طرف گذاشته روانهٔ وطن که عبارت از دکن است گشتند-

چون نوشتنِ این سانحات بر سبیلِ اِجمال منظور داشتم، اکثر مقدمات مثلِ چشم سخت کردنِ عمادالملک بر شجاع الدّوله و مُصلح بودنِ راجا، و هنگامهٔ بے ادائی ——— بدخشیان، و زَبون گشتنِ آنها از جراَتِ وزیر، و راجا و نجیب خان، و رفتنِ وزیر به لاهور برائے ضبطِ اموالِ مُعین الملک که خسرِ اُو بود، و برآوردنِ زنِ صوبه دارِ مذکور از شهرِ مسطور، و کُشتنِ عاقبت محمود کشمیری، و کُشته شدنِ ستار قلی خان کشمیری، و خرابیِ شهرِ دهلی، و بغارت رفتنِ خانهاے مردم، از جورِ بے تهے چند، که تازه برروئے کار آمده بُودند و غافل بُودنِ این خران، از چوبِ خدائی، و رفتنِ عالی گُهر یائی از سردارانِ دکن، که حالا تهمتیِ بادشاهت است، و بدستِ فرنگیان گرفتار-[2] و پس از چندے آمدنِ اُو بشهر[3] برائے ملازمتِ پدر، و برسمِ پذیره رفتنِ راجا، و غدر کردنِ یاران، و زخمی شده[4] رفتنِ اُو بجانبِ مشرق، و[5] لکد بخت خوردن، و بادشاه شُدن، و قید کردنِ انتظام الدّوله خانخانان، و برآوردنِ سلاطین از قلعه، بگفتهٔ ناکسان، و باز آمدنِ آنها، برسوائیے که ناگفته به است ——— قلمِ زبان آورِ من بتفصیل[6] ننگاشت- زیراچه[7] این مُوجز گنجائیِ اینهمه اِطناب نداشت-

هنوز روزگار اینهمه بلاها را به تمام[8] برنچیده بُود، که گردشِ آسمانِ[9] حقّه باز فتنهٔ تازه

[1] ن ۲: رتک-
[2] ن ۲: گرفتار شدن-
[3] ن ۲: به شهر آمدنِ او-
[4] ن ۲: زخمی شده جان بسلامت بُردن اُو بجانبِ مشرق-
[5] ن ۲: واو ندارد-
[6] ن ۲: بتفصیل ندارد-
[7] ن ۲: زیرا که-
[8] ن ۲: بالتمام-
[9] ن ۲: گردشِ زمانه-

را بعرصۂ ظہور آورد- آشوبے عجیبے[۱] برخاست- یعنی سردارے[۲] جنکو نام بافوجِ بسیارے از دکن رسید و گذارِ[۳] لشکرش در سوادِ شہر[۴] اُفتاد- دلِ اکثرے از جا شد- قیامت برپا شد- رئیسان رنگِ رُو باختند، شاہ و وزیر باؤ ساختند- دتّا نام[۵] سردارے کہ مدار المہامِ آن سردارِ جگردار و جوانِ چارشانہ بود، از خود کردہ، بہ[۶] نجیب الدّولہ، کہ[۷] بکنارِ گنگ در جاے قلب ثباتِ قدم ورزیدہ تمکّن داشت، دوانید- آنجا جنگِ عظیم اتّفاق اُفتاد-

اینجا عزیزان بخانۂ وزیر انجمن شدند، کہ اگر این فوجِ سنگین برگردد و برما ریزد، قیامتے برانگیزد کہ عالم تہ و بالا شود، و شہر بغارت رود- اگر دست دہد شریک شدہ کارِ نجیب الدّولہ بسازیم، وگرنہ واسطہ گردیدہ[۸] بصُلح پردازیم-

ہرگاہ قرار یافت، وزیر برآمد و آنطرفِ آب خیمہ کردہ، مکلّفِ بادشاہ گشت اُو تمارض نمودہ جوابِ صاف داد- یاران چون از بادشاہ دلجمعی نداشتند، مشورت کردند کہ بشہر بروند، و بادشاہ را از میان بردارند، و انتظام الدّولہ را نیز زندہ نگذارند- راجا ہمان شب آنروے آب رفت- سفیدہ[۹] دم آن سیاہ درونان از لشکر بشہر آمدہ، پیشِ بادشاہ حاشا زدند کہ "ما با وزیر بدیم، امّا زمانہ سازی میکنیم- فوزِ عظیمے دست بہم دادہ است اگر حضرت دریابند-" آن سادہ لوح فریبِ آن ناسرانجامان خوردہ، پُرسید کہ "چیست؟" گفتند: "فقیرِ صاحب کمالے دست از دُنیا برداشتہ، از دو سہ روز در قلعچۂ[۱۰] فیروزشاہ وارد است- فردا خواہد رفت- آخرِ روز اگر دیدہ شود غالب است کہ از دعاے این[۱۱] بزرگ ازین بلا[۱۲] رہائی یابیم[۱۳]، و بر وزیر غالب آییم-" بادشاہ از زبان درتہِ زبان داشتنِ عزیزانِ عصر غافل بود، وعدہ داد کہ البتہ خواہیم دید- آخر نزدیک بشام[۱۴] سوار کردہ، بُردند- چون

۱ ن ۲: و آشوبے عجیبے- ۲ ن ۲: سردارے- ۳ ن ۲: گذر- ۴ ن ۲: شہر ندارد-
۵ ن ۲: یارانِ دتّا- ۶ ن ۲: بر- ۷ ن ۲: کہ ندارد- ۸ ن ۲: دیدہ-
۹ ن ۲: و سفیدہ- ۱۰ ن ۲: کلہ- ۱۱ ن ۲: آن-
۱۲ ن ۲: بلاہا- ۱۳ ن ۲: بیابیم- ۱۴ ن ۲: شام-

درقلعچهٔ رسید بزخمِ کارد کارِ آن بیگناه ساختند، و مردهٔ اُورا[1] پایینِ دیوار انداختند. بعد از[2] شام ازانجا برگشته در سماز رسن بگلوے خانخانان افگنده کشیدند، و بسختی تمامش کُشته لاشهٔ اُورا[3] از نظرِ مردم پنهان رَبُودند و غرقِ دریا نَمودند. مُردهٔ پادشاه تمام روز برسوائی تمام بر رُوے[4] خاک اُفتاده ماند. هرکه میدید بر مُرتکبانِ این امرِ ناشایسته لعنت میکرد. آخر وارثانِ اُو جگر از سنگ کرده، شباشب زیرِ[5] خاکش پنهان ساختند، و از هراسِ آن بےچشم و رُویان ماتم نگرفتند. صبحِ دیگر آن ستم کیشان، در قلعه آمده، شاهجهان نام جوانے را بر تخت نشانیدند و نذرها گذرانیدند. مدّتِ سلطنتِ عالمگیر ثانی هفت سال بود.

هرگاه این زبون گیر چند از کشتنِ بادشاه و انتظام الدّوله فراغت کردند، وزیر را کوچ بکوچ[6] بُردند. اُو بعد از قطعِ منازل وطیِ مَراحِل بفوجِ دکن پیوسته، شریکِ جنگ شد. هفتهٔ برین نرفته بود که[7] خبر رسید فوجِ[8] شاهی از اَٹک گذشته، صاحبا[9] را شکست داد. سردارانِ دکن جنگِ نجیب الدّوله را گذاشته، سراسیمه برائے سَدِّ راه شدن، روانه گشتند و برابرِ پانی پت از آبِ جَون عبُور نموده، فرود آمدند. در اثنائے راه[10] جهانے سر سخت خورد، ازانجا سنگ بسنگ زنان، آنطرفِ کرنال که قصبه الیست مشهور، و آستانهٔ شاه شرف بُوعلی قلندر آنجاست، خیمه گاه ساختند. شام شنیده شد که لشکرِ شاهی بر سمتِ دریا سیاهی کرد. ایشان نیز سیاهیِ فوج نمودند. روزِ دیگر پیش از تیغ کشیدنِ آفتاب، جوانانِ جرّار کارگذار، قریب هشت هزار سوار، و یکی از سرداران جدا کرده، فرستادند. وقتیکه رفتند، و برُوے[11] آن فوج ایستادند بیک تگ تگِ پا بسیارے از پا اُفتادند. سخت دلانِ کوه پیکر، بر سرِ سنگ نشستند[12]. زنخ زنان را زنخدانها شکستند.

---

[1] ن ۲: را ندارد۔ [2] ن ۲: از ندارد۔ [3] ن ۲: اُو ندارد۔ [4] ن ۲: روے ندارد

[5] ن ۲: بزیر۔ [6] ن ۲ و مط: کوچ باکوچ۔ [7] ن ۲: که ندارد۔

[8] ن ۲: که فوج۔ [9] ن ۲: صاحب۔ [10] ن ۲: راه ندارد۔

[11] ن ۲: برروئے۔ [12] ن ۲: نشسته۔

خونخواران آنطرف بوضعے آویختند که خونِ بساکس بیکدم ریختند۔ چشم[1] لشکریانِ این جانب ترسید، و دلِ جوانان بخود لرزید۔ اگر خدانخواسته آن دسته بر دائرهٔ لشکر میزد، همانروز، کار بتمامی کشیدے، و از[2] ما مردمان یکے بشهر سلامت نرسیدے۔ اینان شاخ از پشیمانی برآورده برگشتند۔ آنان سرگاوے زده از آب گذشتند۔

هرگاه مخیّم شاه دوآبه شد، ونجیب الدّوله ملحق گشت، دکهنیان وزیررا، جهتِ محافظتِ لشکر[3] وشهر، دستوری دادند، وخود کنارِ آب گرفته آمدند، وشش کروه آنطرف خیمها زدند۔ اینجا وزیر، شهررا محکم کرده، ملچارها قسمت نمود، و[4] حویلی داراشکوه که بر دریا واقع است، به راجا سپرده، بادشاهِ نورا، که شاهجهان باشد، دید۔

پس از چار[5] روز، فوجِ شاه، ونجیب الدّوله، پاجفت دویده، بدریا رسید۔ دلاورانِ پیکار جو[6] وسوارانِ جنگجو[7] (درپئے پوزمال گردیدند۔ پیادگانِ روهیله پیش قدمی نموده هنگامهٔ جنگ[8]) راگرم ساختند، وچنان تردّد کردند[9]، که پایهاے شان پوست انداختند۔ ازین طرف دتا که سرکردهٔ فوجِ دکن بود، بکارگذارانِ خود پهلو داده، بیک پهلو افتاد[10]، و مقابلِ آن فوجِ سنگین ایستاد۔ نخستین تفنگے که ازان سو سرزده[11] شد، تیرِ او به دتا رسید، و به پهلو غلطید۔ دکهنیان دست وپا گم کرده، لاشِ اورا برداشتند، وکنارِ آب گذاشتند۔ آنان این طرفِ آب آمده، دستِ جلادت کشادند۔ اینان سر به[12] بیابانِ هزیمت نهادند۔ وزیر سردارانِ خودرا[13] بر ملچارها گذاشته، بافوجِ دکن آمیخت زمانهٔ غدّار رنگ خرابی[14] ریخت۔ درّانیان دنبالِ گریختگان افتاده، اکثرے را علفِ تیغ بیدریغ کردند[15]،

---

[1] ن ۲: چون چشم۔ [2] ن ۲: پائے۔ [3] ن ۲: لشکر و ندارد۔ [4] ن ۲: واوَ ندارد۔
[5] ن ۲: سه چهار روز۔ [6] مط: پیکارجو۔ [7] ن ۲: جو ندارد۔
[8] ن ۲: عبارت بینَ القوسین ندارد۔ [9] ن ۲: نمودند۔ [10] ن ۲: افتاده مقابلِ آن۔
[11] مط: سردده ن ۲: سرداده (تصحیح قیاسی از مرتّب)۔ [12] مط: به ندارد۔
[13] ن ۲: را ندارد۔ [14] ن ۲: خرابی عالم۔ [15] ن ۲: کرد و برگشته آمد و انداز۔

و برگشته اندازِ تاراجِ شہر نمودند[1]۔

راجا شام از شہر برآمده، قصدِ[2] قلعجات سورج مل کرد، و سلامت رفت۔ بنده برائے حفظِ ناموسِ خود، بشہر ماندم۔ بعد از[3] شام، منادی شد که شاه امان داده است، باید که ـــــــ رعایا پریشان دل نگردد[4]۔ چون لختے از شب گذشت، غارتگران دستِ تطاول دراز نموده شہر را آتش داده، خانہا[5] سوختند و بُردند۔ صبح که صبحِ قیامت بود، تمام فوج شاہی و روہیله ہا تاختند و بقتل و غارت پرداختند۔ دروازہا شکستند، مردمان را بستند، اکثرے را سوختند، و سر بُریدند۔ عالمے[6] را بخاک و خون کشیدند۔ تا سه شبانروز[7] دستِ ستم بر نداشتند از خوردنی و پوشیدنی ہیچ نگذاشتند۔ سقفہا شگافتند۔ دیوارہا شکستند، جگرہا سوختند، سینہا خستند۔ آن زشت سیرتان بر در و بام۔ اکابران بے بے سیرتیِ تمام۔ شیخانِ[8] شہر بحالِ خراب۔ بزرگان محتاجِ دمِ آب۔ گوشه نشینان بیجا شدند، اعیان همه گدا شدند۔ وضیع و شریف عُریان، کدخدایان بے خان[9] و مان۔ اکثرے به[10] بلاہا گرفتار۔ رُسوائے کوچه و بازار۔ بسیارے خداگیر، زن و بچه اسیر۔ بر سر[11] شہرے ہجوم، قتل و غارت علی العُموم۔ حالِ عزیزان به اُبتری کشید۔ جان بسے بلب رسید۔ زخم میزدند و زبان بتلخی میکشودند، زر را[12] می گرفتند و سلاخی مینمودند۔ باہر که بر میخوردند، تا سترپوش میبُردند۔ جہانے از جہان ناشاد رفت۔ ناموسِ عالمے بَرباد رفت۔ شہرِ نو بخاک برابر شُد۔ روزِ سوم نسَق مُقرر شد۔ انز[13] لا خان نام نسقچی باشی رسید۔ کُلاہہا و نیم تنِ مردم اُو کشید۔ بارے قدغنچیان غارتگران را از شہر برآورده، باحتیاط پرداختند، و آن بے رحم مردمان، بشہرِ کہنه چسپیده، جہانے را ہلاک ساختند۔ ہفت ہشت روز این ہنگامه

---

[1] ن ۲: نمود۔ [2] ن ۱: با چندے از رؤسائے این جا قصد۔ [3] ن ۲: از ندارد۔
[4] ن ۲: رعایا پریشان نشود۔ [5] مط: ہمیں دارد اما "خانمان" باید۔ [6] ن ۲: و عالمے۔
[7] ن ۲: شبانه روز۔ [8] ن ۲: سخنان۔ [9] ن ۲: واو ندارد۔ [10] ن ۲: به ندارد۔
[11] ن ۲: سر ندارد۔ [12] ن ۲: آزار۔ [13] ن ۲: انزماں خاں۔

گرم بود- اسبابِ پوشش و قوتِ یکروزه در خانهٔ کسے نماند- سرِ مردمان بیکلاه، زنان بے رومالِ سیاه، جمعے، چون راهها قفل بود، روزی از زخمِ پراگنده خوردند[1]- جماعتے را، از سردیِ هوا دندان بدندان کلید[2] و مُردند- به بے حیائیِ تمام تاختند روها بر زمین[3] انداختند- غلّه ها را[4] از گرسنه چشمی می اندوختند، و بدستِ غربا بطرح می فروختند، شورِ غارت زدگانِ شهر تا آسمانِ هفتم میرسید- امّا شاه خود را، که[5] فقیر میگرفت، به سببِ استغراق نمی شنید- هزاران خانه سیاه، در عینِ آن آتشِ تیز، با داغِ دل[6]، جلاے وطن کرده سر بصحرا زدند، و چون چراغِ صبحگاهی در راه از هواے سرد، خانه روشن کردند- بے[7] شمار بیدست و پایان را، آن[8] سیه درونان، در رکاب انداخته، اسیرانه بدائرهٔ لشکرِ خود بُردند- دست دستِ ظالمان بود- دست کجی میکردند، دست پلشتی مینمودند، دستِ چوب بر سر[9] میکشیدند- دست ببازوے زنان میرسیدند، تیغها می آختند، دستگاه می ساختند- از دستِ شهریان هیچ نمی آمد، زیرا که دست و دلِ ایشان سرد شده بود- کسے دست پاچه میشد، و کسے دست بزیر سرِ ستون مینمود- بر هر درے درون سیاهے، در هر برزنے بزنگاهے- بازارے و گیر و دارے- هر طرف[10] خون ریزی، هر سمت[11] بُز آویزی- پا تا به پیچی میکردند، بنا گوشی میزدند- غریبان از خوف خشک لبوند، دیده درایان تر بها مینمودند- خانها سیاه- کوچه ها داغگاه- صدها از چوبکاری هلاک شدند- جامهٔ خون بستهٔ یکے بر سرِ چوب کرده نشد، عالمے از زخمِ ستم جامه در خون کشید و جان داد- امّا کسے دم نزد- زمینِ شهرِ کهنه، که جهانِ تازه اش میگفتند، دیوارِ صورت کاریِ افتاده را مانا شد- یعنی تا هر جا که نظر میرفت، سر و سینه و دست و پاے کشتگان بود-

---

[1] ن ۱: هم نخوردند-
[2] ن ۱ و ن ۲: کلید شد-
[3] ن ۲: بزمین-
[4] ن ۲: ها ندارد-
[5] ن ۲: که ندارد-
[6] ن ۲: دل ندارد-
[7] ن ۲: وبے-
[8] ن ۲: آن ندارد-
[9] ن ۲: بر سر ندارد-
[10] ن ۲: هر سمت-
[11] ن ۲: هر طرف-

خانہاے آتش زدهٔ سینه سوختگان از نارِ[1] بتخانه‌ها یاد میداد- یعنی تا چشمِ بینندگان کار میکرد، سیه مینمود- سخت خوردهٔ که خود را بکشتن داد آرامید- چشم خوردهٔ آنها، روے بهبود ندید- منکه فقیر بودم، فقیر تر شدم- حالم از بے اسبابی و تهی دستی ابتر شد- تکیهٔ که بر سرِ شاهراه داشتم، بخاک برابر شد- غرضکه آن بیمروتان تمام شهر را بار کرده بُردند- عزیزان همه ذلیل شده[2] جانها سپردند-

هنوز از نهیب[3] و غارت دست برنداشته بودند، مشهور شد که فوجِ هزیمت خوردهٔ دکن، با فوجِ دیگر که در نواحِ میوات بود، پیوست- ارادهٔ فاسدے دارد- شاه از استماعِ این خبر مهیاے آنطرف گشته، شاهجهان را، که تهمت زدهٔ چند ماهه[4] سلطنت بود، بدستورِ سابق در سلاطین فرستاد، و جوان بخت پسرِ عالی گهر را دلِ مهدِ او گردانیده، از شهر کوچید و رفت- عماد الملک، همراهیان[5] سردارانِ دکن گذاشته، بقلعجاتِ سورج مل آمد[6] و نشست- وقتیکه شاه در نواحِ میوات رسید، و دکهنیان دیدند که تیغِ مانمی بُرد، و چشمِ لشکریان ترسیده است، جنگِ گریز کنان، بطورِ قدیمِ خود، تا شاهجهان آباد آمده، از دریا عبور کردند- شاه نیز متعاقب[7] در رسید، و شب در سوادِ شهر گذرانیده، از راهِ پایاب گذشت-

آنروے آب چون معسکر شد، جهان خان سردارِ فوجِ پیش رفته قریب سکندر آباد با فوجِ ملهار که احوالِ او گذارش یافت، در آویخت- شاه، از اینجا با سه هزار غلام سوار شده در عرصهٔ دو پاس شریکِ او شد- سردارِ آنطرف تابِ مقاومتِ او نیاورده، دمِ خود را بیکے[8] از سردارانِ دکن سپرده، پنهان[9] گریخت- آن سرکرده دادِ دلاوری داد و کشته افتاد- کسانِ دیگر دندان بحرف گذاشته، از رو بروے جرارانِ فوجِ شاهی گریخته

---

[1] ن۲: تعزیت خانه‌ها- [2] ن۲: شدند- [3] ن۲: سبب-
[4] ن۲: چند مایه- [5] ن۲: همراهی- [6] ن۱: رفت-
[7] ن۲: بتعاقب- [8] ن۲: همگی از سران- [9] ن۲: تنها-

پراگندہ شدند۔ شاہ تاکول کہ قصبہ ایست معروف، تعاقب کنان رفت۔ گریختگان بتعلقات سورج مل پناہ بُردہ[۱]، بعد از دو سہ روز، روانۂ پیشتر گردیدند۔ فوجِ شاہ[۲] با یکے از قلعہ ہاے اُو، کہ اینطرفِ آبِ جون[۳] بود، چسپید، وکار بر[۴] مردمِ حصار سخت گرفت۔ زمیندارِ مسطور، امدادِ آنہا بالقوۃ خود ندیدہ، بدرِ تغافل زد۔ ناچار حصاریان اِنتہازِ[۵] فرصت یافتہ، ہنگامِ شب گریختند، و میاندار[۶] فرستادہ صلح نمودند۔

سانحہ ہنوز لشکر میانِ دو آب بود، شہرت یافت کہ فوجِ سنگینے از دکن باندازِ جنگ، در نواحِ اکبرآباد رسیدہ است، و زود میرسد۔ نجیب الدّولہ سرداران سمتِ مشرق مثلِ شجاع الدّولہ، و احمد خان، و حافظ رحمت وغیرہ را برائے ملازمت آورد و ہر یکے را بوعدۂ ملکے خوش دل ساختہ، سراپا دہانید و آمادۂ جنگ گردانید۔

درین نزدیکی بھاؤ ــــ کہ سرِ سردارانِ دکن بود۔ با انبوہِ بیش از بیش از مُلکِ سورج مل گذشت و وزیر و راجا اُورا[۷] استمال ساختہ با خود آورد، و متصرفِ شہر گشت۔ یعقوب علی خان کہ قرابتے با شاولی خان وزیرِ شاہِ دُرّانی داشت، و در قلعۂ بادشاہی بتوقّعِ آنکہ فوجِ شاہ آنطرفِ آب است، کمک مددی نخواہد کرد، بخود سپردہ، بدست و دندان در جنگ چسپید۔ دکھنیان[۸] محاصرہ نمودہ، بباد ییجہا گرفتند، اکثر مکاناتِ بادشاہی را کہ نظیر نداشتند، بخاک یکسان[۱۰] ساختند۔ چون دریا بسببِ برشگال عَسیر العبور بود و شاہ نمی توانست گذشت، خانِ مذکور بدستِ راجا نصر بسر کردہ، از قلعہ برآمد۔ نظر بر عہد و پیمان کسے مزاحمِ احوالِ اُو نشد۔ درین ایّام من بخدمتِ راجا حاضر شدم و التماس کردم[۱۱] کہ از گرم و سردِ روزگار در آتش و آبم، میخواہم کہ ازین شہر برآیم و جاے دیگر

---

[۱] ن ۲: آوردہ۔ [۲] ن ۲: فوجِ شاہی را۔ [۳] ن ۲: جون ندارد۔
[۴] ن ۲: کاربا۔ [۵] ن ۲: آنہا۔ [۶] ن ۲: بمیان۔
[۷] ن ۲: ندارد۔ [۸] ن ۲: و اورا۔ [۹] ن ۱: جنوبیان۔
[۱۰] ن ۱: برابر۔ [۱۱] ن ۲: نمودم۔

بَرَدم شاید که آسُودہ شَوم۔ ایشان رعایتے نمودند و رخصتم فرمُودند۔ لَواحقان را ہمراہ گرفتہ[1] بَرآمدم۔ جائے مدِ نظر نداشتم، بتوکّل قدم در راہ گذاشتم۔ در تمام روز پس[2] از خرابیِ بسیار ہشت[3] و نہ کروہ راہ طے شُد۔ شب در سرائے زیرِ درختے بسر کردم[4]۔ صبح آن، زنِ راجا جُگل کشور کہ اَحوالش نگاشتہ آمد، ازان راہ گذشت۔ ماکم پایان را از خاک برداشتہ ہمراہِ خود تا بَرسانہ ـــــ کہ معبدِ ہنُود انست[5]، و قصبہ الیست ہشت کروہِ این طرفِ قلعجاتِ سورج مل ـــــ بُرد، و بانواعِ مُراعات دلدہی کرد۔

سَلخِ ذی حجہ[6]، اُو بہ "کامان" ـــــ کہ سہ کروہیِ آن مکان شہریست سَرحدِّ[7] راجا جے سنگھ ـــــ رفت۔ بندہ با اَہل[8] و عیال در عشرہ آنجا اِقامت نمُودم[9]۔ فردائے عاشورہ قدم کشیدم و بہ کُمھیر رسیدم۔

اینجا بَہادر سنگھ نام ـــــ پسرِ لالہ رادھا کشن کہ پیشتر خزانچی گریِ صفدر جنگ داشت، و درین اوقات با راجا بود ـــــ شام[10] آمد و سَردستی بمن گرفتہ، آدمیانہ سَر کرد۔ احسانمندِ اُویم کہ غیر از دوست رُوئے حقے بَرو نداشتم۔ چندے بفراغت ماندم، و روز و شب گذراندم۔

حکایت[11]

روزے بسببِ فقدانِ اسبابِ معیشت، دلتنگ نشستہ بُودم۔ بخاطر رسید کہ با اعظم خان ـــــ پسرِ اعظم خانِ[12] کلان کہ در عہدِ فردوس آرامگاہ امیرِ شش ہزاری بود، و دست و دِلے[13] داشت ـــــ اگر ملاقات کردہ شود، یکدو دمِ خوش برآوردہ شود۔ رفتم و در طویلۂ سورج مل ـــــ کہ تازہ اِقامتگاہِ خانہ خرابانِ شہرِ دہلی شدہ بُود ـــــ برخوردم آن عزیز ـــــ خداش بیامرزاد۔

---

[1] ن ۱، ۲: پیادہ پا برآمدم [2] ن ۲: پس ندارد۔ [3] ن ۲: واؤ ندارد۔ [4] ن ۲: کردیم۔
[5] ن ۲: ہنود است۔ [6] ن ۲: سلخ محرم۔ [7] ن ۲: سرحدی۔ [8] ن ۲: بے اہل و عیال۔
[9] ن ۲: نمودیم۔ [10] ن ۲ و مط: کذا۔ [11] ن ۲: حکایت ندارد۔
[12] ن ۲: پسر اعظم خان ندارد۔ [13] ن ۲: و روئے داشت۔

لب را[1] بخیر پرسشِ[2] من کُشاد. سَررفتهٔ خود برزبان آوردم[3] سامعان را از[4] هوش بُردم. چون قهوه وقلیان[5] بمیان آمد این بیتِ[6] آمده برزبان آمد:

اِمروز که چشمِ من و عُرفی بهم اُفتاد
باهم نگرستیم وگرستیم و گذشتیم

چند شعر ازین قبیل خواندم. دوسه[7] اشک از مژه اَفشاندم، پس از نَفَسے چند، خان[8] را متفکر دیدم. گفتم[9]: "چه بخود[10] فرو رفته ای؟". گفت: "خیر." گفتم: "آخر؟". گفت: "هر گاه شما در شهر می آمدید[11]، اقسامِ شیرینی و انواعِ حلویات می آوردیم و باهم میخوردیم. امروز عجب اتّفاق است که دست برشکرِ خام هم نداریم تا کاسهٔ شربتے برائے شما بیاریم." گفتم که "مُولَعِ[12] اینهمه نیستم. آنهم برسبیلِ تفنّن بود. صاحب خوب میدانند که گاہے شکم را نان شماط نکرده ام. اَوقات مختلف است. آن هنگامِ شربت وشیرینی بُود، این موسمِ تلخی کشیدن است." همین گفت وشنود[13] بود، که زنے خوانے برسَر، از در دَر آمد وگفت: "همشیرهٔ[14] سعدالدین خان خانساماں[15] دُعا گفته است، و قدرے حلوائے نزاکت وشیرینیِ شَنبه فرستاده." خان چون سَرِ خوان کُشاد نِگاهش بَرگُلِ حَلوا اُفتاد. گُل گُل شگفت، و بامن گفت که "این روسیاه قدرِ[16] خود خوب میداند. عمریست که بفاقه کشی میگذراند. گاہے از جائے دمِ آبے، لبِ نانے نرسیده[17]، تا به حَلوا وشیرینی چه رَسد. شما مِهمانِ عزیزید. این اِقامتِ شماست. حصّهٔ مَرا بدهید، و بخانهٔ خود فرسید[18]." گفتم: "بسیار است. من

---

[1] ن ۲: را ندارد.　[2] مط: خبر پرسش ن ۲: خیر.　[3] ن ۲: بیان نمودم.

[4] ن ۲: از ندارد.　[5] مط: حقّه وقُلیان. تصیح از ن ۱ و ن ۲.　[6] ن ۲: آمده ندارد.

[7] ن ۱: و دوسه.　[8] ن ۱: خان مذکور.　[9] ن ۲: پرسیدم.

[10] ن ۱: بخود چه.　[11] ن ۱ و ن ۲: بَرمی خوردند.　[12] ن ۱: این هم مُولع نیستم.

[13] ن ۱: شنید.　[14] ن ۱: که همشیره.　[15] مط: سعیدالدین خان، تصیح مرتّب.

[16] ن ۱: خود ندارد.　[17] ن ۱: نرسیده است.　[18] مط: فرستید. تصیح از ن ۱.

چه خواهم کرد.» گفتا: «بکارِ میر فیض علی پسرِ شما خواهد آمد.» غرضکه مردِ[1] خوشے بود، کاسه بند نموده، قابِ حلوا و خوانِ شیرینی بخانهٔ من فرستاد و خندان خندان دلم داد. دو روز بهمان[2] شیرینی گذرانیده شد. روزِ سوم رائے بشن سنگه پسرِ خوردِ راجا[3] مرا طلبید، و احوال گیری کرده گفت[4]: «تا تشریف آوردنِ[5] راجا صاحب پیشِ من باشید[6].» گفتم که[7] «اسبابِ معیشت مفقود است.» گفت: «دل را جمع کنید[8]. اینجا همه چیز موجودست.» آن نوگلِ باغِ کرم که شاداب و خرم باشد بشگفتگیِ خاطر، مایحتاجِ مرا می رسانید[9].

سانحه[10] اینجا چنان مسموع شد که بشهر شهرت گرفت که صمد خان[11] فوجدارِ سرهند، با چند زمیندار، و فوجِ بسیار، می آید، و ارادهٔ لشکرِ شاه دارد. بهاؤ سردارِ دکن، که جوانِ بر خود پیچیده بود، کسے[12] را پیشِ خود وجود نمیگذاشت. اسبابِ زائد در قلعهٔ شاهجهان آباد گذاشته بمقتضاے حرارتِ ذاتی، قصدِ حرکتِ آنطرف نمود. بخاطر داشت که وزیر جواهرِ بسیارے دارد، و سورج مل زمیندارِ کلانے است، اگر زمانه فرصت دهد، از ایشان چیزے بگیرد. راجا ناگرمل بسببِ ملاقاتِ سردارانِ او، ازین معنی خبر بود[13]، روزے براجا پیغام فرستاد که تصدیت[14] ممالکِ محروسه باختیارِ شما میگذارم. این عزیز، نظر بران[15] معنی گفت که از مدتے با وزیرم، مناسب نیست که او ناکام باشد و من کارِ خود برم[16]. پس انسب آنست که اورا دستوری بهر پور شود. من و سورج مل بطریقِ مشایعت رویم و از سرش واکرده موافقِ گفته کاربند شویم. غرضکه از چرب زبانی روغنِ قاز مالیده، روزِ کوچِ دکهنیان،

---

[1] ن ا: او مرد.
[2] مط: بهمان.
[3] مط: رائے بشن سنگه ندارد.
[4] ن ا: گفت که.
[5] ن ا: تا تشریف آوردنِ ایشان، صاحب.
[6] ن ا: باشند.
[7] ن ا: که ندارد.
[8] مط: کنند.
[9] ن ا: برسانید.
[10] ن ا: ندارد.
[11] ن ا: سمند خان.
[12] ن ا: وکسے.
[13] مط: خبر بود.
[14] ن ا: نظامت.
[15] ن ا: برین.
[16] ن ا: پیش برم.

خود وسورج مل به بهانهٔ که نگارش یافت، با بهیر و بُنه، از لشکرِ آنها، بجگرداریِ تمام، سوار شده، در بلّم گدّهه، که حصاریست مُحکَم، دوازدهٔ کروهیِ شهر، آمده نشستند. وزیر و اسباب و خیمه ها روانهٔ پیشتر شدند. وُکلاے دکهنیان هر چند بسماجت گفتند، امّا بشنیدنِ حرفِ آنها نپرداختند، ونسبتِ خود به شاه درست ساختند. رئیسِ دکهن، که استقلالِ واقعی داشت، ونظر بر لشکرِ بیشمار[1]، وآلات و اسبابِ بے حدّ، جمعیّتِ ایشان را بحساب نمیگرفت چون شنید، بخود بپیچید، وگفت که[2] "اینها چه چیز اند! چراغِ دولتِ اینها به پُفے دربند است. من باعتمادِ اینان از دکن نیامده ام، در مژگان بهم زدن بخاک برابر خواهم کرد." تدارکِ[3] این حرکت، بر وقتِ دیگر موقوف داشته رفت، وقلعهٔ نجابت خان روهیله سر سواری[4] گرفته، صمدخان[5] را کُشت، وآن اَنبوه را پراگنده ساخت. چشمِ دکهنیان از برهم زدنِ این فوج خیره شد. ازانجا برگشته، مُتّصلِ پانی پت سنگر بستند. وآمادهٔ جنگِ میدانِ شاه گشتند. وقتیکه آبِ جون رو بکمی آورد، شاه بصد جوش وخروش، بر سرداران[6] سمتِ مشرق، از دریا عبور نموده، دستِ جلادت کشود. چند روز پیش از جنگِ صف، خبر رسید که گوبند پنڈت با جمِّ غفیر آمده است، واندازِ پیوستنِ لشکرِ دکهنیان دارد. سردارے[7] با فوجِ سنگین از لشکرِ شاه جُدا شده[8] دوید، وبے خبر رسیده، اُو را بخاک وخون کشید۔ اَسبابش همه بغارت بُرد. آن اِجماع برهم خورد.

در بنولا، راجا ورکهیر، که قلعهٔ سورج مل است، باز[9] تشریف داد، منکه بحسبِ قسمت دراینجا[10] بودم، رفته التماس نمودم، که از چندے انتظارِ قُدومِ فرحت لزوم داشتم. اکنون[11] اجازت شود بطرفے بروم که با روزگارِ ناساز طرف نمیتوانم شد. از راهِ عنایتے که بحالِ من

---

[1] ن ا: پیش رو۔
[2] ن ا: که ندارد۔
[3] ن ا: بر تدارک۔
[4] ن ا: سر سواری۔
[5] ن ا: سمند خاں۔
[6] ن ا: با سرداران۔
[7] ن ا: سردارن۔
[8] ن ا: جدا گشته
[9] ن ا: باز ندارد (در مط: باد)۔
[10] ن ا: دراین جا۔
[11] ن ا: اکنون اگر۔

میداشتند، گفتند[1]: "معلوم میشد که قصدِ بیابان مرگ شدن[2] دارید. امّا اگر من هم گذارم." هما نروز چیزے جهتِ خرج فرستادند، و علوفهٔ من بدستورِ سابق دستخط کرده دادند.

چون این بزرگوار، بسببِ آنکه شاهجهان آباد خرابهٔ بیش نمانده است، و مردمان سالے دو بار خانهارا بر خردش بار میکنند، کسے تا کجا خانه بردوش باشد، و[3] درین سرزمین که[4] گوشهٔ عافیتے است، و رئیسِ اینجا مردِ آرمیدهٔ هست، بر خود نمی شکند ـــ توطن اختیار کرد. ما مردم نیز در سایهٔ دیوارِ او مقرِ خود مقرر[5] ساخته افتادیم.

سانحه[6] | حقیقتِ هر دو لشکر آنکه اگر دکهنیان بجنگِ گریز، که طورِ قدیم[7] آنها بود، می جنگیدند اغلب که غالب[8] می گردیدند. ایشان توپخانه را گرد کرده نشستند. فوج شاهی در پے آن شد که رسد نرسد[9]. وقتیکه کار تنگ شد سردارِ دکن مستعدِ[10] حرب گشت. سران از سنگرد سنگ چین برآمده، میخ دوز ایستادند، و جگرداران شاه میخِ چشمِ آنها بوده، بیک پهلو افتادند. کارگذاران میدان کشیدن و بر[11] هم کردن آغاز کردند. دلاورانِ پیکار جو[12]، بند بر بندِ قبا بافته به پشتِ کمان گرفتند. نبرد آزمایانِ جنگ جو، بندوقها گرفته، بدست و دندان چسپیدند. برزۀ استادگان، تیغها آخته، بر سرِ هم دویدند. بیدِل رقصانِ معرکهٔ کشت و خون، برکار سوار گشتند. پیش جنگان پیاده شده[13] در آویختند، و از هم گذشتند. زخمها بجوانان رسیدند. جامه ها در خون کشیدند. جنگ آورانِ عرصه تنگ آوران، از دو طرف ریختند و تفنگها گرفته آویختند. سردارِ دکن ثبات ورزیده پا بمیدان گذاشت و اکثر دسته هائے فوجِ شاهی را از پیش برداشت. چون فتح از شاه بود، از تردد کارے نکشود. هزار هزار بندوق نی اندا فتند و بیک نفرِ اینطرف نمی رسید، و از دستِ تفنگ اندازانِ سهل، مردانِ کار آمده از کار میرفتند[14].

---

[1] ن ا: که معلوم۔ [2] ن ا: شدن ندارد۔ [3] ن ا: واو ندارد۔
[4] ن ا: که بحسبِ ظاهر۔ [5] ن ا: مقرر ندارد۔ [6] ن ا: سانحه ندارد۔
[7] ن ا: قدیم ندارد۔ [8] ن ا: که غالب ندارد۔ [9] مط: نرسید۔ [10] مط: مستعدے۔
[11] ن ا: برهم گردن۔ [12] ن ا: پیکار خو۔ [13] ن ا: شدند و۔ [14] ن ا: از کار رفتند۔

چنانچہ در[۱] اوّلِ وہلہ تیرِ تفنگ بہ وِشواس راؤ کہ ریاست بنامِ اُو بود، رسید۔ و بخاک و خون غلطید۔ میگویند کہ بھاؤ جوانِ غیورے بود، و دادِ مردانگی میداد، دمیکہ این سانحہ را بچشمِ خود دید، بر زبان راند کہ حالا روے رفتنِ دکن نماند۔ دل از جان برداشتہ، دندان بجگر افشردہ، بر قلبِ سپاہ زد۔ یعنی دیدہ و دانستہ خود را بکشتن داد۔ ملھار پیر گرگِ بغل زن، با دو سہ ہزار کس ازان مہلکہ[۲] بیرون رفت، و تمام لشکر غارت شد۔ سردارانے کہ زندہ برآمدہ بودند، برہنہ بحالِ فقیران آوارہ شدند، و اسپ و سلاحِ ہزار ہزار سوارِ فرار نمودہ را، دہ دہ زمیندارِ اطرافِ شہر گرفتند۔ چہ نویسم کہ چہ روزِ سیاہ براین قوم آمد۔ ہزاران عریان[۳] گریہ کنان، از ہر راہے کہ میگذشتند باعثِ عبرت می گشتند۔ مردمِ دیہات حبوب بریان کردہ بہر نفر یک مشت میدادند، و احوالِ آنہارا باحوالِ خود سنجیدہ زبانہا بشکر میکشادند۔ شکستے اینچنین[۴] کم اتّفاق اُفتادہ باشد۔ بسیارے از گرسنگی مُردند و بسیارے از سردیِ ہواجان سپردند۔ فوجے را کہ در قلعہ گذاشتہ رفتہ بودند، از خوفِ دست اندازیِ مردمانِ شاہ[۵] ہنگامِ شب گریختہ[۶] رفت۔ جنسِ کرورہا بدستِ لشکریانِ شاہ و سردارانِ مشرق افتاد، و باہم قسمت شد[۷]۔ توپخانہ، و آلاتِ دیگرِ حرب، و فیل و گاؤ، شتر و اسپ، سوائے نقد و جنس شجاع الدّولہ وغیرہ بپاے خود گرفتند۔ درّانیان کہ فقیرانِ محض بودند، سوارِ دولت گردیدند۔ با ہر دہ باشی[۸] صد شتر بار، بایک نفر دو خروار۔ دولتِ عظیمے[۹] دست بہم داد۔ ہر یک کُلاہ کج نہاد۔ شاہ بعد ازین[۱۰] گونہ فتحے کہ شاہانِ سلف را ہم میسّر نیامدہ باشد با کرّو فرِ تمام داخلِ شہر شدہ، رقمہا بنامِ سردارانِ اطراف و جوانب نوشت[۱۱] کہ بیایند و نوکری نمایند۔ نوشتہ بہ راجا نیز رسید۔ ایشان بگمانِ آنکہ شاہ، بادشاہِ ہندستان شد، و

---

[۱] ن ۱: در ندارد۔
[۲] ن ۱: تہلکہ ہا۔
[۳] ن ۱: و ہزاران گریان۔
[۴] ن ۱: ہم چنین۔
[۵] ن ۱: شاہ ندارد۔
[۶] ن ۱: گریخت۔
[۷] ن ۱: نشد۔
[۸] ن ۱: با ہیزدہ باسی صد۔
[۹] ن ۱: عظمی۔
[۱۰] ن ۱: این گونہ۔
[۱۱] ن ۱: نوشت ندارد۔

ازین ملکِ زرخیز نخواہد رفت، و ما را نوکری[1] باید کرد، رفتند۔ و[2] نجیبُ الدّوله پیشوا آمده بُرد۔ و ملازمتِ شاه، بدستِ شاولی خان وزیرِ اُو نمودند۔ صحبت بآن دستورِ[3] دانشور برآر شد۔ مُہرِ خود حواله کرد، و[4] نیابتِ وزارت داد۔ چنانچه موجبِ رفاهِ اُمرائے عظام گشتند۔

وزیر[5] یکبار گفت که "پدرِ شجاع الدّوله با شما، ته دلی داشت[6] و[7] این با با طفل است، و غیرِ بابائی[8] کارے ندارد، و[9] نمی فهمد که این شاه است، بیک پُشتِ چشم نازک کردن جهانے را برباد میدهد۔ خبر شرط است۔ باد پرانیِ اینگونه بسیار بدماغش میخورد۔ نظر بر رفاقت[10] هیچ نمیگوید، لیکن برین غرّه نباید شد۔

پادشاهان و نکویان دو گروهِ[11] عجب اند
که نبودند و نباشند بفرمانِ کسے

بهتر آنست که شما و نجیب الدّوله رفته، اُورا معقول کنند، وگرنه فردا جُرم از ما نیست۔ رفتند، و اُورا با تیغ و کفن آورده، از وزیر رخصت[12] گرفتند۔ بارے صحبت کوک شد، و کدورت بصفا انجامید، من درین سفر بایشان بودم۔

حکایت[13] روزے پرست زدم۔ راهم بر ویرانهٔ تازه شهر اُفتاد۔ بر هر قدمے گریستم، و عبرت گرفتم، و چون پیشتر رفتم، حیران تر شدم۔ مکانهارا نشناختم۔ دیارے[14] نیافتم، از عمارت آثار[15] ندیدم، از ساکنان خبر نشنیدم۔

از هر که سخن کردم، گفتند که اینجا نیست
از هر که نشان جُستم گفتند که پیدا نیست

---

[1] ن ا: روزگار۔
[2] ن ا: واوَ ندارد۔
[3] ن ا: دستور ندارد۔
[4] ن ا: واوَ ندارد۔
[5] ن ا: چنانچه وزیر۔
[6] ن ا: داشته۔
[7] ن ا: واوَ ندارد۔
[8] مط: غیر بابا۔
[9] ن ا: واوَ ندارد۔
[10] ن ا: برفاقت۔
[11] ن ا: گروهے۔
[12] ن ا: رخصتش۔
[13] ن ا: ندارد۔
[14] ن ا: دیارے۔
[15] ن ا: آثارے۔

خانہا نشسته[1]، دیوارہا شکسته، خانقاه بے صوفی، خرابات بے مست۔ خرابه بود ازین دست تا بآن دست۔

ہر کجا اُفتاده دیدم خشت در ویرانه ای
بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانه ای

بازارہا کجا که بگویم، طفلانِ ته بازار کجا، حسن کو که بپرستم[2]۔ یارانِ زرد رخسار کو۔ جوانانِ رعنا رفتند، پیرانِ پارسا گذشتند، محلہا[3] خراب، کوچہا نایاب، وحشت ہویدا، اُنس ناپیدا۔ رباعیِ اُستادے بیادم آمد:

اُفتاد گذارم چو بویرانهٔ طوس
دیدم چُغدے[4] نشسته برجاے خروس
گفتم: "چه خبر داری ازین ویرانه"؟
گفتا: "خبر اینست که۔ افسوس۔ افسوس"

ناگاه در محلّهٔ رسیدم، که آنجا میماندم۔ صحبت میداشتم۔ شعر میخواندم، عاشقانه می زیستم، شبہا می گریستم۔ عشق با خوش قدان می باختم، ایشاں را بلندی اندا ختم۔ باسلسله مُویان می بودم۔ پرستشِ نکویان مینمودم۔ اگر دمے بے ایشان[5] می نشستم، تمنا بر تمنای شکستم۔ بزم می آراستم۔ خوبان[6] را میخواستم۔ مہمانی میکردم۔ زندگانی میکردم[7]۔ دوست روئے (بنظر) نیامد که باو نفسِ خوش برآرم۔ مخاطبِ صحیحے نیافتم، که صحبت دارم۔ باز ار وحشت گاہے، کوچه بصحرا راہے، اِستادم و بحیرت دیدم۔ مکروهِ بسیارے کشیدم۔ عہد کردم که باز نیایم تا باشم قصد شہر ننمایم۔

سانحه[8] ہرگاه قرار یافت که شاولی خان با راجا برآید، و ملک گیری نماید، فوج شاه که از غنیمت مالا مال بود، بر درِ خانه ہنگامه آرا شده گفتند، که ما بوطنِ[9] خود می رویم اگر شاه[10]

---

[1] ن ا: نشسته ندارد۔
[2] ن ا: بپرسم۔
[3] ن ا: محله‌ہا۔
[4] مط: چندے۔
[5] ن ا: بایشان۔
[6] ن ا: وخوبان۔
[7] ن ا: می نمودم۔
[8] ن ا: ندارد۔
[9] ن ا: بوطن مالوف خود۔
[10] ن ا: شاه ندارد۔

خواسته باشد، بماند. مدّت است که برائے کار[1] برکار سواریم، از زن و فرزند خبر نداریم، شاه چون فکر نمود، دید که بے فوج در ملکِ بیگانه نمیتوانم بوُد. ناچار رفتنِ قندهار، که دارالملکِ اُو بود، مقرّر گردانید. وزیر خیمهٔ برآمده را باز[2] طلبید، و از روے سردارانِ اینجا خجالت کشید. دو روز[3] پیشتر شجاع الدّوله و راجا را مُرخّص کرد. شهزاده جوان بخت را[4] ولیعهدِ شاه عالم نمود[5] و شهر را باختیارِ نجیبُ الدّوله گذاشته، برخاستند[6]. و در راه فوجدارِ سرهند، زَین خان نام افغانی را، که از قوم و قبیلهٔ آنها بود، کرده، به لاهور رفتند.

چون غرورِ این قوم از حد گذشت، غیرتِ الٰهی از دستِ سکّهان ــ که عبارت از ناکسان، و شَعَر بافان، و نَدّافان، و بزّازان، و سمساران، بَدّالان، و نجّاران، و قزّاقان، و مُزارِعان و کم بَغلان، و پاچناریان، و کلل خسپان، و بازاریان[7]، و بے تهان، و بے مایگان، و تهیدستانِ آن نواح باشد ــ ذلیل ساخت. قریب چهل و پنجاه هزار کس گرد آمده، خود را بر روے آن لشکرِ گران کشیدند. گاهے برنگے چهره[8] می شدند که زخمها بر میداشتند و رُو نمی گردانیدند، و گاهے طرف شده، باطراف پریشان گردیده[9]، صَد دو صَد را بدنبال می بُردند و میکشتند. هر صبح گردِ فتنه می انگیختند. هر شام از چار سُو میریختند. لشکریان را سگانِ روے یخ ساخته بُودند. یخ بسیار آب می گشت، تا فرار مینمودند[10]. گاهے سفید می شدند، و بَر بَهیر و بُنه[11] می اُفتادند. گاهے سیاهی مینمودند و می ایستادند، و بشهر[12] می ریختند، و سنگ به سنگ میزدند. مُو پریشان و سَر پیچدار، در اُردو میشدند. شب شر و شور. روز عر و کور. پیادهٔ آنها شمشیر بَر سوار زدے، و قدحِ زین را خونریز کردے. دست کشِ شان قدر انداز را گرفته بُردے[13] و شست آویز نمودے. غرضکه این بے ناموسانِ بے دَولت، آن[14] بے-

---

[1] ن ۲: کارِ او.
[2] ن ۱: باز ندارد.
[3] ن ۱: و در روز.
[4] ن ۱: را ندارد.
[5] ن ۱: نمود ندارد.
[6] مط: برخواستند.
[7] ن ۱: و بازاریان ندارد.
[8] ن ۱: چهره با.
[9] ن ۲: نگردیده.
[10] ن ۱: "تا فرار می نمودند" ندارد.
[11] ن ۱: بهر سهر و بر. مط: بهیر و نبر.
[12] ن ۱: بشر.
[13] ن ۱: بردے شست آویز.
[14] ن ۱: آن ندارد.

حقیقتان[۱] را آنقدر رُسوا ساختند[۲] کہ سردارانِ اطراف این[۳] صحبت[۴] را شنیدہ، از نظر با انداختند۔ مقاومت بواقعی نتوانستند، سلامت رفتنِ خود غنیمت دانستند۔ آخر سراپاے نظامتِ آن شہر بہ[۵] ہندوے دادہ، راہِ پیش گرفتند۔ این انبوہ دُنبالہ گردان غارت کُنان، سرگلہ زنان تا آبِ اٹک رفت و شُست و شُوے خُوبے دادہ، متصرفِ آن صوبہ، کہ دُو کرور روپیہ حاصل داشت، شد[۶]۔ بعد از چندے، آن ہندوے خون گرفتہ شہر نشین را کُشتہ، مالک گشتند۔ چون وارثے درمیان[۷] نبود، آن عوام کالاَنعام، مُلک را باہم قسمت نمودند، و برروے رعایا درِ احسان کشودند۔ یعنی آگاہِ رسمِ مُلک داری نبودند[۸]، ہر چہ مُزارعان دست برداشتہ دادند، مُفتِ خود[۹] شمردہ گرفتند۔

سانحہ[۱۰] | درہمین سال، سورج مل، کہ زمیندارِ زور آورے است، آبا و اجدادِ اوُ ہمیشہ مُوردِ عنایاتِ[۱۱] بادشاہانِ اُولوالعزم ماندہ اند، در حالتے کہ خبر بود، راہداری[۱۲] مابینِ اکبرآباد و شاہجہان آباد باوُ تعلّق داشت۔ درین ایام، از سستیِ رُؤسارِ اسلام، سرے کشید و متصرفِ اکثر محالات گردید۔ بسبب حرام توشگیِ قلعہ دار سیہ روزگار، حصنِ حصینِ اکبرآباد گرفت۔ شاہ عالم بتحریکِ شجاع الدولہ، کہ حالا وزیرِ اوُست، بالشکرِ بے شمار حرکت کرد[۱۳]۔ زبان زدِ خلق شد کہ برائے اِخراجِ سُورج مل می آید۔ زمیندارِ مذکور، جہتِ مُحافظتِ شہر و حصارِ مسطور، از قلعہ جاتِ خود رفتہ، بارادۂ پرخاش نشست، و بہ راجا نوشت کہ آمدنِ شما مناسب تَراست۔ ایشان، کہ آشنا از چوبِ خشک می تَراشیدند، میاندار فرستادہ آن انبوہ را باز گردانیدند۔

من باین تقریب، بعد سیٔ سال، بہ اکبرآباد رفتم، و زیارتِ مزاراتِ پدر و عمِّ بزرگوار

---

[۱] ن ۱: بےحقیقتانِ بے مروت۔ [۲] ن ۱: ساختہ۔ [۳] ن ۱: این ندارد۔
[۴] مط: این صحبت (تصحیح از مرتب)۔ [۵] ن ۱: بہ ندارد۔ [۶] ن ۱: شد ندارد۔
[۷] ن ۱: درمیان ندارد۔ [۸] ن ۱: می نمودند۔ [۹] ن ۱: منّت بر خود شمردہ می گرفتند۔
[۱۰] ن ۱: سانحہ ندارد۔ [۱۱] ن ۱: عتاب۔ [۱۲] ن ۱: و راہداری۔ [۱۳] ن ۱: نمود۔

کردم۔ شعرائے آنجا، مرا بسر آمدِ این فن دانسته اکثر ملاقات میکردند۔

حکایت[1] | آوازهٔ عالمے شُنیدم ۔ رفتم و دیدم مُلّاے[2] قشری برآمد۔ یعنی بمغزِ سُخن نمی رسید۔ هنوز نفس درست نکرده بودم، که از بے تہی سخن سر کرد[3] که اکثر جوانانِ این عهد رافضی[4] می باشند، و در حقِّ بزرگان، "از[5] سقیفه سازی، چہا که نمی تراشند۔ این تسبیحِ خاکِ امامِ شما که مُوجبِ غُبارِ خاطرِ ما صَفا پیشگان است ــــ دلیل است که شما مَیل برِفض[6] دارید۔ اگر در واقع چنین است، مرا بحالِ من واگذارید۔" گفتم که "مَرا نیز همین تردُّد بُود۔ الحمدلله که صاحب سُنّی برآمدند۔" مغزِ خر خورده، کنایه نفهمید و بسیار خوش گردید۔ چون مرا موافق یافت، پَر و پوچِ چندے بافت ۔ بے مزه تر شُدم، و برخاسته آمدم۔

حکایت[7] | صبح و شام بر لبِ دریا که بسیار بخوبی واقع است ــــ آن طرف باغات و این طرف قلعه، و حویلی هائے اُمَراءِ عظام، گوئی که نهرِ بهشتی است ــــ میرفتم و چشم آب میدادم۔ شورِ بکر تراشیِ من آفاق را گرفته بود، بکر نگاهان[8]، مژگان سیاهان، خوش ترکیبان، جامه زیبان، پاکیزه طینتان، موزوں طبیعتان، مرا نمی گذاشتند، و بعزّت می داشتند۔ دو سه بار سراسرِ شهر رفتم۔ علماء، فقراء، و شعراءِ آنجا را دیدم۔ مخاطَبے که از دلِ بیتاب تسلّی شود نیافتم۔ گفتم: "سُبحان الله۔ این آن[9] شهریست که هر بَرزنِ اُو عارفے، کاملے، فاضلے[10]، شاعرے، منشیے، دانشمندے[11]، فقیهے، مُتکلّمے، حکیمے، صُوفیے، مُحدّثے، مُدرّسے، درویشے، مُتوکّلے، شیخے، مُلّائے، حافظے، قاریے، اِمامے، مُوذّنے، مدرسۀ، مسجدے، خانقاهے، تکیۀ، مهمان سرائے، مکانے، باغے، داشت۔" اکنون جائے نمی بینم که در وُشاد کام نشینم۔ آدمی بهم نمیرسد، که با اُو صحبت گُزینم۔ خرابۀ وحشت ناکے دیدم۔ رنجے کشیدم و بَر گردیدم۔ مدّت چار ماه ازین قرار در وطنِ

---

[1] ن ا: ندارد۔ [2] ن ا: ملائے دیدم۔ [3] ن ا: سرکرده۔

[4] ن ا: راجزی۔ [5] ن ا: براز۔ [6] ن ا: برجز۔

[7] ن ا: ندارد۔ [8] ن ا: تیزنگاهان۔ [9] ن ا: این همان شهراست۔

[10] ن ا: عالمے، فاضلے۔ [11] ن ا: دانشورے۔

مألوف گذرانیده، وقتِ رفتن آبِ حسرت بچشم گردانیدم، و به قلعه جاتِ سُورج مل رسیدم۔

سانحه[1] آنجا[2] آمده شنیدم که با[3] قاسم علی خان ناظمِ بنگاله، و نصرانیانِ تجارت پیشه — که آنجا از مدت سکونت داشتند — جنگ واقع شُد۔ رعایا و زمینداران آن مُلک، از ستم و جورِ بے نهایتش بجان آمده بُودند، جانبِ اُو نگرفتند۔ پایانِ کار هزیمت خورده[4]، بالشکرِ شکسته و زر و[5] جواهر و اَقمِشه و اَمتِعهٔ بسیار، به عظیم آباد — که این صُوبه هم بَاُو بُود — آمد۔ فرنگیان نیز در رَسیدند۔ خواست که شهر بند شوَد، و بجنگد، لشکرش پُشت داد۔ باز[6] شکست اُفتاد۔ مال و اسبابِ خود را بار نموده، با نُه دَه هزار[7] کس بسرحدِ شجاع الدّوله رسید۔ آنها بالفعل دست برداشتند و قدم پیش نگذاشتند۔ وقتیکه مُتّصلِ بنارس رسید، خیمه کرده[8]، بوزیر نوشت که من بامیدِ اعانت شُما آمده ام۔ اگر سرِ دستے بمن بگیرند، و بجنگِ نصرانیانِ مخالفِ مذهب در آیند، خرچ سپاه و مُلازمانِ حُضور مُتصدّیانِ من سَرانجام نمایند۔" ایشان نوشتند که "اوّل شُما بیایید[10] و ملازمت بادشاه نمایید[11]۔ آنچه بحضُور قرار خواهد یافت[12]، موافقِ آن بعمل خواهد آمد۔" آن فلک کردهٔ آسمانِ غدّار نا آگاه از تهِ کار، مع اسباب و آلات[13] و پانصد فیل، باعتمادِ خام دستانِ چند که واسطه بودند، از آبِ آن رُودخانه که زیرِ شهرِ مذکور واقع است، گذشته، داخلِ لشکر شد۔ و دایره کرد۔ نظر تنگ چشمانِ اینطرف بر اَسبابِ بادشاهانهٔ اُو اُفتاد۔ چشم سیاه کردند، و کهنه فعلهٔ چند فرستاده بفریب و غدر محبُوسَش ساختند۔ بعد از دو سه روز از زرِ بسته و خُرده و جواهر و اَجناسِ دیگر و اَسپ و فیل و گاو و شتر[14] و خیمه و فَرش هر چه داشت، وزیر بگفتهٔ آن[15] نا مآل اندیشان پیشِ اُو هیچ نگذاشت۔ بدعهدان که درمیان بودند، نظر به عهدنامه نداشتند۔

---

[1] ن ا: ندارد۔
[2] ن ا: این جا۔
[3] ن ا: با ندارد۔
[4] ن ا: خوردد۔
[5] ن ا: زیور و جواهر۔
[6] ن ا: باز ندارد۔
[7] ن ا: نموده، هزار کس بسرحد۔
[8] ن ا: کرد۔
[9] ن ا: برآیند۔
[10] ن ا: بیایند۔
[11] ن ا: نمایند۔
[12] ن ا: قرار یابد۔
[13] ن ا: آلات و اسباب۔
[14] ن ۲: اشتر۔
[15] مط: آن ندارد۔

چون خامهٔ سیه رُو دندان بحرفِ خود گذاشتند- آمده بود که کسے دستِ اُو خواهد گرفت، اینجا انگشتر پاشُد- چون انگشت از ستمِ روزگار برآورد، و حلقه بر درِ وزیر زد، یومیه[1] از سرکارِ بیگم — که عبارت[2] از مادرِ شجاع الدّوله باشد — برائے اُو مقرّر شد- باقی داستان بفردا شب میگذارم، که افسانهٔ دیگر بر زبان دارم-

سانحه[3] | جواہر سنگھ که پسرِ کلانِ سُورج مل، که سردارِ جگر داریست، از مدّت خیالِ ریاست در سر دارد- چنانچه پیش ازین با پدر درآویخته خونِ بسیارے[4] ریخته بود، و دو سه زخمِ دامن دار برداشت- درین ایّام به فرّخ نگر — که سه منزلی شاهجهان آباد شهریست[5] بسمتِ مغرب، و سرحدِ آن بسرحدِ ملکِ پدرِ اُو پیوسته است — رفت، و با زمیندارِ آنجا — که پدرش فوجداریِ گردِ شهر[6] دہلی میکرد — آویزشے نمود، و طول داد- اُو نیز سر فرود نیاورده، در اُفتاد- چون دُو[7] ماه برین گذشت سُورج مل با فوجِ سنگین قصدِ آنطرف نمود[8]- بخانهٔ راجا برائے رخصت آمد- ایشان گفتند که "شما ازینهار نروید- مبادا باعثِ فتنه و هنگامه شوید- آنجا نجیب الدّوله هم قریب است، اگر مراعاتِ اسلام کند، جنگ بمیان آید- معهذا طرفِ ثانی قلعه دارد[9]، و صاحبِ اُلوش[10] است- اگر سماجت نماید[11]، و دیر شود عظم[12] شان شما نماند- در آدابِ ریاست نوشته اند، که تا کار[13] از نفر برآید، باید که به پسر نفرماید- و تا از پسر شود، خود نرود-" خاصهٔ انسان است[14] که چون وعده قریب میشود حرفِ معقول نمی شنود- گوش بر حرفِ ایشان ننهاده انداخت- رفت و رئیسِ آنجا را اسیر ساخت- سپاهیان دستِ تعدّی دراز نموده، خانهائے شُرفاے آنجا را بغارت بُردند- برادرانش که با نجیبُ الدّوله بُودند، دستارها بر زمین زدند

---

[1] ن ا: یومیه ندارد-
[2] ن ا: که عبادت از قام- مط: عبارت از نام شجاع الدّوله (تصحیحِ قیاسی از مُرتّب)-
[3] ن ا: ندارد-
[4] ن ا: بسیارے را-
[5] ن ا: شاهجهان آباد است-
[6] ن ا: فوجداریِ شهر مذکور-
[7] ن ا: دو ندارد-
[8] ن ا: نموده-
[9] ن ا: قلعه وارد-
[10] مط: الوس-
[11] ن ا: نمایند-
[12] مط: عظیم-
[13] ن ا: کار ندارد-
[14] مط: خاصه آنست (تصحیح از ن ا)-

و بیطاقتی نمودند۔ اُو برائے خاطرِ آنہا ملتجی شُد کہ ایشان بسزائے کردہٗ خود رسیدند، اکنون از سرِ تقصیر باید گذشت۔" نشنید[1] و دیرانہ بشاہجہان آباد رفت۔ اُو بدرِ تغافل زدہ، دروازہ ہائے شہر را بند نمود[2]، و سر بر نکرد۔ این بر خود چیدہ (و) متکبر[3] از آبِ دریا گذشتہ، بر سرش دوید و مُوجبِ آشوب گردید۔ در آدمی گیری[4] اُو شبہ نیست۔ صد بار پیغام داد، کہ من با شما سرِ پرخاش ندارم، لہذا فوج[5] خود را برنمی آرم۔ غُربائے شہر تصدیع میکشند۔ دائرہ کردن اینجا مناسب نیست۔" یک جوابِ آدمیانہ نداد، و بسفاہت گفتہ فرستاد کہ "من فوجِ نوّاب را دیدہ خواہم رفت۔ اگر زُود برآیند احسان[6] است کہ کارہائے دیگر در پیش[7] دارم، وگرنہ فوجے[8] کہ در اختیارِ من نیست صبح و شام بشہرمی تازد۔" آن سردار گفت کہ "البتہ صبح برمی آییم و شانِ[9] فوجِ خود می نمائیم۔"

نقل[10] شخصیکہ درمیان بود، بمن میگفت کہ دلِ شب فوج را رخصتِ عبورِ دریا داد، و خود واکشید، و بعد از ساعتے چشم کشاد[11] و گفت کہ: "عجب واقعہ[12] دیدہ ام" گفتند: "چطور[13] است؟" گفت "کُلاغے بر درختے نشستہ است، و زاغان بسیار برو گرد آمدہ، شورے دارند۔ منکہ ازان راہ گذشتم، بیک تیرش بر خاک انداختم۔ زاغان کشتہٗ اُو را دیدہ ہمہ یکبارگی پریدند۔ غالب کہ فتح از من است۔ اِن شاءَ اللہ صبح سوار میشوم و این سیاہ درونان را می کُشم۔"

چون صبح دمید، آسمان تیغِ حادثہ بچرخ کشید۔ جارچیان جار[14] زدند۔ خود بر فیل نشستہ، از آب گذشت و باستقلالِ تمام مُقابل گشت۔ حریف چون گاوِ چہار پہلو بر خود شکستہ،

---

[1] مط: نشنید۔
[2] ن ۱: نمودہ۔
[3] ن ۱: برخود چیدہ منکر۔
[4] ن ۱: آدم گری۔
[5] ن ۱: از افواج۔
[6] ن ۱: آنست۔
[7] ن ۱: نیز پیش دارم۔
[8] ن ۱: فوج
[9] ن ۲ و مط: سان فوج۔
[10] ن ۱: ندارد۔
[11] ن ۱: کشادہ گفت۔
[12] ن ۱: واقعہ عجبی۔
[13] ن ۱: است ندارد۔
[14] ن ۱: اخیار زدند۔

دخرِ خود را دراز بسته، صفوفِ فوج بَر رُوے ایشاں کشید۔ تفنگچیان گرمِ انداختنِ تفنگ آزموده کاران، نظر بَر اُسلوبِ جنگ۔ سردارِ اینطرف آماده کَین استاده بود، وپا از وضع[1] خود بیرون نمیگذاشت۔ رَئیس[2] آن طرف دامن بالا زَده، خودکُشی مینمود، ودست از شوخی برنَمی داشت۔

هرگاه روهیله ها سرگرمِ دو تیغه بازی شُدند، اُو در دسته خود را پنهان ساخت وبالا بالا رفته، غافل ازین که اَجلِ چیرهٔ[3] دست درکَمین است[4]، بر سپاهے که بسمتِ[5] شهر بود، زد۔ شورے بَرخاست۔ رُوداران قلب[6] بمددِ آنها شتافته، این بلا را برچیدند۔ درهمان گرد وغبار، آن اجل رسیده زخمے برداشت که از اسپ بَرخاک اُفتاد، وجامه گذاشت۔ اَمّا کسے ندانست که این سُورج مل است۔ باهم میگفتند: "وقتیکه اُو سمند را جلو خواهد داد، قیامت در جلوِ[7] اُو خواهد بُود۔" ندانستند[8] که جماعت درازِ بَسْت از پیش جنگی خود را کُشتن داده است۔ ازانوقت تا شام باز جنگ بمیان نیامد۔ آنجا کار تمام شد، واینجا هراسان که شب اُفتاده است، مبادا شب خون زنند، ومارا برخاکِ هلاک افگنند۔ بعدِ شام فوجے[9] که روبرو شده[10] بود، پَراگنده شد، ورفت۔ تا نصفِ شب مُهیّاے کار، براَسپ وفیل سوار استاده ماندند۔ اَمّا همه متأمّل که چه بَلاست، ازانطرف صداۓ برنمی خیزد۔ نشود که فوجِ حریف غافل بریزَد، وقیامت بَرانگیزَد۔ جاسُوسان از لشکر برآمده دو سه کروه اینطرف آنطرف کافتند[11]۔ اَحدے را نیافتند۔ قریب بشکستنِ شب آمده گفتند که از مردمِ دیهات شنیده شد که جماعتے بسَراسیمگی می رفت ومی گُفت: "افسوس[12] سردارے چون

---

[1] ن ۱: ازصلح۔
[2] ن ۱: رَئیسی۔
[3] ن ۱: خیره۔
[4] ن ۱: داشت۔
[5] ن ۱: سمت۔
[6] ن ۱: قبله۔
[7] ن ۱: جلوه
[8] ن ۱: دانستند۔
[9] سط: فوجے روبرو۔
[10] ن ۱: شده ندارد۔
[11] ن ۱: کرتافتند۔
[12] ن ۱: افسوس کہ۔

سورج مل کشته شود و ما همرو تان[1] لاشِ اُو را بر خاکِ میدان گذاشته از ترسِ جان بردیم۔"
ازینجا بظهوری پیوندد که اُو در شورشِ آخر روز که به فوجِ التمش بود، کشته شد و لشکرش
گریخته رفت۔

درین گفتگو بودند که صبح سفید شد، و[2] سوارے دستِ بُریدهٔ آورد[3] و[4] گفت که "این
دست، آن دستِ خشک شُدهٔ اُوست که جراحت داشت۔" دیگران نیز شناختند و
کوسِ شادی نواختند۔ د[5] چون بیقین پیوست، قدم بتعاقب کُشادند و دنبالِ گریختگان
اُفتادند اگر از دریا می گذشتند، باعثِ خرابیِ جهانے می گشتند۔ امّا راجا نوشت که نوّاب
این دولت را، که عبارت از چنین فتح است، از صحرا یافته، باید که غنیمت بداند[6] و عنان
بگرداند۔ اینجا انبوهِ بسیار است، اگر ایستادگی نمایند، باز کار دشوار است۔" رأے درستے و
قلبِ سلیمے داشت۔ نوشتهٔ ایشان را دید، د[7] برگردید۔

جواهر سنگھ، که از استماعِ این خبر جان در تن نداشت، و بظاهر خود را بسمار دوخته
قائم بود، آمد و بر مسندِ ریاست نشسته در فکرِ گرد آوردنِ لشکر اُفتاد۔ در همت و شجاعت و
مروت صد مرتبه از پدرِ خود بهتر است۔ "دولت نه بهد خدائے کس را بغلط۔"

حقیقتِ حال لشکرِ بادشاه و وزیر

سانحه[8] حال آنکه شجاع الدوله، بگفتهٔ ناکسان و ناتجربه کارانِ چند، که در مزاجش تصرف
داشتند، بطمعِ صوبهٔ عظیم آباد، که اگر بیک تک تگ[9] پا بدست بیاید، مُفت است،
شاه عالم را با خود گرفته، لشکر بآن صوب کشید۔ کشیشِ عیسائیان، یعنی سردارِ فرنگیان[10]،
شهر را محکم کرده، نوشت که "سر بر سر کسے[11] که داشتیم، اُو را زدیم، و ازین ملک برآوردیم۔ با

---

[1] ن۱: همراهان۔ [2] ن۱: واوَ ندارد۔ [3] ن۱: آورده۔ [4] ن۱: واوَ ندارد۔
[5] ن۱: شمارد۔ [6] ن۱: بگرداند۔ [7] ن۱: و بفرخ نگر برگردید۔ [8] ن۱: ندارد۔
[9] ن۲: تگ و دو۔ [10] ن۱: [یعنی سردار فرنگیان] ندارد۔ [11] ن۱: بر سرکشی که داشتم۔

نوّاب و بادشاه کارے نداریم۔ سبب این حرکت معلوم نمی شود که چیست۔ و محرّکِ سلسلۂ فتنہ[1] و فسادکیست۔ اگر انقیاد منظور است مامُطیع و منقادیم، حاجت بکشیدنِ این رنج بے فائدہ نیست۔ وگر استیصالِ مابگفتۂ نوکیسگانِ نافهم، مقصود است گذر نداریم۔ مزاجِ بزرگان حکمِ سَیلِ تُند دارد۔ بهر جانب که رُو می آرد، می آرد۔ ماخسان را چه سَروسامان که سدِّ راه توانیم شُد۔ طبیعتِ سرداران را ببادِ صرصر نسبت میکنند، ماکه مُشتِ خاکیم چه ساز و برگ داریم که راه بَر توانیم گرفت۔،، نامعامله فهمانِ حضور، که بے بهره از شعور بودند، نوشتن بادمکری[2] آنهارا، محمول بر بددلی نموده، باصرار باعثِ کوچ شدند۔

هرگاه تلاقیِ[3] فریقین درظاهرِ آن شهر دست بهم[4] داد فرنگیان بندوقها گرفته درآویختند۔ مُغلانِ غیرت بحرام، برخزانۂ آقا[5] ریختند۔ نصرانیان قدمِ جرأت پیش گذاشتند۔ عیسیٰ نام چیلۂ نوّاب، جسارتے کرد و جان داد۔ بادشاه چون تماشائیان ایستاده ماند۔ شکست اُفتادَ نوّاب که بطرفے از اَطراف[6] می جنگید، توقّف مصلحت ندیده، بامعدودے راهِ صوبه پیش گرفت۔ [مسافتِ بعید را بیک نیم روزے طے نموده، بمقرِّ خود رسید۔ ازانجا نقد و جنس و ناموس][7] بضرورت برآورده، روانۂ فرّخ آباد شد۔

اگرچه این عالم دارالجزا نیست، امّا گاہے چنین هم اتّفاق می اُفتد[8] که[9] این شکست فاحش بر این چنین لشکرِ گران، کیفرِ آن بود که به قاسم علی خان کرده بودند۔

آنجا نصرانیان مُتصرّفِ خیمه ها و آلاتِ حرب وغیره گشته[10]، بادشاه را باخود گرفتند، و بآرمیدگی عازمِ اینطرف شدند۔ درعرصۂ هشت[11] هفت روز به "اوده" که دارالقرارِ شجاع الدوله باشد، آمده، بشکرانۂ این فتح که فوقِ تصوّرِ آنها بود، مجوّزِ آزارِ احدے

---

[1] ن ۱: فتنه ندارد۔ [2] ن ۱: بادیکری۔ [3] ن ۱: تلانی۔ [4] ن ۱: هم دست داد۔

[5] این عبارت مغشوش است۔ "برخزانۂ آن ریختند" یا "برخزانه اش" یا "برخزانۂ" می باید۔ (مرتّب)

[6] ن ۲: اطراف شهر۔ [7] عبارت بین القوسین نسخۂ رامپور ندارد۔ [8] ن ۱: شود۔

[9] ن ۱: که ندارد۔ [10] ن ۱: گشتند۔ [11] ن ۱: هشت ندارد۔

نگشتند. بعد از هفتهٔ، بادشاه را دو لک روپیه ماهیانه کرده، به اله آباد رخصت کردند[1]
که حضرتِ بطورِ خود باشند. ما دانیم و مُلک.

سانحه[2] | در خلالِ همین حال، جواهر سنگه با لشکرِ جرار[3]، و ملهار که احوالِ او نوشته آمد، بدعویِ خونِ پدر، بر نجیب الدوله رفته، به دهلی چسپیده بود. خلقے از گرانیِ غلّه بجان آمد. قتل و قتال، جنگ و جدال، قریب دو ماه ماند. عماد الملک که[4] در فکرِ کناره کردن بود، مع ناموس از قلعه[5] برآمده، مردمان زائد را بفرخ آباد فرستاد، [وخود شریکِ جواهر سنگه شد. ــــ آخر از آمد آمدِ شاه،[6]] که درین سال تا شاه آباد آمد، و از[7] تشویشِ سِکهان بے سر و پا برگشت، مسوده ها همه[8] باطل شدند، و آن جنگ به صُلح انجامید. عماد الملک با ملهار[9] پیشِ احمد خان بنگش، که ربطِ درستے داشت، رفت و جواهر سنگه بملکِ خود آمده، بکارهاے دیگر پرداخت. سرداران عهدِ پدر، که بخاطرش[10] نمی آوردند، بعضے را کُشت، و بعضے را مُقیّد ساخت.

نواب عماد الملک باین سِن[11] یگانهٔ عصر است. اُوصافِ[12] بسیار دارد. چنانچه پنج شش خط بخوبی مینویسد. شعرِ ریخته و فارسی هر دو بامزه میگوید. بحالِ فقیر عنایتے بیش از بیش میکند. هرگاه بخدمتِ شریفِ او حاضر شده ام حظّے بر داشته[13].

سانحه[14] | تبیینِ مقال احوالِ شجاع الدوله آنکه[15] ــ بامیدِ حمایتِ کسان که[16] به فرخ آباد رحلِ اقامت افگنده بود[17]، از انها غیرِ[18] شماتت و بے مُروتی ندید. ناچار[19] با ملهار[20] که احوالِ اُو سابق مذکور شد، طرحِ سُلوک انداخته انبوهے گِرد آورد، و بجنگِ فرنگیان بُرد.

۱ه ن ۱: دادند. ۲ه ن ۱: ندارد. ۳ه مط و ن ۱: لشکرِ غدار و (تصحیح قیاسی از مرتب).
۴ه ن ۱: که ندارد. ۵ه ن ۱: از بهرت پور برآمده. ۶ه ن ۱: الفاظ عبارت بین القوسین مقدّم و موخر گشته.
۷ه ن ۱: وچون شاه از. ۸ه ن ۱: مسوده باے. ۹ه ن ۱: بایکبار. ۱۰ه ن ۱: بخاطر.
۱۱ه ن ۱: سِن کم. ۱۲ه ن ۱ و ن ۲: اوصاف حمیده. ۱۳ه ن ۱: برداشته ام. ۱۴ه ن ۱: ندارد.
۱۵ه ن ۱: این که. ۱۶ه ن ۱: کسانیکه. ۱۷ه ن ۱: رحلت اقامت بفرخ آباد افگنده.
۱۸ه ن ۱: غیر از. ۱۹ه ن ۱: خفت و ذلت بسیارے کشید ناچار. ۲۰ه ن ۱: رسید که احوالِ او.

چون مقابلهٔ فئتین شد، بادلیجها از طرفین انداختن گرفتند[1]۔ دسته‌ہاے فوجِ دکن، براے نمودِ جرأتِ خود، بروے[2] توپخانه رفته، نیزه بازی نمودند، و دستِ خونریز کشودند۔ عیسائیان از سنگر باہستگی برآمده، توپ اندازان[3] بوضعے در آمدند که چشمِ دکھنیان ترسید، و تُرکی تمام گردید۔ آنچنان دست و پاگم کرده گریختند، که گوئی درمیان نبودند۔ در دو سه روز به گوالیار، که سه[4] منزلی اکبرآباد شهریست، حاکم نشین، و در تصرفِ آنها بود —— رسیدند[5]۔ و حالِ شکستهٔ خود را درچند روز درست کرده آمادهٔ جنگِ جواہر سنگھ شدند۔ آنجا دعوی شجاع الدوله قطع شد۔ راضی بمرگ بوده، تن تنها پیشِ فرنگیان رفت۔ آنها رُو از او گرفته، دست از همه چیز برداشتند، و صوبجات را بطورِ او گذاشته، به عظیم آباد رفتند۔

هرگاه رفعِ حجاب[6] شد، باز خلعتِ وزارت پوشیده، خلع العِذار، بدار القرارِ خود، که اوده باشد، آمد و نشست۔

سانحه[7] | اینجا دکھنیانِ تیره روزگار، با فوجِ بسیار، به سرحدِ جواہر سنگھ آمده، اکثرِ دیهات را تاختند، و خراب ساختند۔ جواہر سنگھ، که دلاورِ مقرر ایست، از قلعه جات برآمده، ہشت نُه هزار سوار سکھان، که دران ایّام دران[8] ضلع آمده بودند، نوکر کرده، رفت[9] و چهره شد۔ هنگامیکه جنگ بهم پیوست، آن مُدبِران رُو باختند[10]، و ایشان بسر و نهیب پرداختند۔ چنانچه قریب پانصد کس با سردارے اسیر کرده آوردند، و عرض[11] سپاهی گریِ آنها بُردند۔ چون ملهار مرد، رُو دارے بود، شکست بر شکست خورد، از فرطِ اندوه و غم سه چار منزل رفته، مُرد۔

بهمین[12] نزدیکی، رگھناتھ راؤ که سردارِ مقرری دکھنیان است، بافوجِ کثیر رسیده، بیکے از زمینداران آنطرف سرحدِ جواہر سنگھ چسپید۔ و[13] موجبِ فتنهٔ آن مُلک گردید۔ زمیندار

---

۱ مط: اندافتند۔ ۲ ن ۱: بر روے۔ ۳ ن ۱: بودند ازان بوضعی۔ ۴ ن ۱: سه ندارد۔

۵ ن ۱: رسید۔ ۶ ن ۱: بادشاه و او۔ ن ۲: بادشاه و وزیر۔ ۷ ن ۱: ندارد۔

۸ ن ۱: درین۔ ۹ ن ۱: گرفت۔ ۱۰ ن ۱: روتاختند۔

۱۱ ن ۱: غرض۔ ۱۲ ن ۱: همین۔ ۱۳ ن ۱: واو ندارد۔

مذکور، بایشان رفتگی داشت، نوشت که اگر دکھنیان مرا پایمال ساختند، یقینِ خاطر[1] باشد که بملکِ شما هم دستِ تصرّف دراز خواهند کرد۔ آمدن بسرحدِ[2] خود من[3] از واجبات است، و صَرفهٔ من نیز درین است۔ این جوانِ فراخ دامان، بالشکرِ بے پایان رفته، این طرفِ چنبل که رودخانهٔ مشهور است[4]، دائره کرد۔ دکھنیان دُودِله شُده، طرحِ یکدلی انداختند۔ هنوز هر دُو لشکر محاذی بودند که خبرِ آمدنِ شاه شائع گشت۔ سَرانِ دکهن، که از نامِ او آب می تافتند، جگر درباخته[5] رهگرائے اَوطانِ خود گشتند، و بشکستنِ قیدِ اُساری که در جنگِ مَلهار بگیر آمده بُودند، صلح نمودند[6]۔ این عزیز ببعضے نمک بحرامان را، که با دکھنیان درساخته چیها که نمی گفتند، گوشمال بواجبی داده باکبرآباد آمد۔

راجا از قلعه جات برائے ملاقاتِ او رفت۔ مرا زیارتِ مُشتِ خاک پدر و عَمِ بزرگوار باین تقریب[7] باز میسّر آمد۔ همگی پانزده روز آنجا مانده[8]، عنان باینطرف[9] بگردانند۔

این بار هم، شاه دُرّانی تا[10] اینطرفِ ستلج، که رودِ معروف[11] است، از دستِ[12] سکھانِ پا در هوا، خرابیها کشید و برگشت۔

سانحه[13] | در ینولا، جواهر سنگھ را، با راجا مادهو سنگھ پسرِ جے سنگھ، بر امرے از اُموراتِ زمینداری ناخوشی شد، و رفته رفته به نزاع[14] کشید۔ این جوان جَری بخرابیِ مُلکِ اُو کمر بسته، در ظاهر ببهانهٔ ملاقاتِ راجا بِجے سنگھ، پسرِ بخت سنگھ، که احوالِ[15] اُو رقم زدهٔ کلکِ سحر طراز گردیده[16]، بر بَهکر[17] که آبگیرِ کلانیست، غیرتِ بُحیره[18]، و هُنُودان غسلِ آنجا را عبادت

---

[1] ن ا: خاطر ندارد۔ [2] ن ا: پسر خود۔ [3] ن ا: من ندارد۔
[4] ن ا: ایست مشهور۔ [5] ن ا: دریافته [6] ن ا: صلح نمودند ندارد۔
[7] مط: تقریر۔ [8] ن ا: ماندند۔ [9] مط: عنان آن طرف بگرداند (تصحیح از ن ا)۔
[10] ن ا: تا ندارد۔ [11] ن ا: معروفے است۔ [12] ن ا: دست ندارد۔
[13] ن ا: ندارد۔ [14] مط: بتنزع۔ [15] ن ا: احوالش۔
[16] ن ا: گردید۔ [17] ن ا: سنکر۔ [18] ن ا: الوه۔

میدانند، رفت و در راه اکثر قریات را بخاک برابر ساخت - بجے سنگھ اگرچه جوان بود لیکن رأے صائبے داشت - آمده برخورد، و واسطهٔ صُلح شد - عهد[۱] و پیمان بمیان آمد [رائے بهادر سنگھ پسرِ کلانِ راجا که جوانِ بجرأت و همت آشناست، درین سفر به جواهر سنگھ به تقریبِ غسلِ آن آبگیر رفته بود، چون ازان جا بَرگشتند][۲] - چون جواهر سنگھ برگشت، سردارانِ راجا مادهو سنگھ نقضِ عهد نموده، آمادهٔ پیکار شدند[۳] - تا دو پهر جنگِ تیر و تفنگ ماند[۴]، آخر راجپوتانِ جهالت کیش از اسپان فرود آمده، دست بشمشیرها[۵] زدند - پاے ثباتِ[۶] اکثرے ازجا رفت - این جوانِ دلاور[۷] دادِ جوان مردی داده، این چنین بلاے صَعب را برچیده[۸]، چون شام اُفتاد، بر هر[۹] دو لشکر شکست اُفتاد - آتش تیزِ کین از هر دو سو زبانه کش است، و رعایا مثلِ خس و خاشاک میسوزد - باید دید که از پردهٔ غیب چه بظهور[۱۰] میرسد -

سانحه[۱۱] | چون جواهر سنگھ به قلعه جات آمد[۱۲] و نشست - فوجِ راجپوتانِ بخیرگی تمام دستِ تاراج بدیهاتِ نواح دراز کردند، و باستظهارِ دکهنیان آبادیها را خراب نمودند - درین ایام انبوهے از سکهان، آنطرف آبِ جون بُود - رئیسِ اینطرف بآنها مُستظهر[۱۳] شده طرف گشت - کُشت و خون بمیان آمد - عالمے تلف گشت - آخر فوجِ حریف را از ملکِ خود بدر کرده[۱۴]، سردارانِ سکهان را بر روے اُو دوانید[۱۵]، و رفتنِ خود مصلحت ندید - این قومِ دغل بآنها[۱۶] درساخت و باین سردار بد باخت - هرگاه بدعهدیِ این بے سر و پایان دید، کار بسیار به بیمزگی کشید در همین حال، اقبال یاوری کرد، که راجا مادهو سنگھ بسببِ

---

۱ مط: عهد پیمان ن ۱: عهد ندارد۔
۲ عبارت بین القوسین در نسخه ۲ زیاد شده است۔
۳ ن ۱: گشتند۔
۴ ن ۱: درمیان ماند۔
۵ ن ۱: بُردند۔
۶ مط: اکثر۔
۷ ن ۲: جواهر سنگھ و رائے بهادر سنگھ۔
۸ ن ۲: برچیدند۔
۹ ن ۱: بهردو۔
۱۰ ن ۱: چه بظهور رسد۔ مط: چه ظهوری رسد۔
۱۱ ن ۲: ندارد۔
۱۲ ن ۲: واؤ ندارد۔
۱۳ ن ۲: مستقر۔
۱۴ ن ۲: بدر نموده
۱۵ ن ۱ و ن ۲: کشید۔
۱۶ ن ۱: باز بآنها۔

بیماریِ که داشت، درگذشت۔ سرکردگانِ آن فوج، ناچار سَربسَر کرده، بَرگشتند، وسکهانِ بے تہ از ہمان راه گذشتند۔

سانحۀ عظیمی[1]

آنکه[2] درین نزدیکی[3] جواہر سنگھ باکبرآباد رفت، واز دستِ ناکسے بیک زخمِ شمشیر جهانِ فانی را پَدرود نَمود۔ ریاست به راوَرتن سنگھ، برادرِ اُو رسید۔ این سیه کار مُدام شراب میخورد، و[4] بر خلقِ خدا جفا از حد می بُرد۔ چنانچه در ریاستِ ده ماه باکس[5] وناکس بَد باخت[6]۔ آخر مُهتِوسے بزخمِ کارد کارِ اُو ساخت۔ سرداری بنامِ پسرِ اُو کیهری سنگھ مُقرّر شد۔ اختیار بدستِ نوکران اُفتاد۔ کار اَبتر شُد۔

اکنون کارپردازانِ نول سنگھ پسرِ چارینِ سورج مل را، که درعرصه نبود، به نیابتِ آن طفل برداشته اند۔ اگراز آب خوب بَر می آید خوب است، وگرنه کار بسیار بے[7] اُسلوب است۔ دقتیکه نفاقِ این قوم بَطُول کشید، ونوبتِ کارپردازیِ ملک به سُفهاء رسید، نوَل سنگھ و برادرِ خورد رنجیت سنگھ، که قلعۀ کُهیَر باُو تعلّق دارد، ہر دو بجنگ برخاستند۔ قریب پانزده شبانروز جنگِ توپ و بان وتیر[8] وتفنگ درمیان آمد۔ چون قلعه استحکامِ واقعی داشت، ناچار نول سنگھ بدرِ صلح زد وگذاشت۔ ہر چند[9] درمیانِ ہر دو برادر بظاهر صلح وصَفا شد، امّا کینۀ[11] باطنی را چه علاج؟ جیارام[12] که سرکردۀ فوجِ رنجیت سنگھ، و مَدار المهام بود، درلشکرِ دکهنیان که دران ایام چار پنج منزلِ آنطرف می گشتند، رفت۔ سرداران[13] را ترغیب نموده، در مُلکِ خود راه داد۔ همین[14] ها که حالا کُله گوشه بآسمان می رسانند[15]، بحالِ خراب باُو آمده زیرِ دیوارِ قلعۀ کُهیَر دائره کردند۔ آنقدر دل باخته بُودند،

---

[1] ن ا: ندارد۔ [2] ن ا: اینکه۔ [3] ن ا: ایام۔

[4] ن ا: واؤ ندارد۔ [5] ن ا: با ندارد۔ [6] ن ا: تاخت۔

[7] ن ا: نا اسلوب۔ [8] ن ا: تیر ندارد۔ [9] ن ا: ہرچند بظاہر درمیان

[10] ہر دو برادر صلح وصفا شد۔ [11] ن ا: ایاکه باطن (کذا)۔ [12] ن ا: جهیارام۔

[13] ن ا: وسرداران۔ [14] ن ا: همین که۔ [15] ن ا: بآسمان هفتم می رسانید

که از هرکس می پُرسیدند" فوجِ نول سنگه چقدر است؟ و چه قسم می جنگد؟" اگر نول سنگه از جاے خود حرکت نیکرد کارِ اوٗ باین خرابی نمیکشید، و دکهنیان هم بطریقِ ضیافت چیزے گرفته میرفتند. چنانچه حرکت بجانبِ متهرا کرده بُودند، که هنگامِ شب نا آزموده کارانِ نول سنگه قریب "گوردهن"، که آن هم مَعبدِ هنودان است، آمده پریشان جنگیدند. صد اینجا[1] و دوصد آنجا. هزارے اینجا و پانصدے آنجا[2]. ازین جهت هرکه هرجا بود، همان تنها بود. کسے بدادِ کسے نمی رسید. نسیمِ فتح و ظفر بر پرچمِ عَلَمهاے دکهنیان وَزید. اَسپان و فیلان و شتران و آلاتِ حرب بسیارِ اینطرف[3]، بدستِ قلعچیانِ آنطرف اُفتاد. برچنین شکست هم نتوانستند که بقلعجاتِ نول سنگه بچسپند. غنیمت شمرده از رودخانهٔ جون گذشتند و میان دو آب را خیمه آرا ساختند. چون اقامتِ ایشان بامتِداد کشید، نجیب الدّوله که از حزم بهرهٔ وافی داشت، باخود سنجید[4] که این بَلا بالا بالا نخواهد رفت. مبادا که آسیبے بشهر رسد. باپسر[5] و برادر و فوجے که همراه بود[6]، توکّل کرده، پیشِ سرداران آمد. تاجان در تن داشت نگذاشت که دکهنیان روٗ بسوے شهر کنند[7]. وقتیکه اوٗ از مرضِ مُزمنے که داشت، از میان رفت، سرداران بر اَمرے[8] از اُموراتِ سَهل ناخوشی به ضابطه خان پسرِ اُو درمیان[9] آوردند. آخر الاَمر اُو واسوخته به "سُکّرتال" رفت. ایشان[10] قریبِ شهر آمده خیمها زدند.

چون بدپردازی و ناسازیِ جاٹان از حد گذشت، و لطفِ باش و بُود بالکلّیه رفت. راجا ناگرمل بابست هزار خانه[11]، که بسببِ این مرد آباد شده بُودند[12]، و[13] اکثر وابستگی به دامنِ دولتِ این داشتند، برخاستن مُقرّر کرد، و اجازت از سردارانِ آنجا خواست. مگر[14] آن

۱ه ن ۱: صد و پنجاه. ۲ه ن ۱: این جا. ۳ه ن ۱: این طرف ندارد.

۴ه ن ۱: [باخود سنجید] ندارد. ۵ه ن ۱: باسه برادر و فوجے. ۶ه ن ۱: همراه داشت.

۷ه ن ۱: بشهر رو کنند. ۸ه مط: امورے تصحیح از ن ۱؛ و ن ۲. ۹ه ن ۱: درمیان ندارد.

۱۰ه ن ۱: و ایشان. ۱۱ه ن ۱ و ن ۲: بست هزار خانه مردم دهلی.

۱۲ه ن ۱: آن جا آباد. ۱۳ه ن ۱: واو ندارد. ۱۴ه ن ۱: مگر ندارد.

بے چشم و رؤیان، کہ ہنوز در کمینِ آزارِ مردم آند، بلیّت و لعل گذرانیدہ، خواستند کہ در
بِناے عزمِ این سر کردہ، خلل انداز شوند، و بآہستگی دستِ تطاول کشایند۔ ہرگاہ بہ یقین
پیوست کہ اینہا نمی گذارند، بلکہ سدِّ راہ می شوند۔ راجا نظر بر خدا کردہ، آنچہ لازمۂ سرداریست
بکار بردہ، با ہر دو پسر، بجرأتِ تمام، سوار شد و بیرونِ قلعہ آمدہ، چنان ہمت بامدادِ غبار
گماشت کہ ناموسِ نفرے ہم آنجا نگذاشت۔ از لطفِ دادارِ[1] بیہمال، و بیُمنِ نیّتِ خوب،
در[2] دو سہ روز، مع این قافلۂ گران، داخلِ کامان کہ شہرِ سرحدیِ راجا پرتھی سنگھ پسرِ مادھو سنگھ
است، کہ[3] حالا رئیس اورا قرار دادہ اند ـــ گشت۔ ما تلخ کامان نیز بسببِ علاقۂ نوکری۔
وابستگی درین اقامت گزیدہ ایم، و می بینیم کہ آبخور چندے اینجا نگاہ میدارد، یا جاے دیگر
می برد۔

سانحہ[4] | درین ایّام مشہور است[5] کہ رایاتِ اقبالِ پادشاہی بہ فرخ آباد سایہ افگن گشت
راجا مرا پیشِ حسام الدین خان، کہ در مزاجِ پادشاہ تصرّف داشت، فرستاد۔ رفتم و عہد و
پیمان درست کردہ آمدم[6]۔ اینجا پسرِ خوردِ او، کہ با من خوب نبود، ازان سبب کہ من با
برادرانِ کلانش ربطِ گونہ داشتم، علی الرّغم بہ پدر فہمانید کہ پیشِ دکھنیان رفتن اولیٰ است
چنانچہ بلشکرِ پادشاہ نرفتند، و عازمِ شہر گشتند۔ ناچار من نیز مع لواحقانِ خود، برسوائیِ تمام
با ایشان شدم۔ چون بشہر رسیدم زن و فرزند را در سراے عرب گذاشتہ، از درِ[7] ایشان
برخاستم۔ [بعد[8] از[9] دو سہ روز، با راے بہادر سنگھ برخوردہ، حقیقتِ حال ہمہ بیان نمودم[10]۔
آن بابا[11] موافقِ مقدورِ خود در پرداختِ احوالِ شکستہ ام[12] تقصیرے نکرد۔]

---

[1] ن ۱: داور۔ [2] ن ۱: بخیر و خوبی [بیُمنِ نیّتِ خوب او ندارد]۔
[3] ن ۱: مادھو سنگھ، و حالا رئیس۔ [4] ن ۱: ندارد۔ [5] ن ۱: شد۔
[6] مط: کردہ ام۔ ن ۱ و ۲ آمدم۔ [7] مط: از ایشان۔
[8] عبارت بین القوسین اضافہ از ن ۲ و مقابلہ از ن ۱۔ [9] ن ۱: از ندارد۔
[10] ن ۲: نمودہ۔ [11] ن ۲: او بابا۔ [12] ن ۲: ام ندارد۔

درینولا سیندهیا، که یکے از سرداران کلانِ دکهن است، پیشوا رفته پادشاه را باخود آورد، و داخلِ شهر کرد. چندے[1] برین نرفته بود، که سرداران باهم قرار دادند که پادشاه را باخود گرفته بر ضابطه خان، پسرِ نجیبُ الدّوله مرحوم، باید رفت. هرچند پادشاه تعلّل[2] بمیان آورد، فائده نکرد. باین تقریب من هم، [با رائے بهادر سنگهه][3] همراهِ لشکرِ پادشاه[4] روانهٔ آنطرف گشتم. رفتند، و ضابطه خان را بے جنگ گُریزانیده[5]، اَموال و اسباب و خانه و ناموسِ اُو بتصرّف دَر آوردند. پادشاه را غیر از دو صد اسپانِ لاغر و چند خیمهٔ کهنه ندادند پادشاه ازین حرکت بسیار بیمزه ماند. امّا چه فائده، که دکهنیان مُغتر و اینجا زور[6] نه زر. چون زور[7] بآنها نرسید، متصدّیانِ حضور بضبطِ جاگیراتِ اَعزّهٔ اینجا پرداختند، و بسا عزیزان را ذلیل و خوار ساختند. [ازین جهت رائے بهادر را نیز دستے نماند][8].

من بگدائی برخاسته، بر درِ هر سَر کردهٔ لشکرِ شاهی رفتم. چون بسببِ شعر شهرتِ من بسیار بود، مردمان رعایتِ گُونه بحالِ من مبذُول داشتند. بارے بحالِ سگ و گربه زندہ ماندم، و با وجیههُ الدّین[9] خان برادرِ خوردِ حُسام الدّوله ملاقات نمودم[10]. آن مرد، نظر بر شهرتِ من، و اَہلیتِ خود، قدرے قلیلے مُعیّن کرد، و دلدهی بسیار نمود.

القصه چون پادشاه از سرکشیِ رئیسانِ دکن دلِ خوشے نداشت[11]، بے مرضیِ آنها روانهٔ شهر شده، داخلِ قلعه گشت. اینجا آمده نجف خان، که خود را در لشکرِ پادشاهی سپاهی میگرفت پادشاه را نا سنجیده، نافهمیده، برین پله[12] آورد که محالاتِ متعینهٔ جاٹ را متصرّف باید[13] شد. آخر باصرارِ تمام اجازتِ این امرِ عظیم بے مَشورتِ حُسام الدّوله که با سَرداران دکن ربط[14]

---

[1] مط: چندین.　[2] ن ۱: تعلّل با.　[3] اضافه از ن ۲.

[4] ن ۱: پادشاهی.　[5] ن ۱: گریزانیدند و اسباب.　[6] ن ۱: و نه زر.

[7] مط: چون زر. ن ۱: چون زدر.　[8] ن ۱ و ن ۲ عبارت بین القوسین زیاد دارد.

[9] ن ۱ و ن ۲: باوجیه الدّوله برادر.　[10] ن ۱: نمود.　[11] ن ۲: دل پُرے داشت.

[12] ن ۱: پله ندارد.　[13] ن ۱: متعرف باشد.　[14] ن ۱: رابط.

تمام داشت ــــ گرفته، دهٔ پانزدهٔ هزار مردمِ مفلوکِ شهر، و بیرونجات گِرد آورد، و در شُروعِ آن مهم[1] ده دوازده محالاتِ نزدیکِ شهر را متصرّف شده طرفِ کُلاه برشکست چون کم سِن و نادیده[2] روزگار بود، بگفتهٔ سفیهانِ ناماَل اندیش، از جائے رفته، مستعدِ حَربِ دکهنیان شُد- آنها[3] مشورت کردند که هنوز پادشاه مانا بگداست- باین زور و طاقت ارادهٔ مقابلهٔ ما کرده است- اگر زورِ واقعی بهم خواهد رسانید، کار برما تنگ خواهد کرد- بهتر آنست که از[4] دوآبه کوچ بطرفِ شهر نمائیم، و فرصت نداده کارِ اُو بسازیم- اگر در جنگ از میان برود، رفته باشد، وگرنه سرجنگے[5] زده، انبوهِ کدائی[6] را پراگنده سازیم، و خودش را بحالِ فقیران نگاه داریم- که بنان و نمک معاش میکرده باشد و دست نگرِ ما باشد-

هرگاه این[7] مشوره قرار یافت، ضابطه خان[8] را، بوعدهٔ بخشی گری و سهارن پور که از تصرّفِ اُو برآورده، بپادشاه داده بُودند، خوشدل ساخته، رفیق نمودند- فوجِ جاٹ را نیز برین[9] منوال همراه گرفته، از میانِ دوآب بتَری هائے تمام، در[10] عرصهٔ یک هفته، برابرِ فریدآباد آمده عبورِ دریائے[11] پایاب کردند- دو سه روز زُود خوردی ماند- آخر روزے جنگ بمیان آمد- ازینطرف هم نجف خان و بَلوچان[12] و مُوسی مدک فرنگی که باغوائے نجف خان از نوکریِ[13] جاٹ دست برداشته ملحقِ این فوجِ فلک زده گشته بُودند، پائے جلادت بمیدانِ معرکه فشردند- چون سیاهیِ فوجِ دکهنیان دیدند، مُغلانِ حرام توشه پشت داده[14]، روسیاهی گُزیدند- اَجل رَسیدگانِ چند، که[15] جامهٔ هم سرِتن[16] نداشتند، مفت زخم هائے دامن دار

---

[1] ن ۱: شروع دران مهم نموده- [2] ن ۱: نادیده کار- [3] ن ۱: باخود-
[4] مط: از ندارد- [5] ن ۱: سرجنکی- [6] ن ۱: کدائی-
[7] ن ۱: این ندارد- [8] ن ۱ و ن ۲: ضابطه خان پسر نجیب الدّوله-
[9] ن ۱: بدین- [10] مط: تمام برابر در ن ۲، تمام که نه نوشته به است-
[11] مط: دریا پایاب- [12] مط: دیلوچان- [13] ن ۱: روزگار
[14] ن ۱: دادند و [15] ن ۱: که ندارد- [16] ن ۱: هم برتن-

بُرداشته، بوادیِ عدم شتافتند. دسته‌ای آن طرف میدان را خالی یافته، بے محابا بشهر درآمد. فیلانِ پادشاهی و یَراقِ بسیارے، را بر سرِ گریختگان گذاشته باخود بُرد. پریشانے چند، که جمع شده بُودند، بیک چشمک زدن ازمیان رفتند. تایک پاس شب گذشته، حُسام الدّین خان با معدودے چند در ریتی[1] اِستاده ماند، و باز برخاسته، پیشِ بادشاه رفت. قریب نصفِ شب[2] نجف خان نیز مظلومانِ چند را بکُشتن داده، داخلِ حویلیِ خود شد. شهر کهنه که[3] جسته جسته آبادی داشت، درین سانحه از سرِ نو بغارت رفت. ماغربا را حافظِ حقیقی در حفظِ خود نگاهداشت.[4] صبح جرّارانِ اینطرف، تابِ مُقاوَمت نداشتند، که بمیدان برآیند. مورچال برابرِ دیوارِ شهر پناه درست کرده، بجنگِ[5] بادیسها آن روز گذرانیدند[6]. اقبالِ پادشاهی کار کرد، وگرنه قلعهٔ مبارک را هم می پَرّانیدند. سلیقهٔ جنگ و استعداد اینطرف[7] همان روز معلوم شده بود، که چون آمد آمدِ[8] فوجِ دکهنیان شنیده[9]، هوشِ اکثرے رفت، و مردمِ توپخانه برائے تیاریِ[10] آلاتِ حرب مثل توپ و رَهکله، و جزائرِ اُفتاده و سرب و باروت و بان، وغیره عرضی بحضورِ اقدس کردند. مُتصدّیان صد روپیه به میر آتش، که از برفِ خنک تر است، تنخواه کردند. هیئتِ او، و سلیقتِ او[11]، اگر بینی، دانی که مردان[12] چنین می باشند، آنچنان در کُنجے خزید، که تا جنگ درمیان بود، اُورا کسے ندید. آخر روزِ سوم، حُسام الدّوله سوار شده رفت، وصلح دلخواهِ آنها کرده آمد. بارے شهرِ نو[13] سلامت ماند. اکنون باشارهٔ مختار[14] دکهنیان درپئے برآوردنِ نجف خان و مغلانِ[15] حرام کوزه اند[16]. به بینیم که چسان صورت[17] میگردد. این اِدبار زدگان چطور از شهر برون[18]

---

[1] ن ۱: وارسی. [2] ن ۱: شب ندارد. [3] ن ۱: که ندارد. [4] مط: نگهداشت.
[5] ن ۱: بجنگ ندارد. [6] ن ۱: گذاشتند. [7] ن ۱: این طرف ندارد.
[8] ن ۱: چون آمدِ فوج. [9] مط: شد. [10] ن ۱: طیاری. [11] ن ۱: اورا.
[12] ن ۱: مردان. [13] ن ۱: نو ندارد. [14] ن ۲: نواب موصوف.
[15] ن ۱: مغلان و نجف خان. [16] ن ۲: مغلانِ سیه رو. [17] ن ۱: چسان. [18] مط: بر می آیند.

می آیند و بکجا میروند۔

القصہ، سیندھیا، کہ سردار سومین[1] دکھنیان بود، بطرفِ جے پور رفت۔ سردارانِ دیگر ارادۂ آنطرفِ آب دارند۔ غالب کہ از راہِ فرخ آباد بہ جھانسی بروند، از انجا[2] بسببِ آشوبِ ملکِ شجاع الدّولہ شوند۔

سانحہ[3] | چون زبانزدِ مردمِ شہر بود کہ نجف خان وغیرہ سرداران، و مغلانِ شورہ پشت دعویِ تنخواہ در سر دارند، ہرگاہ دکھنیان کوچیدہ میروند، این جمِّ غفیر بر درِ پادشہ نشستہ مُتصدّیان را تنگ کردہ، زرِ طلب خواہند خواست۔ لہذا حُسام الدّولہ[4] بدکھنیان گفت کہ "اینہا نمک بحرام و ہنگامہ پردازاند، بہر طوریکہ دانید[5] ہمت براخراجِ ایشان بر گمارید[6]"۔ حالاحسبُ الاشارۂ او[7]، سردارانِ جنوب درپئے آنند کہ آن قوم را از شہر بر آرند۔ چنانچہ قدغن است کہ مُغلے در شہر نماند۔

وقتیکہ این گفتگو بطُول کشید، و متصدّیانِ حضور در قلعہ رفتہ[8] نشستند، و مردمِ شہر را بند کردند، در ظاہر آن گروہِ بے شکوہ تا لاہوری دروازہ ملچارہا بستہ[9]، آتشِ فتنہ و فساد بر کردند، و بباطن با دکھنیان، کہ[10] بالقوۂ روکشیِ آنہا نداشتند، درساختند۔ چون از ہنگامہ آرائی کار پیش نرفت، و دیدند کہ در اِستادگی کُشتہ خواہیم شد، ناچار مُہیاے برآمدن شُدہ، با جنوبیان عہد و پیمان نمودند۔ بعد از دو سہ روز، نجف خان و دیگر سرکردہ ہاے مُغلان، با ہمہ یارانِ خود، در لشکرِ آنہا رفتہ[11] اہلِ دکن کہ صاحبِ سُلوک اند، و مراعاتِ ظاہر را در ہیچ وقت نمیگذارند، در عزّتِ این اِزدِحامِ نافرجام تقصیرے نکردند۔ امّا آن عزّت کہ در نوکریِ پادشاہ بود، معلوم !۔ در چند روز این

---

[1] مط: سیومیں۔ [2] ن ۱: واز آن جا۔ [3] ن ۱: سانحہ ندارد۔
[4] ن ۲: حُسام الدّولہ کہ مختار بودند۔ [5] ن ۱: دانند۔ [6] ن ۱: اینہا برگمارند۔
[7] حسب الارشادِ نواب مذکور۔ [8] ن ۱: رفتند و۔ [9] ن ۱: کشتہ۔
[10] مط: کہ ندارد۔ [11] ن ۱: رفتند و۔

جماعتِ بے حقیقت پراگندہ میشود۔ ہرکس بطرفے خواہد رفت۔ وہمین مشہور است کہ بالفعل دکھنیان این ہیئتِ مجموعی را تا اکبرآباد بخود می[1] برند، وازانجا اجازت خواہند داد، کہ ہرکس ہر جا کہ خواستہ[2] باشد برود۔

الحاصل، مغلانِ شرارت بنیاد، وجنوبیانِ سراپا فساد، قریب است کہ بروند، و حضرت ظلِّ سُبحانی بذاتِ قُدسی صفات، بادوسہ محرّر، درقلعۂ مبارک، بے تشویشِ آیندہ و روندہ تشریف دارند۔ اگر روزے صد بار برکنگرۂ[3] کنگرۂ حصار جہتِ سیر برآیند، کیست کہ حاجبِ[4] او مانع شود؟ وگر بہ بازار پیادہ پا برآیند[5]، حاجب کوکہ "دُورباش" نماید؟ - اُسلوب چنین بنظر می آید، کہ اہلِ حرفہ سَر بصحرا زنند[7]، وسپاہی پیشگان بگدائی دست دراز کنند۔ ہرکسے راہِ خود گیرد، شہر رونق بسیار پذیرد۔

سانحہ[6] تازہ آنکہ، چون جنوبیان نجف خان را ہمراہ گرفتہ، رُو بآن روئے آب آوردند[7]، وزیرِ حال ازصوبۂ خود، باستظہارِ نصرانیان یلغار کردہ، بہ فرُّخ آباد رسید، و رُوکش گردید۔ چون سردارانِ جنوب، خودرا دران مرتبہ نیافتند، کہ حریفِ آنہا شوند، قریب سہ ماہ بہ[8] قیل وقال [گذراندہ، خواہانِ صُلح شدند۔ چون وزیر ہم دلاورِ مقرّرے بود، غنیمت دانستہ قبولِ][9] این معنی نمود۔ آخرالأمر، نجف خان را مختارِ کارِ حضور کردہ، روانۂ صوبۂ خود شد۔ دکھنیان ومشرقیان ہم جواب وسوالِ خود باُو سپردہ، بمکانہائے مُتصرِّفۂ[10] خود، رفتند۔ چون نجف خان داخلِ شہر گردید[11]، رنگ از رُوئے حُسام الدّولہ پَرید۔ دوسہ[12] روز درخانہ نشست، بعد ازان پادشاہ درقلعہ طلب داشتہ کاغذِ حسابِ چند سالۂ خود را طلب کرد، وہمانجا نگاہداشت۔ مجدالدولہ[13] عبدالاحد خان، پسرِ عبدالمجید

[1] ن ا: باخود ببرند۔ [2] ن ا: ہرجا کہ بخواہد۔ [3] ن ا: برکنگرۂ حصار۔
[4] ن ا: کہ مانع شود۔ [5] ن ا: درآیند۔ [6] ن ا: سانحہ ندارد۔
[7] ن ا: زدند۔ [8] ن ا: بہ ندارد۔ [9] ن ا: عبارت مابین القوسین ندارد۔
[10] ن ا: خود ندارد۔ [11] ن ا: شد۔ [12] ن ا: ودرسہ روز۔ [13] ن ا: مجد الدولہ۔

خان مغفور[1]، که از کارپردازان مُقرّرِ پادشاهی بود، از تغیّرِ راجا ناگرمل خلعتِ دیوانیِ خالصه پوشید[2]، و بکارِ پادشاهی[3] پرداخت. آخرِکار[4]، پادشاه حُسام الدّین خان را که مختار الملک بود، مجبور[5] ساخته، بابت زرِ پادشاهی و تنخواهِ مُغلان، بعوضِ هشت صد لک روپیه[6]، حوالهٔ فتح علی خان دُرّانی وغیره نمود[7] (که) اُورا از قلعه بخانهٔ خود بَرد. حالا مغلان مختار اَند، خواه بکشند[8] و خواه بگذارند.

این شامتِ اعمال قیامت بسر آورد

[انچه ظاهر است حُسام الدّین خاں در حقیقت از میان رفت، چراکه بدستِ دشمنانِ جانی اُفتاده است، تا مقدوُر زنده نخواهند گذاشت، پیشتر اختیارِ خداست که اُو بر همه چیز قادر است. احوالِ فقیر از سه سال آنکه، چون قدردانے درمیان نیست، وعرصهٔ روزگار بسیار تنگ است، توکّل بخُدائے کریم — که اُو رزّاقِ ذی الُقوّةِ المتین است — کرده، بخانه نشسته اَم. ظاهر اسباب با اعزّهٔ چند، مثلِ ابُوالقاسم خان، برادرِ خُوردِ عبدالاَحد خان مجدُ الدّوله، و وجیهُ الدّین خان برادرِ حُسام الدّین خان، و بَیرم خان خَلَفِ الصِّدقِ بَهرام خان کلان — که در آدمی رَوِشِ یکتائے روزگارِ خود اند — و قُطب الدّین خان، پسرِ سَعدالدّین خان خانسامان — اگرچه سِنّش کم است، اَمّا فهم دُرستے دارد، و خالی از سعادتمندی نیست — و قاضی لُطفِ علی خان، که آدمیانه می زیَد. گاه گاه ملاقات کرده می آید، خواه از دستِ ایشان اِنتفاعے برسَد، یا نرسد. مایهٔ توکّل همین صاحبانند. وگاهے هم این چنین اِتّفاق می شود که کسے فقیر و شاعر و متوکّل دانسته، بطریقِ نذر چیزے بفرستد. محلِّ

---

[1] ن ۱: مغفور ندارد۔
[2] ن ۱: پوشیده۔
[3] ن ۱: بکاروبار بادشاهی ن ۲: مختار کار بادشاه شد۔
[4] ن ۱: پایانِ کار۔
[5] ن ۱: مجبور شده۔
[6] ن ۱: بعوض هشت لک روپیه۔
[7] ن ۱: نمود ندارد۔
[8] ن ۱: واوَ ندارد۔

شکر است. اکثر قرضداری باشم و به عُسرتِ تمام بسر میکنم".][1]

سانحه عبدالاحد خان[2] که دیوانِ خالصه شده بود، و در مزاجِ پادشاه دخلِ تمامے کرد، مختار گشت، و هر چه میخواست میکرد. کسے را یارائے دم زدن نبود، فوجِ بادشاهی با حالِ تباه. پادشاه بیدستگاه. بر سائرِ شهر و چندده گذران معلوم. جاٹ — که عبارت از اولادِ سورج مل باشد — تا درگاهِ حضرت خواجه قطب الدّین بختیار کاکی" — که از شهر سه چهار کروه است — متصرّف بود. نجف خان پیشِ بادشاه عرض میکرد که: "حضرت زندگانی باین قسم ظاهر است، اگر این مُلکے که در تصرّفِ جاٹ است، بدست بیاید نصف دل خوش بسر میتوان کرد." پادشاه میگفت: "مگر خواب می بینید. سخن که از دهنِ خود زیاده باشد، چرا باید گفت."؟ اُو میگفت: "گر چنین اتّفاق شود، حضرت مرا چه میدهند؟." پادشاه گفت: "سوم حصّه از مُلک من بگیرم، باقی بخشِ شماست!." چون اِدبارِ آن قوم نزدیک شد، روزے فوجِ آنها بمیدانِ "گڑھی" که قریبِ درگاه حضرت خواجهٔ مسطور علیه الرّحمة است، آمد و آغازِ شوخی کرد. نجف خان، با مردمے که یَراق هم نداشتند، حرکتِ مذبوحی کرده، بَرُوے آنها دَوید. آنها که مغرور بودند بخاطر نیاورده، زود بُردی نمودند. چون جنگ بمیان آمد صورتے که مُتصوّر نبود، جلوه گر شُد. یعنی تا شام آن جنگ زدند. مردمانِ پادشاه شب بزرعتِ خام معاش کرده، هم آنجا اِقامت انداختند، و کوسِ شادی نواختند. صبحِ آن قدم پیش گذاشته به "بلّم گڑھ"، که حصارِ مضبوطِ آنها بود، بفاصلهٔ دوازده کروه از شهر، رفته چسپیدند. چند روز جنگِ توپ و زَنبوره

---

[1] عبارتِ بالا در نسخهٔ رامپور یافته می شود و هم برین عبارت آن نسخهٔ خطّی تمام می شود. دنبالِ این "عبرت و خاتمه" است، که در متنِ حاضر آخیراً می آید. برائے زمانهٔ نوشتنِ این نسخهٔ خطّی رجوع شود "مقدمه".

[2] ازین جا تا آخرِ کتاب متن منحصر به ن ۲ و نسخهٔ مطبوعه است.

درمیان ماند۔ سردارِ آنجا گفت: "از گرفتنِ حصار، جنگِ جاٹان تمام نمی شود، پیشتر بروید۔ جنگے کہ با سرداران است آن جنگ را بزنید۔ این حصار را من بے جنگ خالی کردہ خواہم داد۔" نجف خان باین سنِ کم، سردارِ سخن شنو بود، دست ازان حصار برداشتہ، ہمان سردار را آنجا گذاشتہ، ارادۂ پیشتر نمود۔ چون قریبِ ہوڈل، کہ قصبۂ متصرفۂ جاٹان بود، رسید، کار بدشواری کشید۔ یعنی فوجِ سنگین ازان طرف آمدہ بر رُو ایستاد۔ کارِ کلانے بر سر افتاد۔ سردارِ جاٹان، کہ نول سنگھ نام داشت، بالشکرِ گران و توپخانۂ بسیار آمد و چہرہ شد۔ ہنگامۂ جنگ گردید۔ فلک جامہ ہاے بسا کس بخون کشید، رفتہ رفتہ زمین بہ تنگی گرائید۔ پرخاش بہ یراقِ کوتہ انجامید۔ مردمانِ پادشاہی از کثرتِ فاقہا، و تباہی دست از جانہا برداشتہ، پاے ثبات افشردند، و سخت خوردند، و مُردند۔ چون فتح بہ اِدبارِ آن قوم بود، سرداران پیادہ شدہ، کار را پیش بُردند۔ آن فوجِ گران، ہزیمت خوردہ برگشت۔

سمرو نام فرنگی کہ با توپ و رہکلہ آن طرف بجراَتِ تمام دیرے ایستادہ ماند، آخرِ روز آن ہم رو بفرار نہاد۔ نجف خان، کہ این کارِ بزرگ بسرداریِ او سر انجام یافت، کلاہ کج کرد۔ ہر کہ این ماجرا شنید خیلے متعجب گردید۔ سردارِ جاٹان بحصارِ خود رفت، و بر بستر افتاد۔ این جا بر نجف خان مردمِ بسیارے گرد آمدند۔ رئیسِ کلانے شد۔ چون زر پیشِ خود نداشت، مردمان را بزبان نگاہداشتہ، ہر کسیکہ می آمد، نوکر می شُد۔ درچند روز لشکر حکمِ دریاے بیکران پیدا کرد۔ اگرچہ کنارِ خشک داشت، اما بہ تر زبانیِ خود کاری کرد۔ چون دید کہ بسخن ہاے دروغ فوج نمی ماند، جگر کرد، و سرداران را بمحالاتِ جاٹ فرستادن آغاز کرد۔ آخر این نقش درست بنشست۔ خودش رفتہ بحصارِ ڈیگ کہ ازانجا دوازدہ کروہ بود، چسپید۔ سردارِ آنطرف کہ بیمار بود، قضا را درگذشت۔ آنہا رنجیت پسرِ چہارمِ سورج مل را برداشتہ، ہمت بر جنگ گماشتند۔

داروغۂ توپخانۂ آن قلعہ، بسرداران اینطرف سازشے کردہ، راہِ درآمدِ حصار نشان داد۔ مردمان یورش نمودہ درآمدند، و بغارتِ شہر منتفع شدند۔ ہر کم بغل دو بغل تاش بادلہ آورد۔ اسباب بسیار، و توپخانۂ بے شمار بدستِ نجف خان ہم آمد۔ قلعچیانِ این فوج مالدار شدند۔ بعدِ غارتِ ہفت ہشت روز آن قلعہ را حوالۂ سردارے کردہ، قدم پیش کشاد۔ کُمہیر کہ حصارِ دیگرش بود، قصدِ آنجا نمود۔ رنجیت کہ سردارِ آن قوم شدہ بود، آن قلعہ را خالی گذاشتہ، و آلاتِ جنگ یک شاخ افگندہ، بہ بھرت پور، کہ حصارِ محکمے است، رفت۔ ایشان متصرّفِ این شہر نیز شدند، و مالِ بسیارے بدستِ سپاہیان آمد۔ ناچار جاٹان پیغامِ صُلح دادند، و کشوری کہ مادرِ رنجیت باشد، و از شعور بہرۂ داشت، آمد و آشتی خواست۔ نجف خان، بھرت پور را باینہا دادہ، و کار بر وقتِ دیگر گذاشتہ، باکبر آباد، کہ دارالسّلطنتِ مقرّر لیست، و جاٹان متصرّف بودند رفتہ، ُمہیاے جنگِ آن قلعہ شد۔ چون اِقبال یاور بود، در اندک فرصت نقب دادہ، بدست آورد۔ سردارے را کہ از طرفِ جاٹان دران تمکّن داشت، بوعدہ و وعید بدر کرد۔ با مردمانِ آنجا سر کرد، و تمامِ آن صوبہ را متصرّف گشت۔ بہر کہ میخواست، محالاتِ آنجا تنخواہ میکرد۔ در چندے مالکِ تمامِ آن ملک شد۔ راجہا و زمینداران ہمہ سرِ حساب شدند۔ اگر جاٹان حرکتِ مذبوحی میکردند، بیک سیلی زدن باز رؤے اینطرف نمی آوردند۔

ہر گاہ نجف خان مالکِ اینہمہ ملک شد و کارِ او بالا گرفت، و در حضورِ ـــــ عبدالاحد خان لکد برابر زد۔ یعنی مدارِ سلطنت بران قرار گرفت۔ پادشاہ از نجف خان موافقِ وعدہ، سؤالِ سوم حصّۂ ملک نمود۔ او در حضور آمدہ گفت کہ: "اینہمہ فوج کہ با من است، ملک تنخواہِ مردمان کردہ، دادہ ام۔ حضرت زرِ سوم حصّۂ ملک از من می گرفتہ باشند۔" پادشاہ از زبان زیرِ زبان داشتن او اطمینان نداشت۔ گفت:

"اینقدر ملک باید گذاشت کش زدنِ مردانۂ او، پیشِ زور آوریِ عبدالاحد خان پیش رفت نشد۔ ناچار محالاتِ سوم حصۂ ملک، بطورِ مختار جدا کردہ داد۔ و خلعتِ میر بخشگیری عطا شد۔ امیرالامرا شد۔ بعد از چندے از حضور رخصت خواستہ باکبرآباد رفت۔
اینجا عبدالاحد خان سکھان را از خود کردہ، ہر چہ بالقوہ داشت بآنہا داد۔ باعتمادِ آن جمِ غفیر، پادشاہزادہ فرخندہ اختر را گرفتہ، براجہ پٹیالہ لشکر کشید۔ تہِ دلش اینکہ اگر اتفاق شود سکھان را بروے نجف خان باید دوانید۔ آنطرف میرفت و خیالِ اینطرف داشت۔ رفتہ رفتہ کار بآنجا کشید کہ مردم بسیارے از لشکرِ امیرالامرا جدا شدہ ملازم مختار گردیدند۔ چون مُلک دار نبود، و تدبیرِ ریاست خوب نمی دانست، کارہا را ناتمام میگذاشت۔ چندے بسر کرد، و بہ مشورتِ سکھان باراجا سر بسر کرد۔ زرے کہ داشت بہ خرچ آمد۔ چیزے از پادشاہ خواست۔ شاہ از طلب کردنِ زر بیمزہ شد، و نوشت کہ بہر طوریکہ باشد آنجا باشید من زر ندارم۔"

سانحہ وزیرِ اعظم، امیرِ معظم، نوّاب شجاع الدّولہ کہ سر بفلک داشت، بجنگِ حافظ رحمت روہیلہ، کہ با او دمِ ہمسری میزد و خصومت میکرد، برآمد۔ حریف از راہِ خصومت بفرنگیان می نوشت: "وزیر کہ این ہمہ فوج نگہ میدارد سر بر سرِ شما دارد۔" چنانچہ گورنر بہادر کہ صاحب است، بارادۂ پرخاش پیشتر آمدہ بود۔ نوّاب وزیر کہ مراعاتِ این قومِ غالب بیش از بیش می نمود، تنہا پیشِ آنہا رفت و گفت: "من پاسِ شما میکنم، و از کسے دیگر فروتنی نخواہم کشید۔ درین ہر چہ خواستہ باشد، بشود۔ یا مرا ہمراہ بہ کلکتہ ببرند، یا ملک را بطورِ من گذارند۔" فرنگیان سلوکِ وزیر دیدہ، دست از ہمہ چیز کشیدہ، کڑا و الہ آباد را ہم حوالہ کردہ، رفتند۔ سپہرِ کاسہ باز چرخ زدن آغاز کرد، و زمانہ دیگر گشت۔

ہرگاہ وزیر از آنجا برگشت، اکثرے از فرنگیان مقدمۃ الجیشِ وزیر شدہ، جنگ

رابطورِ خود مقرّر کردند۔ و چون چشم روہیلہ ہا ازین لشکر، آن کہ حکمِ دریاے بیکران داشت، ترسیدہ بود، ضابطہ خان و سردارانِ چند بہ جمعیّتِ دہ دوازدہ ہزار کس، الف بر زمین کشیدہ اظہارِ این معنی نمودند کہ ما مردمِ دولت خواہانیم، سرتابی نمی توانیم کرد۔ وزیرِ اعظم نظر بر فضلِ نامتناہیِ الٰہی گفت کہ: "پسِ پشتِ فوج ایستادہ باشند۔" اگرچہ بعضے از سرکردہ ہا گفتند کہ "این قوم غدّار است۔ رُو نباید داد۔ مبادا در وقتِ جنگ موجبِ تشویش شوند۔" و چون وزیر جگردارِ واقعی بود، — پشت چشمے نازک کردہ گفت کہ: "زورِ اینہا را در نظر دارم۔ بیک تگ تگِ پا بہ خاک در آرم۔"

صاحبزادہ آصف الدّولہ بہادر، کہ حالا وزیرِ اعظم است، در تردّد کارزار سرگرم بسیار۔ بہر طرف کہ رُو می آورد، گَرد می انگیخت۔ زنجیرۂ توپخانہ بزورِ تیغ می گسیخت۔ وقتیکہ ہنگامۂ جنگ گرم تر شد، حریف کہ غرقِ آہن بود، از موم نرم تر شد۔ گولہ ہا بہ این بسیاری می رسیدند کہ بسیارے را بخاک و خون میکشیدند۔ چون زمین تنگ شد، حریف دید کہ گذر و گریز نیست ناچار جگر از سنگ کردہ، در میدان بہ ایستاد، و دل از جہان برداشتہ، تن بہ مُردن داد۔ زود بُردی بہ میان آمد، و انبوہِ آن طرف بجان آمد ہوش از سرِ دلاوران پرید۔ گولہ بہ سینۂ اُش رسید۔ صفوفہا بہ ہم خوردند۔ سرِ دشمن چون گوے بُردند۔ ہر گاہ درین لشکرِ ظفر اثر آوردند و نمودند۔ روہیلہ ہا زبان بہ تصدیق کشودند کہ ہر عمل را جزاے، و ہر کردہ را سزاے است۔ چون یقین شد کہ او کُشتہ اُفتاد شکرانۂ این فتح، وزیر سر بہ سجدہ نہاد۔ لشکرش بغارت رفت و ناموس بگیر آمد۔ ملکِ سیر حاصلِ او ہمہ در تصرّفِ وزیر آمد۔

نجف خان، کہ درین جنگ از اکبر آباد آمدہ ملحقِ لشکرِ وزیر شدہ بود، رخصت شدہ باز باکبر آباد رفت۔

فقیر دران ایام خانہ نشین بود۔ پادشاہ اکثر تکلیف کرد، نرفتم۔ ابوالقاسم خان پسرِ ابوالبرکات خان کہ صوبہ دارِ کشمیر بود، و بنی عمِ عبدالاحد خان مختار است، مراعاتِ گونہ بکار می برد۔ گاہ گاہ باو ملاقات می شد۔ گاہے پادشاہ ہم چیزے بچیزے می فرستاد۔

مصرعہ گاہ گاہ می گویم　　کارِ دنیاے من ہمین قدر است

بعدِ این فتحِ عظیم، وزیرِ اعظم امیرِ معظم، بشکوہِ تمام داخلِ صوبہ شد چون چشم سپہر بدُنبالِ اہلِ روزگار می باشد، گوئی کہ چشمے باین انبوہِ پُرشکوہ رسید۔ یعنی دستورِ جگر دار، کلان کار، بسببِ آبگردش بیماریِ بہم رسانید کہ تدارکش دشوار بنظر می آمد۔ ہر چند اطبا و فرنگیان بمعالجہ سعی نمودند، امّا فائدہ مترتب نشد۔ از ہشیار سری چون دید کہ بیماری بطول کشید، خلف الصدق آصف الدولہ بہادر را کہ شایستہ کار و جرّار، و عالم مدار، و مدوارِ فیض و احسان است، بر مسندِ وزارت نشاند، و از جہانِ فانی دامن افشاند۔ در ماتمِ آن امیرِ بزرگ عالمے سیاہ پوش گردید۔ عجب سانحہ بظہور رسید۔ اگر ہزار سال چرخ چرخ میزند، تا اینچنین جوان سردارے ہمہ تن جرأت سراپا مروّت بہم میرسد۔

بعد از چندے، مختار الدولہ، کہ اختیارِ کاروبارِ وزارت و صوبہ داری داشت، زمانہ اش فرصت نداد، و نگذاشت۔ از دستِ خواجہ سراۓ بسنت نام، کشتہ افتاد، و سر بوادیِ عدم نہاد۔ نوبتِ نیابت بہ حسن رضا خان سرفراز الدولہ بہادر رسید۔ و این سرداریست با تمکین، متواضع، متصف بہ حسنِ خلق، صفتِ کرم بر صفتہاے حمیدہ اش غالب۔ دلجوئی وضیع و شریف را بہ حسنِ سلوک طالب۔ الطافِ عمیمش مراجہ، اکثرے را دریابد۔ خدایش سلامت دارد۔

سانحہ پادشاہ از طلب کردنِ زرِ مختار بیمزہ شدہ، بہ نجف خان ذوالفقار الدولہ نوشت کہ خود را بہر طوریکہ داند اینجا رساند۔ او بایماے پادشاہ شیرانہ و دلیرانہ روانہ

حضور گردید۔ از استماعِ این خبر کہ اُمیر الاُمرا، می آید، سُرکن پرکن با انبوہِ سکھان مع پادشاہزادہ، عبدالاحد خان بآہو سوار شدہ، دو روز پیشتر از نجف خانِ مسطور، داخلِ شہر گشت و در قلعہ بند و بست کردہ نشست۔ شورے برخاست کہ ذوالفقار الدّولہ آمد۔ بادشاہ ہمین مختار را برائے پذیرا شُدن گفت۔ بتزکِ تمام رفت و ملاقات کرد۔ وقتِ سوار شدن ہر دو بر یک فیل نشستند۔ نجف خان عبدالاحد خان را دُو رُو و مُنافق دانستہ بزبان داشتہ، تا دروازۂ قلعہ بہ نرمی تمام آمد۔ ازین جا اشارتے بمردمانِ خود کرد کہ توپ و رُہکلہ و فوج من بلا تحاشا اندرونِ قلعہ بروند و جا بجا ایستادہ شوند۔ ہر چند تفاوت میان ہر دو یک پشتِ کارد بود، اگر میخواست کارِ مختار می ساخت۔ امّا نظر بر بندگیِ بادشاہ، کہ این ہم بندہ است، مرضیِ بادشاہ را اوّل دریافت کنم، بعد ازان ہر چہ خواہد شُد، خواہد شُد۔ چون باین ہنگامہ پیشِ بادشاہ آمد و ملازمت کرد، دید کہ آقا دلِ پُرے دارد، میخواہد کہ این را نگذارد۔ ازانجا برگشتہ درمیانِ بازار ایستاد و عرضی فرستاد کہ من از لحاظِ حضور دست انداز نشدم، اکنون تا ازینجا عبدالاحد خان را با خود نبرم نخواہم رفت۔ پادشاہ در ظاہر گفت و شنود بمیان آورد، و بباطن گُفت کہ بہر طوریکہ باشد این را باید بُرد۔ چونِ مردمان مختار مجبور شُدہ رفتہ بُودند، و سکھان یکسُو شُدند، ناچار قول و قسم بمیان آوردہ، کہ نجف خان با مَن بد نکند، و خواہانِ عزّتِ من نباشد۔ پادشاہ گفت: "من ضامن، شمائے اندیشہ رَوید۔" چون چارۂ ندید، و زمانہ را بطورِ دیگر یافت، آخرِ روز بر یک فیل سوار شدہ، از قلعہ برآمد۔ اُمیر الاُمرا، کہ در بازار انتظاری کشید، خود ہم سوار شدہ، فیل این را برابر فیلِ خود کردہ، بخانہ بُرد و آنجا نگہداشت۔ چند روز بہ لَیت و لَعل گذرانید کہ امروز پیشِ بادشاہ میروم، فردا می برم، بعد ازان گفتہ کہ آنجا رفتہ چہ خواہند کرد، بہتر اینست کہ پیشِ من باشند۔ لیکن بر مال و اموالِ اُو دست انداز نشد۔ بیست روپیہ روز از خانۂ خود کردہ، و چند خدمتگار پیشِ اُو گذاشتہ

خُود بأمورات ملکی و مالیِ حضور مشغول شد۔ رفتہ رفتہ کار بجائے کشید، کہ سر بفلک رسانید، بسببِ مرجعیّت و عُلوءِ مرتبت، امیران را وقتِ مُجرا بدست نمی آمد۔ روزے کہ بہ حضُوری آمد، دربار می شُد، وگرنہ پادشاہ باچند مصاحب بسر میکرد۔ چون جوان بود، و شاہجہان آباد طلسم خانہ، یاران بہ عیش و عشرتش مائل کردند۔ باستعمالِ منہیات۔ و تماشائے زنان چنان پرداخت کہ قُوّت از بدن زائل شد۔ آخر بمرضِ سِل گرفتار شد۔ اطبّا کوشش بسیارے در علاجِ اُو بکار بُردند، امّا فائدہ مرتّب نشد۔ چون مائُوس شد بحسرت میگفت کہ: "من ہیچ نمی خواہم، جز اینقدر کہ زندہ بمانم۔" در بیماریِ اُو زمانہ رنگِ دیگر گرفت۔

فقیر کہ خانہ نشین بود، خواست کہ از شہر بدر زند۔ از جہتِ بے اسبابی حرکت مُتعذّر بود۔ برائے نگہداشتنِ عزّتِ من، در خاطرِ نوّاب وزیر الممالک آصف الدّولہ بہادر آصف الملک، گذشت کہ تمیر پیشِ من نیاید، بطلبم۔ نوّاب سالار جنگ پسرِ اسحٰق خان مُؤتمن الدّولہ و برادرِ خُرد نوّاب اِسحاق خان نجم الدّولہ، کہ خالوے وزیرِ اعظم میشوند، نظر بر ربطِ قدیم کہ خالوے من بایشان بود، گفتند: "اگر نوّاب صاحب از راہِ عنایت، جہتِ زادِ راہ، چیزے عنایت نمایند، میر البتّہ بیاید۔" اشارتے رفت کہ چنین باشد۔ ایشان چیزے از سرکار گرفتہ، خطّے بمن بنوشتند کہ "نوّابِ والاجناب شمارا میخواہد، باید کہ بہر طوریکہ دانند، خود را درین جا برسانند۔" منکہ دل برداشتہ نشستہ بُودم، بمجرّد دیدنِ خط، برخاستم و روانۂ لکھنؤ شدم۔ چون ارادۂ الٰہی متعلّق بود، بے یار و یاور، و بے قافلہ و رہبر، در چند روز، از راہِ فرّخ آباد گذر اُفتاد۔

مظفّر جنگ کہ رئیسِ آنجا بود، ہر چند خواست کہ چندے پیش من بمانند، دلِ من آنجا آب نخورد۔ بعد از یک دو روز، روانہ گردیدہ، بمنزلِ مقصود رسیدم۔ اوّل بہ خانۂ سالار جنگ رفتم۔ ایشان، خدا سلامت دارد، عزّت بسیارے نمودند، و آنچہ می

بالیست بجناب بندگانِ عالی گفتہ فرستادند۔

پس از پنج چار روز، اتفاقاً نوابِ عالی جناب، بتقریبِ جنگانیدنِ خروس تشریف آوردند، من کہ آنجا حاضر بودم، ملازمت حاصل نمودم۔ از فراست دریافتہ فرمودند کہ "میر محمد تقی است۔" بعنایتِ تمام بغل گیر شدہ، باخود در نشیمن بُردند و شعرہائے خود مخاطب نمودہ خواندند۔ گفتم: "سُبْحَانَ اللهِ۔ كَلَامُ الْمُلُوْكِ مَلِكُ الْكَلَامِ" از فرطِ مہربانی مُکلّفِ من ہم گردیدند۔ آن روز چند شعرِ غزل التماس نمودم۔ وقتِ برخاستن نواب سالارجنگ گفتند کہ: "حالا میر حسبُ الطلب آمدہ است، بندگانِ عالی مختاراند، جائے برائے ایشان نمایند، و ہر وقتیکہ خواستہ باشند، طلب داشتہ صحبت دارند۔" فرمودند: "من چیزے مُعیّن کردہ پیشِ صاحب می فرستم۔" بعد از دو سہ روز، یاد فرمودند۔ حاضر شُدم۔ و قصیدہٴ کہ در مدح گفتہ بودم، خواندم۔ شنیدند و بلُطفِ تمام در سلکِ بندگان مُنسلک گردانیدند، و عنایت و مہربانی بحالِ من مبذول دارند۔

بعد از آمدنِ من اینطرف، آنجا کہ نجف خان بر بستر اُفتادہ بود فوت کرد۔ کاروبارِ حضور درہمی پذیرفت۔ غلامانِ اُو مثلِ نجف قلی خان و افراسیاب خان و دیگر سرداران ہر کسے بطرفِ خود کشید۔ چندے کشاکش درمیان ماند، آخر مرزا شفیع کہ از برادرانِ اُو بود، و برائے تنبیہِ سکّھان فوج کشی میکرد، باشارہٴ حضور حاضر شد، و عبدالاحد خان را عموے خود قرار دادہ، از قید رہا کرد و دیوانی خالصہ دہانید، و خود بر مسندِ ریاست نشست

سانحہ

چون سفّاک و جرّار بود، ہر یکے از و خطر مند میماند۔ از سرکشیِ غلامانِ نجف خان بے مزہ شد۔ در شہر طرحِ جنگ انداخت، و نجف قلی خان را اسیر ساخت۔ افراسیاب خان آمدہ، در ظاہر بمرزاے مذکور پیوست۔ چون دولتِ این بابا مستعجل بود، چند روز نکشید کہ لطافت خواجہ سرائے، کہ از طرفِ وزیرالممالک بحضور می بود، و فی الجملہ زورے ہم داشت، و فرنگیے از اقرباے سمرو فرنگی، باہم ساختہ، ہیچگاہ اُو را یافتند،

درد از بَر تافتند- پادشاه را نیز فهمانیدند، که این عزیز بے تمیز است- چون آشِ اُو پُختند، و اُو هم خبر شُد یک آش پختن صبر نکرده، از شهر بدر زد، و عبدالاحد خان را با خود بُرد- تا خبردار شدند، خبرِ اُو نیافتند- پادشاه شُقّه ها بمردمانِ شهر و اَطراف نوشت که هر جا که بیابند نگذارند و بحُضور بیارند- نوشتهٔ بسردارِ بلم گره نیز رسید- اتّفاقاً این آنجا رفته فرود آمده بود- سردارے آن قطعهٔ نوشته را نمُود- مُضطرب گردید- عبدالاَحد خان را پیشِ اُو گذاشت، و خود راهِ گریز اختیار کرد- یک منزل، دو منزل، پیش رفته متوقّف گشت- در اکبر آباد، که احمد بیگ همدانی تسلّط داشت بااُو عهد و پیمان درست نموده، بجنگِ یارانِ حُضور مُستعِد ساخت- اُو با بست هزار کس همراهِ اُو شده روانه گشت- این جا فرنگی، و خواجه سرا، و دیگر اعزّهٔ پادشاه را از شهر بَرآورده، خیمه بر لبِ دریا ایستاده کردند غافل از ریسمان تابیدنِ اُو که تا قتل همراه است، بطنطنهٔ تمام قریب رسیدند- پادشاهٔ چون دید که کارِ اُو بالاست، لطافت علی خان خواجه سرائے، و فرنگی را برائے آوردنِ اُو پیش فرستادند- آنها دویدند- خواجه سَرا را گرفتند، و فرنگی را کُشتند- پادشاه بجراَتِ تمام خود را نگهداشت- زورِ آنها نیز پیش نرفت- بجواب و سُوال پرداخته، بسیار کسان را بوعده و وعید از خود ساختند- هرگاه دیدند، که پادشاه بے جنگ و جدل به دست نمی آید، عبدالاحد خان را در میان داده، قول و قَسم بکار بُردند، و اظهارِ رُسوخ و بندگی نموده، از خیمه به قلعه آوردند- نجف قلی خان، و افراسیاب خان، و عبدالاَحد خان، یکدل شده بکارِ پادشاهی دخل کردن آغاز نهادند- با همدانی، که مرزا شفیع وعده و وعید داشت، هیچ نداد- اُو چند توپ و رهکله گرفته روانهٔ اکبر آباد گردید- اینجا بعدِ چند روز اَفراسیاب خان به محالاتِ خود رفت، و مرزاے مذکور با نجف قلی خان در شهر جنگیده، اُو را بدست آورده- پیشِ بیگم که همشیرهٔ نجف خان است، فرستاد- و عبدالاَحد خان، از خانهٔ خود آمده، بچربِ زبانی باز کارِ خود را پیش بُرد- بیگم مسطور، شفیع

شده، نجف قلی خان را وا رہانید، و به جایداد روانه ساخت۔ رفته رفته تسلطِ مرزا شفیع خوب شد۔ بیرونِ شهر آمده متوجّه مُلک گیری گشت۔ چون همه ها ازو دلجمعی نداشتند، افراسیاب آمده، همدانی را آورد، و مقرّر کرد که مرزا برائے دلدہی همدانی به خیمهٔ او بیاید۔ آوردند، و بغدر اورا کشتند۔ بعد کشته شدنِ او دورِ افراسیاب خان شد۔ کارِ ریاست بأو رسید۔ همدانی باز به مکانهائے خود رفت۔ ایشان در حضور امیر الامراء شده، به کارِ پادشاهی مختار گشتند۔

سانحه اینجا، وزیرِ اعظم امیرِ مکرّم، برائے پذیرا شدنِ گورنر بهادر، که از کلکته حسبُ الارشاد می آمد، و غالبِ این تمام مُلک او بود، روانه شدند۔ گردِ فوج تا آسمان میرسید۔ این سفر تا الٰه آباد کشید۔ از آمد آمدِ صاحبِ مسطور، سردارانِ این ضلع همه سرِ حساب شده، مهیّائے دیدنِ او شدند۔ یک منزل پیشتر با نوّابِ گردون جناب ملاقات شد۔ از انجا با خود در لکهنؤ، که محلِّ سکونت است، آوردند۔ و در هر منزل ضیافتے جدائے اتّفاق می افتاد، و خیمه هائے نو و طعامهائے خوب، و اسپانِ ترکی و تازی، و فیلانِ کوه پیکر، کشتی هائے پوشاک، و جواهرِ بیش بها، و شربت هائے خوشگوار، میوه جاتِ لاتُحصٰی، تحفه هائے نغزِ اینجا، شمشیر هائے جنوبی و مغربی، و کمانهائے چاچی —
هرگاه در دارالقرارِ لکهنؤ آمدند، و داخلِ دولت خانه شدند، فرشِ بوقلمون هر روز، در گوشه بالش طلائے لخلخه سوز۔ اطرافِ مکان گلاب پاشیده، بسترِ خواب مالیده، لباس بوے خوش برداشته۔ فرشِ مخمل پا گذاشته، دیوار هائے سیم گل کرده۔ ایوانهائے مرتّب نخمی و پرده۔ بهارِ عنبر طرفه بساطے گسترده، مکان گوے از بهار بند برده۔ پسته و بادام بو داده۔ نُقلِ فرنگی برائے تنقّل نهاده۔ شبها رقصِ زنانِ پری وش۔ نَے نَے از حورانِ بهشتی هم دلکش۔ گلدانهائے شیشه و چینی بسلیقه چیده۔ طاقها پُر از میوه هائے رسیده۔ رقصِ فرنگی۔ تماشائے خوشی۔ خانه جائے خوشی۔ هوائے خوشی۔ شامِ سیم بندی

کردہ، آتش بازی می آوردند۔ ستارہ و ہوائی سر بہ فلک میزدند تماشاے چراغان دل از دست ربودے۔ مہتابی شب را روز می نمودے۔ سایبانِ زربفت باین خوبی کشیدہ کہ دیدۂ خورشید مثلِ اُو ندیدہ۔ امیران، سرگرم پاسداری۔ راجہ ہا در خدمت گذاری مدح خوان شاعرانِ مربوط۔ جوانانِ مضبوط۔ در ہر خانہ، دار لبستِ خوب۔ ظلِ ممدود و ماءِ مسکوب۔ نرگس دانہا برابر، جلوہ پرداز چون باغ بنظر۔ برف بہ از سیمِ مذاب۔ خوب برآمد از آب۔ گلہاۓ فالودہ الوان۔ شربت آن شیرۂ جان۔ اقسامِ نان در وقتِ طعام۔ نانِ بادام بنزاکتِ تمام۔ شیرمال، باقرخانی، برخورشید گرمِ نوا خوانی۔ نانِ جوان بآن گرمی وخوبی بود، کہ پیر از خوردِ آن، پیر افشانی می نمود۔ نانِ ورقی چنان کہ اگر وصفش کنم دفتر شود۔ نانِ زنجبیلی کہ ذائقہ از درکش محظوظ تر شود۔ انواعِ قلیہ و دو پیازہ درمیان نہادہ۔ نان مہمانان ہمہ بروغن اُفتادہ۔ اقسامِ کباب بر دستارخوان کشیدہ۔ کبابِ گل بخوبی و تازگی رسیدہ۔ کبابِ خوش نمکِ ہندی، دلہارا از دست می برد۔ کبابِ قندہاری امزجہ سوے خود می آورد۔ کبابِ سنگ از سختی کشیدگان راہ کوفت زائل میکرد۔ کبابِ ورق عجب نسخۂ برشتہ بود کہ طبائع را مائل میکرد۔ کبابہاۓ متعارف ہمہ بامزہ و بانمک۔ قابہا دہ دہ گذاشتہ پیشِ یک یک۔ پلاؤہا انواع و آشہا اقسام۔ عجب آش در کاسہ۔

مہمانے باین وفور، میزبانے ہمچو دستور، مہمانے باین شوکت، میزبانے باین دولت، مہمانے باین حُسنِ اخلاق، میزبانے باین ریاستِ آفاق، مہمانے باین خوبی، و خوش معاشی، میزبانے چون خورشید باین زر پاشی۔ مہمانے باین عقلِ کامل، میزبانے باین لطفِ شامل، چشمِ روزگار ندیدہ، و گوشِ عقلا نشنیدہ۔ بدین گونہ روز و شب تا شش ماہ گفت و شنود و باہم معاش و مشورت و صحبت بود۔

ہرگاہ این خبر بہ حضور رسید، ہر یکے از اُمرایانِ آنجا بفکرِ خویش اُفتاد۔ عبدالاحد خان

کسان را اینجا فرستاد، با فرنگیان ساخت ۔ اَفراسیاب خان وغیرہ را گمان شد کہ فرنگی اینجا خواہد آمد۔ چون زبردست است، بادشاہ را بطورِ خود نگاہداشتہ آشِ ما خواہد پُخت، بہتر آنست کہ پادشاہ را باکبرآباد ببَریم، و مردمان را گرد آوَریم، و مرہٹہ کہ متصرفِ رانا ے گوہَد والہ است، از آنِ خود کردہ پیغام با فرنگی کنیم ۔ اگر جنگ اِتّفاق اُفتد، اُفتد۔ وگرنہ ازین دَبدبہ ہمانجا باشند۔ چنانچہ پادشاہ را بَرآوردہ، باکبرآباد رفتند و در راہ عبدالاَحد خان را محبُوس ساختند۔

سانحہ | وقتیکہ بہ شہرِ مسطوُر رسیدند، پادشاہزادۂ جوان بخت ازانجا گریختہ، پیشِ نواب وزیر و فرنگی آمد۔ مضطرب با مرہٹہ عہد و پیمان دُرست کردند۔ او جانبِ ایشان گرفتہ، گفت و شنودِ فرستادنِ شہزادہ درمیان آوردند۔ اینجا فرنگی بزبان داشتہ، کارِ ملکِ خود کہ کلکتہ باشد، مدِّ نظر داشت۔

بعد چندے، پادشاہزادہ را ہمراہ گرفتہ، از وزیرالممالک رخصت شد و رفت۔ ہنگامِ وداع، بمردمانِ صاحبِ نوّاب والاجناب، چنان انعامِ بے اِحصار مبذُول داشت کہ در قیاس نگنجد۔ بہر کس اسپ و فیل و قبائے۔ بہر بے سَر و پا سراپائے۔

چون صاحب از راہِ دریا متوجّہ شد، و وزیر بدارالقرارِ خود آمد، مرہٹہ و افراسیاب خان با محمّد بیگ ہمدانی اِرادۂ پرخاش کردند۔ اُو ہم سَر فرود نیاوردہ، بجنگ اینہا ایستاد۔ و درہمین اثنا، کسِ میر زین العابدین، برادرِ مرزا شَفیع، خنجرے بافراسیاب خان حوالہ کرد۔ بعد از دو چار روز مُرد۔ حالا سردارے در حضور نیست۔ پادشاہ بے زور است۔ غالب کہ دَور دَورِ مرہٹہ شود۔

بعدِ این سانحات، فوجِ مرہٹہ، و محمّد بیگ ہمدانی، باہم جنگیدند۔ چون دست برو نیافتند، غدر کردہ ہمدانی مذکور را بگیر آوردند۔ اینجا صاحب کہ پادشاہزادہ را باخود بُردہ بود، رخصت کرد۔ چنانچہ برگشتہ آمدہ اند۔ یا در اطراف می مانند، یا پیشِ پادشاہ

می رسانند۔ بالفعل سایۂ دولتِ نوّابِ عالی جناب می گیرند۔ اُنچہ ایشان می گویند می پذیرند۔

اینجا فقیر با نوّابِ عالی منزلت است۔ در دعا گوئیِ ایشان بسر می کند۔ بندگانِ عالی برائے شکار تا بہرائچ رفتند۔ من در رکاب بودم۔ شکار نامۂ موزوں نمودم۔ بارِ دیگر باز برائے شکار سوار شُدند، تا دامنِ کوہِ شمالی تشریف بُردند۔ اگرچہ مردمان از نشیب و فراز این سفرِ دُور و دراز سخت خوردند، لیکن شکارے چنین، و فضائے چنین، و ہوائے چنین، ندیدہ بودند۔ بعد از سہ ماہ بدار القرارِ خود آمدند۔ فقیر شکار نامۂ دیگر گفتہ بہ حضور خواند دو غزل از غزلہائے شکار نامہ انتخاب زدہ، خود بہ دولت مُخمّس کردند۔ بہ خوبیے کہ می بایست۔ و در زمینے غزل پسند اُفتادہ، غزلِ دیگر فرمایش نمودند۔ آنہم از فضلِ الٰہی گُفتہ شد۔ زبانِ مبارک بہ تحسین کُشادند، و دادِ سخنوری دادند۔

درین ایام بسببِ آبگردش بعدِ عشرۂ محرّم الحرام ... در مزاجِ عالی شد (کذا) اِستعلاج نمودند۔ نصیبِ اعدا ر بطُول کشید۔ عالمے از خیر و خیرات بہرہ اندوز شد و ہر کسے دست بدعا افراشت۔ حکیمِ مُطلق، و شافیِ برحق، شفا داد۔ بر ما و بر عالمیان منّت نہاد۔ ع

الٰہی تا جہان باشد تو باشی

سانحہ | چون در حضورِ پادشاہ از غلامانِ نجف خان کہ مُسلّط بودند، کسے نماند، مرہٹہ کہ قریب بُود، تسلّط بہم رسانیدہ کوسِ لِمَنِ المُلک زد۔ پادشاہ مرہٹہ را مختار ساخت و رُدہائے مردمانِ نجف خانی بخاک انداخت۔ اکثر مشورہ بہ اُو دارند۔ و اُمورات را بطورِ اُو می گذارند۔ فوجِ مرہٹہ بہ شاہجہان آباد ہم رفت۔ زبان زد است کہ تسلّط یافت۔ سکھان کہ اطرافِ شہر را می تاختند، حالا سرِ حساب

شده اند- چراکه کمانِ دکھنیان نمی توانند کشید و بگرو میدان داری اینان نخواهند رسید- پادشاه، بیرونِ شهر اکبرآباد خیمه داشته، پس از چند روز روانهٔ دہلی شُدند- عبدالاحد خان را در علی گڑھ، که در تصرفِ ہمشیرهٔ نجف خان است، اکثر مردمانِ نجف خان دران قلعه جمع اند، فرستاده مُقید ساختند، مرہٹہ مالکُ المُلک است- ہرچه میخواہد میکند- پادشاه را چیزے دست برداشته میدہد، و ہر جاکه میخواہد می بَرد- چنانچه در شہر یک ماه ماند، و به علی گڑھ بُرد- ده پانزده روز به جنگ کشید- آخر به عہد و پیمان بیگم را برآورده، ازو چیزے از مالِ نجف خان گرفت و گذاشت-

ازانجا پادشاه را بر راجپوتان بُرد- آنہا اِستادگی کرده اند- بعد از چند روز صُلح از راجپوتان نموده، پادشاه به شہرِ دہلی آمد و مرہٹہ در شہر اکبرآباد ماند- چون خیالِ راجپوتان در سَر داشت، باز فوج کشی کرده، بآنطرف رفت- راجه ہا ہمدانی را که سردار نجف خانی بوُد، طلب داشته رفیقِ خود کردند- جنگ بمیان آمد- ہمدانی جراٴت نمود و کُشته شد- سرداری بجاے اُو مرزا اسمعیل، که ہمشیرزادهٔ اُو بود، یافت- این بابا به جسارتِ تمام جنگید، بلاے مرہٹہ را بَرچید- شکستِ فاحشے شُد- آلاتِ جنگ و اسبابِ مرہٹہ بالکل رفت- جانِ خود را غنیمت دانسته گریخت و باکبرآباد آمد- آنجا ہم مرزا اسمعیل رسیده، ازان شہر برآورد- و قلعه را خود چسپید- جنگِ قلعه بطول کشید- مرہٹہ طرفِ خود بطرفِ دیگر دید- پادشاه از شہر برآمده، به نجف قلی خان که جانبِ حِصار بوُد رفت- آنجا جنگ بسیار شد- آخرالاَمر از نجف قلی خان چیزے گرفته به شہر رسید-

درین حال، پسرِ ضابطه خان، که غلام قادر نام داشت، بعد از پدرِ خود مُتصرفِ سَہارنپور وغیره بود، زورے بہم رسانیده- و فوجِ سکھان را ہمراه گرفته آمد- اکثر محالات پادشاہی که میانِ دوآبه بودند، ضبط کرد- قریب رسیده، از بادشاه چیزے خواست- پادشاہ جواب داد- او آن روے آب مورچال بسته، ہیلے جنگ شد- چنانچه یک ماه کسرے

زیادہ جنگید- بادشاہ اگرچہ فوج و زورے نداشت، بدندان چسپیدہ آن بلا را برچید- ازانجا برخاستہ تا گردِ اکبرآباد تسلّط کرد- اینجا کہ مرزا اسمٰعیل بیگ در شہر بہ قلعہ چسپیدہ بود، زورِ آن را دیدہ دستار بدل شد، و عہد و پیمان بمیان آمد کہ با مرہٹہ ما و شما بالاتفاق خواہیم جنگید- بعد از چند روز، مرہٹہ کہ ارادۂ آنطرفِ چنبل داشت، یلغار کردہ رسید- درین روزہا اینجا شاہزادۂ صاحب عالم بود، لیکن تغافل کرد- تنہا جنگ بر سرِ مرزا اسمٰعیل اُفتاد- آن بابا پائے جسارت فشردہ این جنگ را ہم زد- مرہٹہ گریختہ آن طرفِ گوالیاُر کہ در تصرّفِ اُو بود اقامت کرد- بعد از چندے فوجِ دیگر طلب داشتہ، سرگرمِ پرخاش شد- دہ پانزدہ روز، در ظاہرِ اکبرآباد جنگ شد- آخر شکستِ مرزا اسمٰعیل اتفاق اُفتاد- غلام قادر خان تماشائی ماند- مرزائے مذکور فرار کردہ، پیشِ غلام قادر آمد- این را دید کہ در احتیاطِ خود است، و بکارِ من نمی پردازد، ناچار پیشِ اُو ماند، و بعد از چند روز ارادۂ ملکِ خود نمودہ روانہ شد-

ناظرِ پادشاہ کہ غلام قادر را پسر خواندہ بود، نوشت کہ شما اینجا بیائید گفتۂ من پادشاہ نمی شنود، یعنی طرفِ مرہٹہ نمی گذارد- ایشان ہر دو بہ شہر رفتند- پادشاہ خود زورے نداشت، بہ مشورتِ ناظرِ نمک بہ حرام، بندوبست در قلعہ کردہ، بادشاہ را برداشت، و سلوکے کہ نمی بایست، کرد- و تمام قلعہ را غارت کرد، و با پادشاہزادہا آنچہ نکردن بود کرد- زرِ بسیارے بدستش آمد- چشمِ بادشاہ برآورد، و پادشاہِ دیگر کرد- چون تسلّطِ کلّی یافت ناظر را نیز قید نمود، و بر شہر ہم کار تنگ گرفت- چون غلبہ از حد فزون گشت، از مرزا اسمٰعیل بے ہیچ ہمزہ شد، و در چیزے دادن کوتاہی کرد- آن عزیز با مرہٹہ صلح کرد- درین ہنگام فوجِ مرہٹہ قریب رسید- بعضے از سرداران داخلِ شہر شدند- روہیلہ قلعہ بند گشت و ہنگامِ شب از راہِ خضری دروازہ، مع فوج و اسباب و زر و مالِ خود، و پادشاہ زادہا را و ناظر را و لواحقانِ اُو را نیز ہمراہ بُرد- نزدِ شاہدرہ با فوج—

سنگ بستہ اِستادگی کرد- آخرالامر مرہٹہ ہا بے حیائیِ اُو دیدہ آن روے آب رفتہ، مُقیدِ جنگ شدند- گاہے ایشان غالب می آمدند، و گاہے آن ملعون- چون قریب یک ماہ کشید، علی بہادر نام سردارے از دکن آمد، و گرمِ جنگِ روہیلہ شد- بعد از دو سہ جنگ، بجراَتِ تمام اُو را اسیر کردند- مال و اسباب مع پادشاہ زادہا ازو گرفتند، و قید داشتند- و پادشاہ ہمان شاہ عالمِ کور را مقررّ داشتند و قلعہ را حوالۂ جاٹان نمودند، و صد روپیہ روز بہ بادشاہ می دہند، و بر تمام مُلک متصرّف اند، آن ملعون را بجواریِ تمام کُشتند- حالا پادشاہ مرہٹہ است- ہر چہ می خواہد کند- باید دید کہ چنین تا کجا خواہد بُود-

القصہ جہان عجب حادثہ گاہیست[۱]- چہ مکانہا خراب گشتند، و[۲] چہ جوانان[۳] از ہم گذشتند- چہ باغہا ویرانہ شدند- چہ بزم ہا افسانہ شُدند- چہ گُلہا افسردند، چہ خوبان مُردند- چہ مجلسہا بَر شکستند- چہ قافلہا رَخت بستند- چہ عزیزان ذلّت کشیدند چہ مردمان[۴] بجان رسیدند- این چشمِ عبرت بین چہا دید، و این گوشِ شُنوا چہا شُنید-

ہر کاسۂ سر ز افسرے میگوید
ہر کہنہ خرابہ از دَرے میگوید
دنیاست فسانہ، پارۂ ما گفتیم
وان پارہ کہ ماند، دیگرے میگوید

درین مدّتِ کم، این[۵] یک قطرۂ خون کہ دلش نامند، انواعِ ستم کشید، و ہمہ خون گردید- مزاجِ ناسازے داشتم، ملاقاتِ ہمہ کس گذاشتم- (از فاقہ ہا بجان رسیدم- مرزائی از کسے نکشیدم[۶])- اکنون کہ پیری رسید، یعنی عمرِ عزیز[۷] بہ شصت سالگی کشید[۸]، اکثر اوقات

---

۱ ن ۱: گاہست- ۲ ن ۱: واؤ ندارد- ۳ ن ۱: خوبان- ۴ ن ۱: مردان-
۵ ن ۱: این ندارد- ۶ اضافہ از ن ۱- ۷ ن ۱: عزیز ندارد- ۸ ن ۱: بہ پنجاہ کشید-

بیمار می باشم - چندے دردِ چشم کشیدم - ضعفِ بصر بہ چشمِ خود دیدم - عینک خواستم، و دست بہم شودم - نظر برین شعر ترکِ نظر بازی نمودم -

دیدہ چون محتاجِ عینک گشت، فکرِ خویش کُن
بر نفَس دارند، روزِ واپسین آیینہ را

از وجعِ اَسنانِ[۵۱] خود چہ گویم - حیران بودم[۵۲] کہ چارہ تا کجا جویم - آخر دل برکندم، و یک یک را از بیخ بَرکَندم -

روزیِ خود را برَنج، از دردِ دندان می خورم
نان بخون تَر می شود، تا پارۂ نان می خورم

غرضکہ، از ضعفِ قُویٰ، و بیدماغی و ناتوانی و دِل شکستگی، و آزردہ خاطری، معلوم می شود کہ دیر نخواہم ماند - زمانہ ہم قابلِ ماندن نماندہ است - دامن باید افشاند - اگر خاتمہ بخیر شود آرزوست - وگرنہ اختیار در دستِ[۵۳] اوست -

---

۵۱ ن ۱: وجع الاسنان - ۵۲ ن ۱: حیرانم - ۵۳ ن ۱: بدست -

فرہنگِ ذکرِ میر

یعنی فارسی متن میں استعمال ہونے والے
الفاظ و محاورات کی فرہنگ

فرہنگ ذکرِ میرؔ

الف

الفاظ	معانی
آب از گلو بُریدن	یعنی پانی پینے سے روکنا یا باز رہنا۔ بچّے کا دودھ چھڑایا جائے تو اُس موقع پر بھی کہتے ہیں "فلانی طفل را از شیر بُرید" ع گلو بُریدہ درین بحر ہم چو ماہی باش۔ (محمد قلی سلیم)
آب بدستِ کسی ریختن	خدمت کرنا۔ تواضع کرنا۔ کسی شخص کا نوکر یا ملازم ہونا۔ عجز و الحاح کے اظہار کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ (بہار)
آب بر آیینہ ریختن و آب بر آیینہ زدن	یہ ایک ایرانی رسم ہے کہ جب کوئی شخص سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اُس کے جانے کے وقت آیینے پر ہرے پتّے رکھ کر پانی بہاتے ہیں اور اِس سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ مسافر جلد اور بخیریت سفر سے واپس آئے گا۔ (بہار)

آب بُردنِ ماجری	نہایت مشکل، انوکھے اور انہونے کام کے رُونما ہونے پر بولا جاتا ہے ؎ غیر از برائے یار مئے ناب می بَرد این ماجرا ببین چقدر آب می بَرد (محسن تاثیر)
آب تاختن	پیشاب کرنا۔ یہ لفظ ذخیرہ خوارزم شاہی میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ (بہار)
آبِ چشم از کسے گرفتن	آبِ چشم میں اضافت ہے۔ ڈرانے کے معنوں میں آتا ہے۔ صرف "آبِ چشم گرفتن" بھی مستعمل ہے۔ (بہار)
آبِ حسرت بچشم گردانیدن	یہ لفظ دیدہ و دہان و حلق کے ساتھ بھی آتا ہے۔ صائب ؎ خیالِ روے تو تا در کدامین سینہ می گردد کہ آبِ حسرت اندر دیدۂ آیینہ می گردد
آبِ حکیمانہ خوردن	بہت احتیاط اور سُوجھ بُوجھ سے کام کرنا۔
آب خور	خورش ہونا۔ قسمت و روزی۔ (بہار)
آب خوردن	اعتبار کرنا۔ پرورش پانا۔ دل کا قوّت حاصل کرنا، خوش ہونا (بہار)
آب را بار ریسمان بستن	امرِ محال۔ فضُول کام کرنے کی کوشش کرنا۔ بعض نے اِس کا مفہوم 'غلبہ حاصل کرنا' بھی لکھا ہے۔ (بہار)
آب کشیدن	پانی پینا۔ کنوئیں وغیرہ سے پانی نکالنا۔ (بہار)
آب گردش	"تغیرِ آب وہوا وجاے بیمار۔ وہ بیماری جو آب وہوا کی تبدیلی سے پیدا ہو۔ نیز بمعنی قسمت و روزی و گردشِ زمانہ" (بہار۔ وارستہ)
آب گیر	میرؔ نے حوض کے معنوں میں لکھا ہے۔ عام لغات فارسی میں نہیں مِلتا۔ آب گیری تیغ و خنجر پر دھار چڑھانے کو کہتے ہیں۔
آتشِ جوع زبانہ می کشید	زبانہ کشیدنِ آتش کا مطلب ہے آگ کا بھڑکنا اور تیز شعلے

نکالنا۔ یہاں شدید بھوک سے کنایہ ہے۔ میر نے ایک شعر میں بھوک کے لیے "دَون لگنا" بھی باندھا ہے جو جنگل کی بے قابو آگ کے لیے بولا جاتا ہے۔

آتش بَر کردن — آگ بھڑکانا۔ (بہار)

آجام — شیر کی کچھار۔ اور قلعہ

آخر — ختم ہونے کے قریب ہونا۔

آدمی رَوِشی — اِنسانیت

آدمی گیری — بہار میں آدم گری و آدمی گری آیا ہے ؎

گفتی زرہ لطف کہ میلیؔ سگ ماست
شرمندہ آدمی گری ہائے توام

آرزو گرفتن — کوئی خواہش پیدا ہونا۔ کسی خواہش سے مغلوب ہونا۔

آستین افشاندن — از چیزے و بر چیزے بمعنی رُوگردانی و ترک کرنا۔ کنایہ از رقص و سماع۔ میرؔ نے ذرا مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ (بہار)

آستینِ کہنہ داشتن — بے سروسامان اور مُفلس ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو "شالِ کہنہ داشتن"۔ آرزوؔ نے لکھا ہے کہ این از اہلِ زبان بتحقیق پیوستہ۔ اور وارستہ نے (مصطلحات ۱۰-۱۱) مثال میں سعید اشرف اور اسمٰعیل ایما کے اشعار پیش کیے ہیں۔ (بہار)

آسمانِ دو رنگ — مراد بے مہر، ناقابلِ اعتبار، منافق جس کا ظاہر و باطن مختلف ہو (بہار)

آفتابہ — پانی استعمال کرنے کا معروف ظرف ہے۔ یہ دراصل آب اور تابہ (تاب بمعنی گرمی) تھا۔ جس برتن میں پانی گرم کیا جائے اُسے

کہتے ہیں تا بہ کی ب یہاں ف سے بدل گئی ہے۔ (دیکھو بہارِ عجم تحت۔ آفتاب)

آفتابی — یہ لفظ لُنگی کے لیے بولا جاتا ہے۔ قدیم لغات میں نہیں ملے گا۔ بہار نے اِسے محاورۂ لوطیاں بتایا ہے۔ آرزو نے لکھا ہے "لُنگی کہ در حمام بکمر بندند.... این معنی بتحقیق پیوست" اور دوسری جگہ اس کی وجہ تسمیہ بتائی ہے کہ "....لنگ را گویند زیرا کہ اکثر آن را آفتاب داد۔ می شود از جہتِ تر شُدن۔ مثلاً شخصے بحمام رود و لنگ نداشتہ باشد بحمّامی گوید کہ آفتابی بیار۔ و ایں معنی از اہلِ زبان بتحقیق رسیدہ"

آفتابی از سایۂ شان میدمد — کنایہ از غایتِ بزرگی و جلال۔

آماس بہم رساندن — سُوج جانا۔ ورم پیدا کر لینا۔

آنِ سیّال — گزرتا ہوا، ناپایدار وقت۔

آن طرفِ ترِ آسمان — آسمان کے بھی اُس پار

آویزش نمودن — لٹکانا۔ جھگڑا کرنا۔

آیینہ بپیشِ نفَس [و بر نفَس] داشتن — "نزع کے وقت مریض کا سانس دیکھنے کے لیے نتھنوں کے سامنے آئینہ رکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ مُردہ ہے یا سکتہ کے عالم میں ہے۔" میر نے محمد سعید اشرف کا یہ شعر لکھا ہے ؎

دیدہ چوں محتاجِ عینک گشت فکرِ خویش کن
بر نفَس دارند روزِ واپسیں آیینہ را

ابرو ترش کردن / ابرو تنگ کردن — غصہ کرنا۔ بے دماغ ہونا۔

احسان بہشت کردن	بڑا احسان کرنا۔ غیر معمولی سلوک (بہار)
احوال گیری کردن احوال کسے گرفتن }	حال دریافت کرنا۔ بیمار پُرسی کے لیے جانا
اختیارِ دل بدستِ کسی دادن	کسی کا ہو جانا۔ عشق کرنا۔
اراک	پیلو کا درخت
از آب بد بر آمدن	"از آب بر آمدن کا مطلب ہے ظاہر ہونا۔ تنزّل سے ترقّی کی طرف جانا۔ نیچے سے اُوپر اُٹھنا۔ یہ 'خُوب' اور 'بد' دونوں لفظوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً خوب از آب بر آمد (اچھّی طرح کسی کام سے عہدہ برآ ہونا) یا از آب بد بر آمد (کام کا حق ادا نہ کرسکا) یہاں آب پر اضافت نہیں ہے۔ آرزو نے یہ محاورہ بھی ذاتی تحقیق سے لکھا ہے قدیم لغات میں نہیں ملے گا۔" (بہار)
از آب خوب بر آمدن	"دیکھو تحت "از آب بد بر آمدن"
از پا اُفتادن	گر پڑنا، ایک حالت سے دوسری حالت میں آجانا، اُکھڑ جانا۔
از پیش بدر رفتن	پانوٗ اُکھڑ جانا، ہمّت ہار جانا۔
از پیش برداشتن	بھگا دینا، شکست دینا۔
از پئے کسے رسن تافتن (و ریسمان تافتن)	کسی کا بُرا چاہنا، کسی کو پھنسانے یا نقصان پہنچانے کے کام کرنا۔
از جہانی بجہانی آمدم	ایک دنیا سے دوسری دنیا میں آگیا (فاصلے کے علاوہ احوال و ظروف کا فرق بھی ظاہر کرتا ہے)
از چوبِ خشک تراشیدن	جہاں بظاہر امکان نہ ہو وہاں مواقع پیدا کرلینا۔ (بہار)
از خود رمیدن	تیاگ اور تجرید مراد ہے۔ فنائے نفس۔

از خود کردن	ساتھ ملانا۔ موافق بنا لینا۔
از سایۂ خود ہم گریزاں	انتہائی خلوت پسند۔ گوشہ نشین۔
از سرِ تبوی	کسی مقام کو مستقر بنا لینا۔ پڑاؤ ڈالنا۔
از سرِ سوزن بروں شدن	"کسی مشکل مرحلہ سے بکمال سہولت گذر جانا" (بہار)
از سر وا کردن	جدا کرنا۔ دور ہٹانا
از سنگر و سنگ چین برآمدن	سنگ چین جھوٹا احاطہ، دیوارِ سنگی، مراد ہے اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آنا۔
از صحرا یافتن	مفت ہاتھ آجانا۔ بے محنت و طلب مل جانا۔
از طاقِ دل افتادن	دل سے اُتر جانا۔ خوار و بے اعتبار ہونا
از فکر افتادن	کسی چیز کا دھیان نہ آنا۔ خیال سے اُتر جانا۔ (بہار)
از کار رفتن	ناکارہ و معطل ہو جانا۔
از گردِ راہ رسیدن	سفر سے تھکے ماندے آنا۔ (بہار)
از ما چہ می کشاید	ہم کس قابل ہیں، ع: ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا۔
از نگاہِ گرم رنگ باختن	ذرا سی تیز نگاہ کی بھی تاب نہیں لاسکتے۔
از ہم گذشتن	اپنے آپ سے گذر جانا۔ بے نفس۔ مجازاً مرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔
از ہم گزشتنِ کار	کسی کام کا درہم برہم ہو جانا یا نقصان ہونا۔ اور از ہم گذشتنِ معاملہ کسی کام کا نپٹ جانا ہے۔ (بہار)
ازین دست تا بآن دست	میر نے اِس سرے سے اُس سرے تک کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ فارسی میں ازین دست کا مفہوم "ازین وضع" بھی ہے۔ (بہار)
اِستحالہ	تبدیلِ ماہیت۔ ایک شکل یا حالت سے دوسری میں پہنچ جانا۔

استخوان شکستن	کنایہ ہے کمال محنت ومشقّت سے۔ (بہار)
استظہار	پشت پناہی کرنا۔
افسون دمیدن	جادو کرنا۔ مکر وحیلہ کرنا
اِقامت	بمعنی درجائے بودن وتمکّن گرفتن وبالفظِ کردن وبمعنی ضیافت شخصی کہ ازجائے وارد شود، بالفظِ فرستادن۔ (بہار)
اَقران	ہم عصر، ہم رتبہ لوگ
اَقمِشہ	قماش کی جمع۔ لباس
اگر صد کوزہ بسازد یکے دستہ ندارد	کنایہ ہے کہ فلاں شخص اگر سو باتیں کہتا ہے تو ایک بھی سچ نہیں ہوتی۔ بڑا دروغ باف ہے۔
اِلتماس	وہ کاغذ جس پر چھوٹے اپنا احوال لکھ کر بزرگوں کے سامنے پیش کریں۔ عرضی درخواست۔ شفاعت اور سفارش کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ (بہار)
الف بر زمین کشیدن الف بر خاک کشیدن	خجالت اور شرمندگی اُٹھانا۔ مذہبِ امامیہ میں رسم ہے کہ میّت کو دفن کرنے کے بعد سات بار سورۂ اِنّا اَنزلناہُ پڑھتے ہیں اور ہر بار قبر پر ایک لکیر کھینچتے جاتے ہیں۔ (بہار)
الفہا بر سینہ بُریدن	"الف بر سینہ کشیدن محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں رنج اُٹھانا، صدمہ برداشت کرنا۔ اکبؔر کی تاریخِ وفات کا مصرع ہے: "الف کشیدہ ملائک زفوتِ اکبر شاہ" اگر ذکرِ میر کے متن میں یہ غلط نقل نہیں ہوا ہے تو میرؔ نے اس محاورے میں تصرف کیا ہے۔ یہ ایران کی رسم ہے کہ عاشق، قلندر اور ماتمی لوگ سینے پر الف کھینچ لیتے ہیں، کبھی نعل یا داغ بھی لگا لیتے ہیں۔ (بہار)
اُلوس	قوم وقبیلہ۔ برادری۔ یہ ترکی لفظ اُلوش ہے۔

انجمن شدن	جمع ہونا۔ فراہم کرنا۔
انداز کردن انداز نمودن	ڈھونڈنا۔ قصد کرنا۔ رُونما ہونا۔ ظاہر ہونا۔ ارادہ کرنا۔
اندیشہ	بمعنی ہراس۔ خوف۔ فکر و تامل۔
انگشت برآوردن	پناہ طلب کرنا
انگشتر	یعنی چیزے قلیل مجازاً۔
انگشترِ پا	چیزے بے اعتبار (بہار)
اہلِ بخیہ	ہم مشرب۔ رازدار۔ بعض نے رِند اور خراباتی کیلیے استعمال کیا ہے۔
این راہ دور دست بدست است	یہ راستہ نزدیک ہو جاتا ہے۔

ب

با تیغ و کفن آوردن	کمال عاجزی اور عذر خواہی کے ساتھ آنا۔ غالب: 'آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں'
بادِ بُرّاقی	ڈینگ مارنا، ہرزہ گوئی
بادلیج	توپ کی ایک قسم (یہ بادلیش کا معرب ہے، ترکی زبان میں توپ کو کہتے ہیں)
بادِ مکری	جو مقصود ہو اُس کے خلاف کہنا، مکاری
بار بستن	رخصت ہونا، بار بستنِ زبان، عدم طاقتِ گفتار (چراغ)
با کسے دریک پیرہن بودن	ایک جیسا ہونا، کسی کے مثل ہونا
بالا چاقی	بالادستی، اقتدار، غلبہ، ہوشیاری
بالائے چشمت اَبرو گفتن	ٹوکنا۔ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ ادنیٰ التفات
بالشِ نرم زیرِ سر گذاشتن	خاطر مدارات کرنا، خوشامد کرنا، خدمت کرنا
بالقوۂ خصمانہ داشتن	مقابلہ کرنے کی قوت، ٹکر لینے کی صلاحیت

بجا اُفتادن	کسی جگہ رہ جانا، کہیں جاکر فوت ہوجانا
بہ خود فرو رفتن	سوچ میں پڑ جانا، متفکّر ہونا
بَدّال	بنیا، دکاندار، بقّال
بَد باختن	بُرا سلوک کرنا، بُرا کھیل کھیلنا
بدنُمو	دیکھنے میں بُرا، بے ڈھنگا ہونا
برادر اَندر	برادرِ علاتی۔ وہ بھائی جس کی ماں دوسری ہو باپ ایک ہو۔
بر پلہ آوردن	کسی بات پر راضی کرلینا
بر خاک انداختن	ذلیل و رسوا کرنا، شکست دینا، عاجز کرنا
بر خود پیچیدن	مغرور و متکبّر ہونا
بر خود چیدن	غرور، تفاخر، خود کو کچھ سمجھنا
برخوردن	ملاقات کرنا، نفع یاب ہونا، فائدہ اٹھانا
بر روے کار آوردن	کسی کام کے لیے تیار کرنا
بَرزَن	کوچہ، گلی (غیاث، رشیدی)
بر سرِ سنگ نشستن	تکلیف اُٹھانا، عذاب جھیلنا
بر سرِ کسے دوانیدن	ایسی بات یا کام کرنا جس سے کسی کو غصّہ آئے
بر قالب زدن	بیہودہ کام، ہرزہ گوئی (چراغ)، مہیّا کرنا، سرانجام دینا (وارستہ)
بر کار بستن	کسی کام پر متعیّن کرنا
بر کار سوار شدن	کسی کام میں سخت محنت کرنا، کسی کام پر متعیّن ہونا
برگ بند	درویش، بے سروسامان
بَرہ بندِ کار بودن	کسی کام کے لائق ہونا، ماہرِ فن ہونا
بُزآویزی	ظلم، ایذادہی، الٹا لٹکا کر تکلیف دینا
بُزگاہ	قتل گاہ، جہاں سزا دی جائے، چوروں اور ڈاکوؤں کا علاقہ
بستہ نگار	ایک راگ کا نام

بکرتراشی	تازہ گوئی، معنی آفرینی
بکرنگاہ	شرمیلی آنکھوں والے
بلند انداختنِ کسے	خوب پذیرائی کرنا، بہت تعریف کرنا
بناگوشی زدن	کنپٹی پر تھپیڑ مارنا
بند بر بندِ قبا بافتن	اکٹھا ہونا، یک جا ہونا
بنگ از کلہ پریدن	سٹی گم ہونا، ہوش اڑ جانا
بوے فتیلہ آمدن	کسی بات کا وہم ہونا، شبہ ہونا (ہرن کو جب بندوق کی بو محسوس ہوتی ہے تو بھاگنے لگتا ہے)
بہ آہو سوار شدن	ہوا کے گھوڑے پر سوار ہونا، عجلت کرنا
بہار بند	بہارستان، چمن (اُس گھر کی نسبت سے جہاں موسم سرما میں مویشیوں کو باندھتے ہیں)
بہ پشتِ کمان گرفتن	تیروں کی بارش کر دینا
بہ پلکے در بند است	ذرا سے اشارے پر موقوف ہے
بہ چشم خوردن	نظر لگانا، حسد سے دیکھنا
بہ خود سپردن	مغرور ہونا، خود کو بہت بڑا سمجھنا، گھمنڈ
بہ خود فرو رفتن	اپنے آپ میں کھو جانا، فکر کرنا
بہ درِ تغافل زدن	غافل ہونا
بہ دستِ کم برداشتن	کسی کو حقیر اور عاجز سمجھنا
بہ دست و دندان چسپیدن	نہایت کوشش کرنا
بہ دل خوردن/چسپیدن	پسند آنا، دل کو بھانا
بہ دماغ خوردن	ناگوار ہونا
بہ دہن ہا افتادن	شہرۂ عام ہونا، موضوعِ گفتگو بن جانا
بہ زبان نگاہ داشتن	چاپلوسی کرنا، جھوٹے وعدے کرنا

بہ سرِ پا نشستن	سفر کے لیے آمادہ ہونا
بہ سرِ خانہ رسیدن	کسی منزل تک پہنچ جانا، مقصود حاصل کر لینا
بہ سرِ دست آمدن	تمام ہونا، ختم ہونا
بہ سرِ وقت اُفتادن	اچانک وارد ہونا
بہ طرح فروختن	زبردستی کسی کے ہاتھ فروخت کرنا، یا کسی دکان پر مال ڈال دینا بعد کو قیمت وصول کرنا
بہ عصا راہ رفتن	پھونک پھونک کر قدم رکھنا، احتیاط سے چلنا، راستے کا دشوار ہونا
بہ مسمار دوختن	سنبھالے رکھنا، ضبط کرنا، کسی چیز کو احتیاط سے رکھنا مضبوط باندھنا
بھیرو بُنہ	فوج کے ساتھ رہنے والا غیر جنگجو معاون عملہ جیسے لوہار، نعلبند وغیرہ
بیابان مرگ شدن	بے کسی کی موت مرنا
بے چشم و روے نادرست	بے مروت، بے حیا
بے حضور	بے ہوش، بیمار
بے حفاظ	بے شرم، بے غیرت، بے حیا
بے دُہل رقص	دلاور، کامل فن، شوخ، پہلوان
بیک پہلو اُفتادن	کسی کام میں نہایت کوشش کرنا
بیمارِ من گران است	میرا مرض بہت سخت ہے
بہ یک پرکار گذاشتن	ایک حالت پر چھوڑ دینا
بیگاہ	وقت شام (غیاث)

پ

پا بدامن کشیدن	کنارہ کشی، عزلت گزینی
پا براہ گذاشتن	روانہ ہونا، آمادۂ سفر ہونا
پاتابہ پیچی کردن	عیاری کرنا، فتنہ و فساد پھیلانا
پا جفت دویدن	نہایت تیزی سے جانا

پاچناریاں	بے حیثیت لوگ، اجلاف۔ [پاچنار ایران میں ایک جگہ کا نام ہے جہاں کے لوگ عموماً بے قید اور فرومایہ ہیں اس لیے ہر بے قدر انسان کو پاچناری کہتے ہیں. (مصطلحات)
پادر دامن کشیدن	رک : پا بدامن کشیدن
پادُکانی	دکان کے نیچے ذیلی دکان لگانے والا، دلّال
پارۂ رُو بر زمین مالیدن	اظہارِ عجز کرنا، عقیدت ظاہر کرنا
پاسُنگر	رہنما، راستہ دکھانے والا
پائیز	موسم خزان۔ فصل خریف
پاے چراغے داشتن	کسی نفع کی اُمید رکھنا (بازاری زبان ہے)
پدرود نمودن	خیرباد کہنا، وداع کرنا
پرسہ زدن	ٹہلتے ہوئے نکلنا، گردش
پُرس گاہ (پُرسہ گاہ)	ماتم خانہ۔ تعزیت کی جگہ
پرو پوچ بافتن	بیہودہ بے تکی باتیں کرنا،
پری دار	آسیب زدہ، دیوانہ
پسِ تُخم زدن	فرار ہونا، بھاگ جانا
پسِ سر شدن	بھولی بسری ہونا
پشتِ چشم نازک کردن	اظہارِ ناخوشی کرنا، تغافل کرنا، آنکھ بچانا
پشتِ دست گزیدن	افسوس کرنا
پلاس پوش	ٹاٹ کا لباس پہننے والا، گھٹیا قسم کی اُون کا لباس، کم قیمت (رغیات)
پنبہ دہانی	خاموشی
پوزمال	تنبیہ، گوشمالی کرنا
پوست انداختن	کسی کام سے تنگ آ جانا، نقصان اٹھانا
پہلو دادن	عزّت سے بٹھانا، مدد کرنا.

پیرافشانی	بڑھاپے میں جوانی جیسی حرکات
پیشِ خود برپا بودن	گھمنڈ کرنا، مغرور ہونا

ت

تاشِ بادلہ	زربفت۔ سونے کا کام کیا ہوا کپڑا
تبِ استخوانی	تپ دق
تب بستن	بخار کو دوا کے بغیر کسی افسوں یا جھاڑ پھونک سے اتارنا
تب بندی شدن	باری کا بخار، پابندی سے آنے والا بخار
تختہ زدن	ترسا صبح کے وقت تختہ بجا کر عبادت کرتے ہیں
تر آمدن	شرمانا، خجل ہونا
ترسّل	نظم و نثر کی کچھ عبارتیں مختلف خطوں میں لکھ کر بچوں سے پڑھوائی جاتی ہیں تاکہ انھیں ہر طرح کے خط کی شناخت ہو جائے۔ اِسے ملاطفہ بھی کہتے ہیں۔
تصدیع کشیدن	تکلیف اٹھانا
تعلّل	بیماری کا بہانہ کرنا
تک تکِ پا	ادنیٰ اشارہ، ٹنکاری، چلنے کی آواز، ڈرانے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔
تکلیف کردن	کسی کو کوئی چیز دینا، کسی کام کے لیے تیار کرنا، ترغیب
تمارض نمودن	بیماری کا بہانہ کرنا
تمام اجزار	کامل، پورا
تمنّا بر تمنا شکستن	ساری خواہشوں کو ختم کر دینا۔ ترکِ لذات میر نے بے چین ہونے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔
تہ بازار	سڑک پر لگنے والا بازار۔ پینٹھ، کبابی نان بائی پالان دوز وغیرہ
تہ دلی	خلوص
تہ شیشہ	دُردِ تہِ جام، تلچھٹ

ث	
ثمرۂ شاخ	نتیجہ۔ انجام
ج	
جا براے کسے کشودن	کسی کی تعظیم کے لیے جگہ چھوڑنا
جار زدن	فریاد کرنا
جام بر سر کشیدن	یک بار شراب پی جانا
جامہ در خون کشیدن	خون میں لت پت ہونا
جامۂ کسے بر سر چوب کردن	فریاد کرنا
جامہ گذاشتن	مر جانا
جگر از سنگ کردن	جی کڑا کرنا
جلو دار	بڑے حاکموں کے آگے چلنے والا عملہ۔ پائلٹ
جوانِ چہار شانہ	چوڑے چکلے ہاڑ کا جوان
جوانِ چرب	جوان رعنا و دولت مند
جہانِ آب و گل را دعا گفتن	خیر باد کہنا، انتقال کر جانا
چ	
چادرِ یزدی	ایک قسم کی نفیس چادر جو یزد (ایران)، میں بُنی جاتی ہے
چار چار زدن	بُرا بھلا کہنا
چار شانہ	بہت فربہ، تنومند،
چانہ بیجا زدن	بیہودہ گفتگو، ہرزہ سرائی، اول فول بکنا
چراغ بہ پُفے در بند است	چراغ ایک پھونک مارنے کا ہے، ادنیٰ اشارے پر منحصر ہے۔
چرخِ دولابی	آسمان
چشم آب دادن	تماشا کرنا، سیر کرنا
چشم بہ دنبالِ کسے بودن	کسی کا بُرا چاہنا، پیچھے پڑ جانا

چشم چراندن	نظر بھر کر دیکھنا
چوبِ خدائی	انتقامِ خداوندی
چہار پہلو شکستن	فراغت سے بیٹھنا
چہرہ شدن	مقابلے پر آنا

ح

حاشا زدن	قسم کھانا، کسی کام کے نہ کرنے کا اظہار کرنا
حاضر یراق	تیار، کسی کام پر آمادہ
حرام توشہ	نمک حرام، حرام خور
حرام کوزہ	حرام خور
حرف بہ سرِ زلف زدن	اِترانا، نخرے کرنا
حرف سر کردن	بات چیت کا آغاز کرنا
حرکتِ عنیفی	تکلیف دہ سفر
حلوائے نزاکت	ایک قسم کا نفیس حلوہ جو ایران سے مخصوص ہے
حیف گرفتن	انتقام، بدلہ لینا

خ

خام دست	لالچی
خانماں بر سرِ غربت نہادن	مطبوعہ نسخے میں غیرت ہے مگر غربت صحیح ہوگا۔ وطن چھوڑنا، پردیس کو نکل جانا
خانہ بر خروس بار کردن	گھر کو اور سب مال و اسباب کو برباد کر دینا۔ مطبوعہ میں خروش غلط چھپا ہے۔
خانہ روشن کردن	مرجانا، نزع کا عالم
خانہ سیاہ	تباہ حال، بدبخت، جلا ہوا، لٹا ہوا گھر

خدا خواناں	اللہ کو ماننے والے، مذہب کے پیرو
خدا گیر	آسمانی بلامیں، عذاب میں مبتلا ہونے والا
خرجِ راہ شدن	شدائدِ سفر سے مر جانا، راستے میں کام آجانا
خرِ خود را دراز بستن	دُون کی لینا، اپنی شان اور بڑائی کا اظہار کرنا، فراغتِ عیش
خشک شدنِ دست پا	ہمت ہار جانا، بیکار ہو کر بیٹھ رہنا، پست حوصلہ
خصمانہ	شفقت سے غور و پرداختِ احوال، ترس کھانا، تربیت میں سختی سے نظر رکھنا، لطف و مہربانی و دشمنی، حریف ہونا خصم پر الف نون نسبت کا اضافہ کیا ہے۔
خط از بینی کشیدن	ناک سے لکیر کھینچنا۔ اظہارِ عاجزی
خلوتِ باصفا	یزد (ایران) کے قریب ایک جگہ کا نام۔ درویشوں کے لباس کو بھی خلوت باصفا کہا گیا ہے۔
خُم تنک	تنگ ظرف، فرومایہ
خمیازہ کشیدن	انگڑائی لینا، کسی غلط کام کا نتیجہ بھگتنا
خندیدنِ شام	جُھٹپٹا۔ شام کا آغاز
خوانندہ	گویّا، موسیقار
خود کُشتی	کسی کام میں سخت محنت، مجاہدہ، جہدِ بلیغ
خورشید سوار	روشن چہرے والا
خوش پرکار	اچھے قد و قامت والا، خوب صورت
خونِ انسان شیریں بسیار است	بہت لذیذ ہے
خیمۂ شب بازی	کٹھ پتلی

د

دار و دستہ	قوم و قبیلہ
دامن بالا زدن	کمر کسنا، سواری وغیرہ کے لیے تیار ہونا، دامن جھٹک کر الگ ہو جانا

دامنِ پہلودار	ایسا شخص جس سے بہت سے لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں، دامن فراخ
در آتش و آب بودن	بہت رنج اور تکلیف اٹھانا
در جناحِ سفر	آمادۂ سفر
در گردیدن	اُجڑ جانا، برباد ہو جانا
در گیر شدنِ صحبت	بات چیت ہونا
دریاے لنگر دار	بڑا دریا جس کا پانی ٹھہرا ہوا ہو
دست بہ دست بودنِ راہ	راستے کا آسان اور نزدیک ہونا
دست بہ سر کردن	رخصت کرنا، وداع کرنا
دست پاچہ شدن	مضطرب ہونا
دست پیچ	پروانہ، دستاویز
دست پلشتی	ظلم و تعدّی
دست دستِ اوست	اُسی کا دَور دَورہ ہے، قدرت و اقتدار ہونا
دست کجی کردن	ظلم کرنا، دست درازی
دست کش	خادم، نوکر
دست و پا خشک شدن	بیکار بیٹھنا، ہمّت ہار جانا
دُکان گردیدن	گرمیِ بازار، دکان کا خوب چلنا
دل بہ دریا افگندن	ہلاک ہونے پر آمادہ ہونا
دلِ شب	آدھی رات
دم و پوست	سرمایہ، پونجی
دَم و دُود	مختصر سرمایہ، تھوڑی پونجی

دُنبالہ

متن کے حاشیے میں ہے "دنبالہ داشتن از عقب داشتنِ چیزے، و این در محلِ نفرین استعمال کنند"۔ یہاں حوالہ نہیں ہے مگر یہ عبارت چراغ ہدایت سے ماخوذ ہے اور خان آرزو نے

دنبالہ داشتن کے معنوں کی وضاحت میں لکھی ہے۔ میر نے یہ لفظ ایسے موقع پر استعمال کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا مفہوم یہ نہیں۔ وہ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہان خاں کو کمزور سمجھ کر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، لیکن اُس کی کمک کے لیے جو ابدالی فوج موجود تھی اُسے ذہن میں نہ رکھا۔

دُنبالہ گرد	متعاقب۔ پیچھا کرنے والا۔ دنبالہ دو کمک
دندان بہ جگر افشردن	مکروہات کا برداشت کرنا، جی توڑ کوشش
دندان بہ حرف گذاشتن	عہد و پیمان پر قائم رہنا، بات کی پاسداری کرنا (وارستہ) فلانے دندان بہ حرفِ خود گذاشت۔ یعنی بات چبا گیا نیم گفتہ چھوڑ دی (بہار) خلافِ وعدہ کرنے اور مکرنے کو بھی کہتے ہیں میر نے عاجز ہو جانے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔
دندان بہ دندان کلید شدن	بتیسی بند ہو جانا (مثلاً بے ہوشی میں)
دو بدو	آمنے سامنے
دو بغل	دونوں بغلوں میں بھر کر۔ کولی بھر کر
دو تیغہ بازی	دونوں فریقوں سے ملے رہنا۔ سانٹھ گانٹھ ایران میں رسم ہے کہ سپاہی دونوں ہاتھوں میں تلواریں لے کر گھماتا ہے جیسے ہندوستان میں پٹے بازی کہتے ہیں (چراغ)
دو دلہ شدن	کشمکش و پیچ میں ہونا۔ پراگندہ خاطر
دور گردان	دور دور پھرنے والا، کم آمیز
دوست روئی	جان پہچان۔ شناسائی
دوش بر تابوت گذاشتن	جنازے کو کندھا دینا
دوگاہ	نام راگ جسے ہندی میں رام کلی کہتے ہیں
دہ باشی	فوجی اصطلاح۔ دس سپاہیوں کے جمعدار یا میردہ کو کہتے ہیں۔ (ولیم ارون: آرمی آف دی مغلز)
دہ زبانی	اپنی بات پر قائم نہ رہنا۔ ہر بار بیان بدلنا

دہنِ چیزے نداشتن — کسی بات یا شے کی لیاقت و قابلیت نہ ہونا۔ یہ محاورہ اُردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے "میرا کیا منھ ہے" "مجھے اس بات کا منھ نہیں۔ (بہار)

دیر ماندن — ٹھہرنا۔ زیادہ قیام کرنا

دیوارِ صورت کار — مصوّر کا کینوس۔ ایسی دیوار جس پر تصویر بنی ہوں

ر

راہ بُریدن — بٹ ماری، راہ زنی کرنا

راہِ خوابیدہ — بہ معنی راہِ دور۔ از کلام اساتذہ مستفاد می شود و در شعر سعدالدین راقم "جادۂ خوابیدۂ" دیدہ شد و خالی از نازکی نیست (چراغ)

راہ قُفل بودن — "راہِ دریا قفل بود" کا مطلب ہے برسات میں ندی نالے چڑھ جانے کی وجہ سے دریا کا سفر بند تھا۔

رخت کشیدن — سفر کرنا

رفتگی — عشق۔ رفتہ کسے بودن، رفتگی داشتن، والہانہ محبت

رگِ خواب — (۔۔۔ کسے بدست آوردن و آمدن و داشتن) عنانِ اختیار کا ہاتھ میں لینا۔ کسی کی دُکھتی رگ پکڑنا۔ کمزوری کا فائدہ اٹھانا (بہار) یہ لفظ نکات الشعراء میں بھی آیا ہے۔

رگِ گردن — دعوی، غرور، سرکشی

رنجِ باریک — تب دق۔ مرضِ دق

رنگ از رو پریدن — ہوش اڑجانا۔ چہرے کا رنگ فق ہونا

رنگِ تازہ ریختن — نیا کام کرنا، جدّت پیدا کرنا

رنگین رفتن — خرامِ ناز، خوش رفتاری

رنگِ مہتابی — رنگ سفید مائل بہ زردی مثل ماہتاب (بہار و چراغ)

رو از آہن داشتن یا [— دونوں علیحدہ محاورے ہیں میں نے دونوں کا مرکب

رُو از سنگ داشتن]	بنا دیا ہے۔
رُو از کسے گرفتن	محجوب ہونا، شرمندہ ہونا
رُو انداختن	سوال کرنا، التماس کرنا
رُو باختن	شرمندہ ہونا، بے آبرو ہونا
رُو بروے خود	مقابل آمنے سامنے
رُو بر زمین انداختن	(بر خاک انداختن) کسی کی آبرو کا پاس نہ کرنا، شرم و لحاظ نہ کرنا، بے عزت کرنا
رُو تافتن	بے دماغ ہونا، منہ موڑنا، التفات نہ کرنا
رُو داری	آنکھوں کی شرم۔ مروت۔ لحاظ
رُود خانہ	بہ معنی دریا۔ رود کا مزید علیہ
روزی از خم پراگندہ خوردن	اِدھر اُدھر سے بدشواری تمام روزی حاصل کرنا
رُو سفید	نیک، خوش اقبال، دولت مند (روسیاہ کی ضد)
رَوغن قاز مالیدن	تملق اور خوشامد کرنا، فریب دینا
رُو مالِ سیاہ	پردۂ مشکین و پردۂ نیلوفری جو آنکھیں دکھنے (آشوب چشم) میں آنکھ پر باندھا جاتا ہے۔
رُوے تازہ داشتن	معتبر ہونا، لوگوں کی نظر میں
رُوے دل دیدن	کسی کی جانب سے التفات اور توجہ پانا
رُوے کسے دیدن	کسی کی رو داری، لحاظ کرنا، جانب داری کرنا
رُوے نادرست	بے حیا، بے مروت
رَہکلہ	چھوٹی توپ
رِیتی	جمنا کا کنارہ
ریختن بہار	موسم بہار کا آخری زمانہ، اختتام
ریسماں برائے کسے تافتن	کسی کو ہلاک یا برباد کرنے کا منصوبہ

ز

زالِ بے حفاظ	بے شرم بڑھیا۔ بے حیا فاحشہ (کنایہ: دنیا)
زبان بازی	گفتگو، مکالمہ، دو بدو کی چوٹ
زبان دادن	عہد و پیمان کرنا۔ کسی بات کا اقرار و اعتراف
زبان در تہِ زبان داشتن	(در زیرِ زبان داشتن) اپنی بات بار بار بدلنا
زبانہ کشیدنِ آتش	آگ کا بھڑکنا۔ لپٹیں اٹھنا
زبانِ مغز دار	فصیح و بلیغ گفتگو کرنے والا۔ تہ دار بات کہنے والا
زبون گشتن	مغلوب ہونا
زبون گیر	کمزوروں اور ضعیفوں کو آزار پہنچانے والا، بے رحم
زخمِ دامن دار	بڑا اور گہرا زخم
زرِ رستہ	وہ سکہ جو ابھی بھنایا نہ گیا ہو، سونا
زرِ توفیقی	راہِ خدا میں یا بزرگوں کو نذر کے طور پر خرچ کیا جانے والا روپیہ فتوح۔ نذرانہ
زرعتِ خام	کچا اناج، دانے
زنجیرِ سر	وہ زنجیر جو ولایتی قلندر اپنے سر پر لپیٹ رکھتے ہیں (بہار)
زنخ زن	ہرزہ گو۔ بکواس کرنے والا
زنگ و زنجیر	فقراء اور قلندروں کے کمر میں باندھنے کی چیزیں (بہار)
زود خوردی	جھڑپ
زیادہ سَر	اپنی حد سے باہر قدم رکھنے والا، اپنے آگے کسی کو نہ گرداننے والا مغرور۔ گھمنڈی۔ یہ لفظ خان آرزو نے اہلِ ایران سے تحقیق کر کے لکھا ہے۔ ذکرِ میر (ط ۱) میں غلطی سے زیادہ پر، چھپا ہے۔
زیرِ پیچِ دستار	عمامہ کے نیچے کی چھوٹی دستار یا رومال۔ اسے ہندوستان میں تہ پیچ کہتے ہیں، مگر میر نے وہ لفظ استعمال کیا ہے جو اہلِ ایران کی بولی ہے۔

زینتِ قلندری	آرائش قلندری۔ قلندرانہ وضع

س

سادہ رُو	جوانِ بے ریش، اُمرد
ساز و برگ	اسباب، سر و سامان
سانِ فوج	سلاح و سامان لشکر
سایۂ دستِ کسے گرفتن	کسی سے فیض پانا
سبک پا	شخص بے تمکین، متلوّن مزاج (چراغ)
	تیز رفتار (غیاث)
سَبلت	مُونچھ
ستارہ نداشتن	قسمت کا کھوٹا ہونا۔ اُردو میں کہتے ہیں "لہنا نہیں ہے۔"
ستر پوش	لباس
سجّادۂ محرابی	جانماز جو محراب کی شکل کی بنی ہو
سخت باز	قمار بازی میں ماہر۔ پرانا جواری
سخت خوردن	بہت تکلیف اٹھانا
سراپا	خلعت۔ جامہ و دستار وغیرہ
سر از یک گریباں برآوردن	کسی شخص کے بالکل ہم شکل ہونا۔ آرزو کہتے ہیں کہ جو اس کے معنی ہمسری اور برابری کرنا بتاتا ہے وہ غلطی پر ہے (چراغ)
سرب	سیسا جس سے بندوق کی گولی بناتے ہیں (قدیم اصطلاح میں صرف گولی کے لیے استعمال ہوا ہے جیسے سرب و بارود یا باروت)
سر بر کردن	صلح کر لینا۔ موافقت کرنا
سر بسر کسے داشتن	کسی سے جھگڑا کرنا، عداوت رکھنا
سر بہ گریباں فرو بُردن	غور و فکر کرنا
سر پائے زدن	ٹھوکر مارنا

سرِ پیچ دار	لمبے بالوں کو باندھ کر جٹا بنا لینا جیسے سادھو وغیرہ کرتے ہیں۔
سرِ پیچ زدن	اونگھنا، نیند میں جھونٹے لینا
سرِ توقع خاریدن	کسی سے کچھ اُمید یا توقع رکھنا
سرِ حساب شدن	واقف وآگاہ ہونا
سرخ و زرد شدن	شرمندہ ہونا
سرِ داستان کشادن	حکایت بیان کرنا، داستان سنانا
سرزدہ آمدن	بے خبر و ناگاہ آنا
سرِ زخم مالیدن	ترس کھانا، تدبیر سوچنا۔ یہ بھی آرزو نے اہل زبان سے پوچھ کر لکھا ہے
سرِ سخت خوردن	بھاری صدمہ اٹھانا، سخت بلا میں گرفتار ہونا (وارستہ)
سرِ شخ	سرکش
سرِ صفحہ	کسی صفحہ کا ابتدائی حصہ، شروع کی عبارت
سر کردن	سلوک کرنا، کسی کام کا شروع کرنا اور اسے تکمیل تک پہنچانا۔ زندگی بسر کرنا (غیاث)
سرِ کلافہ	"سرِ کلافہ گم کردن" سررشتہ کار کا ہاتھ سے نکل جانا کسی معاملے کا قابو سے باہر ہو جانا
سرکُن	سردار فوج (وارستہ) کسی کام کی ابتدا کرنے والا۔ دوسری جگہ آرزو نے اس کا مطلب مُفسد وفتنہ انگیز لکھا ہے۔
سرکن پرکن	"سرکند و پرکند" بھی بولا جاتا ہے۔ اُردو میں اس کا مترادف ہے : "بوکھلایا ہوا"
سرِ کلّہ زدن	جنگ کرنا، ٹکر لینا، مقابلہ اور برابری کرنا
سرِ گاو زدن	فائدہ حاصل کرنا، نفع اٹھانا
سرمۂ خفا در چشم کشیدن	یہ محاورہ علم نیرنجات وطلسم سے آیا ہے اور اس علم کی اصل ہندوستانی ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک طلسماتی سرمہ (الوپ انجن) ایسا ہوتا ہے

کہ اُسے کوئی آنکھوں میں لگائے تو وہ سب کو دیکھ سکتا ہے مگر اُسے کوئی نہیں دیکھے گا یہاں میر کی مراد روپوش ہو جاتے سے ہے۔

سفید شدن — ظاہر و نمودار ہونا، نمایاں ہونا، معزز ہونا (چراغ۔غیاث)

سفید گفتن — کھری کھری سنانا

سفیدہ دم — علی الصباح۔ تڑکے میں

سفیدۂ صبح دمیدن — صبح کا نمودار ہونا

سقفِ منقش — آسمان

سقیفہ سازی — بہتان تراشی۔ جھوٹ بات کہنا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اصحابِ رسول نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت کر لی تھی اس محاورے میں یہی تلمیح ہے اور اس لفظ کا استعمال میر نے اپنے تشیع کے اظہار کے لیے کیا ہے۔

سکہ بر زر زدن — کسی کام کو بہ حسن و خوبی انجام دینا، جو کہنا وہ کر دکھانا

سکہ درست — معاملے کا کھرا انسان

سگِ پا سوختہ — بہت مضطرب اور حیران کار شخص۔ لفظ مثل و مانند کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اُردو میں اِس کا مرادف ہے: "جلے پاؤں کی بلی"

سگِ روے یخ — ایسا آدمی کہ اُسے جدھر دوڑا دیں دوڑ جائے اور جس کام کو کہیں اُسے کرنے میں لگ جائے۔ خان آرزو نے یہ محاورہ اہل زبان سے تصدیق کر کے لکھا ہے (چراغ۔ بہار) چراغ میں سگ روے، بہ معنی مطیع و فرماں بردار

سلاخی کردن و نمودن — لفظی مطلب ہے "کھال کھینچنا" مگر کنایۃً سخت سست باتیں کہنا ڈانٹ پھٹکار۔ اعتراض۔ یہ محاورہ بھی اہل زبان سے پوچھ کر لکھا ہے (چراغ و بہار)

سلسلۂ مُو	لمبے گھونگھریالے بالوں والا
سمسار	بہ کسرِ اوّل۔ دو کاندار اور خریدار کے درمیان معاملہ طے کرانے والا دلال کمیشن ایجنٹ۔ مختلف اشیاء مثلاً سپر، شمشیر، زین، لگام وغیرہ فروخت کرنے والا۔
سنگ بہ سنگ زدن	کسی معمولی کام کے کرنے میں زیادہ اُدھم مچانا نیز بہ معنی رنج دینا، خراب کرنا۔ (اُردو میں اینٹ سے اینٹ بجانا) مکمل تباہ کر دینا۔
سنگ داغ	جیسے پتھر گرم کر کے اُس سے داغا جائے۔ مجازاً عاشق دل سوختہ۔ پتھر گرم کر کے اُس سے پانی بجھایا جاتا ہے اسے بھی سنگ داغ کہتے ہیں (چراغ وبہار)
سنگر بستن	بروزن لنگر۔ لشکر کے یا گھروں کے چاروں طرف حفاظت کے لیے گھراؤ کرنا۔ توپیں رکھ کر کانٹے بچھا کر۔ مورچال۔
سنگر و سنگ چین	مورچال اور چھوٹی دیواریں
سنگ روے رخ	دیکھو سنگ روے رخ
سنگ زیرِ سر گذاشتن	صبر کرنا، توکّل کرنا
سنگ قناعت	بے نوا یا مجاہدہ کرنے والے درویش بھوک کی ایذا سے بچنے کے لیے پیٹ سے پتھر باندھ لیتے ہیں
سوارِ دولت	صاحب دولت۔ بااختیار و اقتدار
سودا کردن	جنون ہو جانا
سوزہ بال (سوزن بال)	پہلے پہل جب کسی پرند بچے کے پر نکلتے ہیں تو وہ سوئی یا کانٹے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ یہاں سوزہ بہ ظاہر سوزن کا مخفف ہے۔ ہا آخر میں زائد ہے۔ غالباً یہ بچۂ طائر کے لیے مخصوص ہے مگر میر نے اس لفظ کا استعمال اپنے لیے کیا ہے۔ (چراغ وبہار)

سوہانِ روح — "ایسا شخص جس کی صحبت سے طبیعت کو مناسبت نہ ہو اور جس سے مل کر آزار محسوس ہو۔ یہ اُردو میں بھی خوب رائج ہو گیا ہے اور شخص کی قید نہیں کوئی بات یا امر بھی سوہان روح ہو سکتا ہے۔ آرزو نے یہ محاورہ بھی اہلِ زبان سے تحقیق کر کے لکھا تھا (چراغ و بہار)

سَہل — معمولی۔ حقیر۔ آسان، ہلکا۔ نرم زمین

سیاہی زدن و کردن — نمودار ہونا، نظر آنا۔ چُندھیا دینا۔ خود نمائی۔ مباہات فخر کرنا

سیر آہنگ — خوش آواز، خوش الحان

سیرابہ پُز — ہندوستان میں جس طرح صبح کو نہاری پکا کر بیچتے ہیں اہل ایران میں دستور تھا کہ وہ سیرابہ پکاتے تھے۔ آرزو نے یہ لفظ اہل زبان کی سند سے لکھا ہے کہ اس میں "کلہ و پارچہ" یعنی سری ہوتی تھی۔

سیم بندی — چراغاں کی ایک قسم جس میں شمعوں کو باریک تار سے باندھ کر نئے انداز سے رکھا جاتا ہے۔

سیم گِل کردہ — قلعی کی ہوئی، پُتی ہوئی

سیم مُذاب — پگھلی ہوئی چاندی

ش

شاخ از پشیمانی بر آوردن — نہایت شرمندہ ہونا

شاخ بر دیوار کردن / زدن — تکبر، گھمنڈ، گردن کشی (برہان و سراج میں خوش حال اور نیک بخت)

شال کہنہ داشتن — بہت مفلس ہونا

شانہ کاری نمودن — فریب دینا، ظاہری خوشامد کرنا

شانہ گیر شدن — اعتراض کرنا، جھڑکنا

شاہ اندازی — ڈینگ مارنا، بلند دعوی کرنا

شب شکستن — پو پھٹنا، کسی مصیبت کے وقت کا گذر جانا، رات کا تھوڑا حصہ باقی رہ جانا۔

شب بہ سردست آمدن	رات گذرنا
شست آویز نمودن	پھانسی پر چڑھانا، سزا دینے کے لیے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کسی چیز سے مضبوط باندھ کر لٹکا دیتے تھے
شُست وشُود ادن	نصیحت کرنا، جھڑکنا، کسی عملِ ناشالستہ سے روکنا
شکرآب	شکر رنجی، معمولی سی رنجش
شکرانگور	ولایتی انگور کی ایک قسم جو سمرقند میں ہوتا ہے
شکری رنگ	سفید مائل بہ زردی، آدمی کے رنگ کے لیے کہا جاتا ہے
شکستنِ شب	رات کا آخری حصّہ، رات کا تھوڑا سا رہ جانا
شیر اندام	چوڑے سینے اور پتلی کمر والا جوان
شیر شرزہ	شیر ببر۔ خوفناک شیر
شیرہ خانہ	شراب کی بھٹی۔ (آرزو نے یہ لفظ اہلِ زبان سے سن کر لکھا ہے)
شیریِ شنبہ	ایران کی رسم ہے کہ بادشاہ اور امرا ہفتہ کے دن خاصانِ درگاہ کے نام پر نیاز کرتے تھے۔
شیشہ بند کردن	کسی کا مذاق اڑانا، ٹھٹھول کرنا
شیشہ جان	نازک مزاج

ص

صحبت برآر شدن	صحبت کا سازگار ہونا
صحبت درگیر شدن	آغازِ گفتگو، بات چیت شروع ہونا
صحبت قروتی شدن	صحبت بے مزہ ہو جانا۔
صحبت کوک شدن	ملاقات کا خوشگوار ہونا
صدرہن خواندن	صلواتیں سنانا، بُرا بھلا کہنا
صد کوزہ بساز دیکے دستہ ندارد	کسی بات کا اعتبار نہ ہونا، بے پر کی اُڑانا
صرفہ دادن	مہلت دینا، فرصت دینا

صورت باز	بہروپیا
صیحت	شہرت (عربی میں شہرت کے لیے صیت ہے) یہاں شور و غوغا مراد ہے۔

ط

طرح کش	ناز بردار، محکوم، فرماں بردار
طرفِ کلاہ بر شکستن	فخر و ناز
طرف گشتن/شدن	مقابل ہونا
طفلِ بالہ	نوزائیدہ شیر خوار بچہ، پالنے میں پلنے والا، جس کی ولادت کو چند روز سے زیادہ نہ ہوئے ہوں۔

ظ

ظلِّ ممدود	پھیلا ہوا سایہ

ع

عُرو گور	بے محل شور و غوغا۔ اودھ مچانا (نسخہ مطبوعہ میں عرو کور چھپا ہے)
عزیز مردہ	جس کا کوئی عزیز مر جائے، بد دعا ہے اور عورتوں کا محاورہ ہے فارسی میں یہ کوسنے کے طور پر بولا جاتا ہے۔ تیر نے فارسی جدید کے استعمال کے شوق میں اِسے اپنے باپ کا لقب ہی بنا دیا!
علمِ مُردگاں	ایران میں رسم ہے کہ جنازے کے آگے علم لے کر چلتے ہیں۔
عُلوفہ	روزی، خرچ
عودی رنگ	سانولا رنگ

غ

غنچہ پیشانی	رنجیدہ، غمگین
غیرت بحرام	بے شرم، بے غیرت

ف

فتیلہ مُو	گھونگھر والے بال، اُلجھے ہوئے بٹے ہوئے بال
فلک کردہ	اُلٹا لٹکایا ہوا، جیسے عذاب دیا گیا ہو، ظلم رسیدہ
فوجِ اِلتمش	ہَراول دستے اور سردار کے بیچ رہنے والا فوجی دستہ (غیاث) چُنداول
فِیئتَین	دو گروہ

ق

قدر انداز	نشانے پر تیر مارنے والا
قدغَن	تاکید۔ سخت احکام
قَدغنچیاں	نظم و نسق کرنے والے، بادشاہ کی طرف سے انتظام کے لیے مامور
قدم شمردہ برداشتن	احتیاط سے چلنا
قلندرانِ برگ بند	بدن کو پتّوں سے ڈھانپنے والے قلندر، بے سروسامان درویش
قمار در راہِ قمار	ایسا کام کرنا جس سے واقفیت نہ ہو، جیسے جوئے کی رسم و راہ سے ناواقف اگر جوا کھیلے گا نقصان اُٹھائے گا۔ صرف قمار راہِ قمار بھی کہتے ہیں۔

ک

کار بر خود تنگ گرفتن	عاجز ہو جانا
کارد باستخواں رسیدن	سخت مصیبت میں مبتلا ہونا
کاسہ باز	ایک طلسماتی کھیل ہے، ایک شخص بڑا سا لبادہ اوڑھ کر اُس کے اندر سے کبھی پیالہ یا کوئی اور برتن نکال کر دکھاتا ہے، کبھی پانی سے بھرا ہوا پیالہ نکالتا ہے جس پر کبوتر بھی بیٹھا ہوتا ہے، یہ شیشہ بازی و طاس بازی کی قسم سے ہے۔
کاسہ بر سر شکستن	رسوا کرنا، ذلیل کرنا

کُلہ گوشہ بہ آسمان رسیدن	کمال ذوق و شادمانی و خوشحالی
کم بغل	بے حیثیت ۔ فرومایہ
کم کاسہ	کم ظرف
کنارِ خشک داشتن	مفلس و بے مایہ ہونا
کنایہ زدن	پہلو دار بات کہنا
کوچک ابدال	چھوٹا ابدال، فقیر
کوچہ دادن	مہلت دینا، کسی کو راستہ دینا، راہ میں رکاوٹ نہ ہونا
کُہنہ فِعلہ	گھاگ

گ

گاؤ در خرمنِ کسے بستن	ظلم کرنا، دادا گیری، ہیکڑی، دوسروں کے مال میں تصرف
گپ زدن	بات چیت کرنا
گربہ لاوہ	نقلی بے جان بلی ۔ بچوں کے ایک کھیل چالیک کی طرف اشارہ ہے جس میں بلی کا پتلا بھی ہوتا ہے ۔
گرسنہ چشمی	کنجوسی، حرص، گداگری،
گرگِ بغل زن	گھاگ ۔ آزمودہ کار
گرم رفتن	جلدی جانا، تیزی سے جانا
گریبان انداختہ	گود لیا ہوا،
گلیاتگ برقدم زدن	تیزی سے جانا، جلدی
گل برسرِ خاک زدن	عزت و توقیر کرنا
گُلِ حلوا	حلوے کا ڈھیر، مقدار
گِلخن	گِل بمعنی خاکستر اور خن خانہ کا مخفف ہے ۔ گھورا ۔ کوڑا ڈالنے کی جگہ بہ کسرِ اول بھی مستعمل ہے ۔
گل در آب افگندن	فساد اور خرابی پیدا کرنا

کاسہ بند نمودن	ڈھک کر، رکھنا بند کرنا
کاغذِ باد	پتنگ
کاغذِ زر	ہنڈوی
کاکُلِ صبح	صبح صادق، (جسے قرآن میں خیطُ الاَسْود کہا گیا ہے)
کبابِ سنگ	کباب کی ایک قسم جسے گرم پتھر پر پکاتے ہیں۔ اِسے غالباً بوٹی کباب کہتے ہیں
کباب گذشتہ	جلا ہوا کباب، از کار رفتہ
کبود جامہ	مازندران (ایران) کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ یا گاؤں ہے (مطلع السعدین)
کج پَلاسی	بد معاملگی (چراغ)
کُشتی زدنِ مردانہ	(بفتح کاف و بہ ضم کاف) پہلوانوں کی اصطلاح۔ حریف کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے پچھاڑ دینا۔
کفِ افسوس کندن	افسوس کرنا، رنجیدہ ہونا
کفن پارہ کردن	سخت بیماری سے صحت یاب ہونا، نئی زندگی پانا
کُلاغ زدن	طعنہ دینا، مذاق اڑانا (غیاث و مصطلحات)
کلاں کار	تجربہ کار، ماہر
کُلاہ از سرِ کسے برداشتن	کسی کے بارے میں دریافت کرنا، تعارف چاہنا
کلاہِ شب پوش	رات کو پہننے کی ٹوپی
کلکل شدن	دونوں کاف مفتوح۔ فضول گوئی، ہرزہ سرائی، زبانی جھڑپ
کلکِ خُسپ	بفتح اول و دوم مفلس اور پریشاں حال، آرزو نے کلک کے معنی گلخن (گھورا) لکھے ہیں، خُسپ کی جگہ جیب بھی آیا ہے، کلک کے معنی راکھ اور دھول بھی ہیں۔ (غیاث و چراغ)
کَل کَل	شور و ہنگامہ، واویلا

گُلِ صد پردہ / صد برگ	گل ہزارہ، گیندا
گُلِ مہتاب	چاندنی رات میں درختوں کا سایہ جو زمین پر پڑتا ہے۔

ل

لگد برابر زدن	فخر کرنا، مقابلہ کرنا، برابر کی ٹکر لینا
لگدِ روزگار خوردن	حادثے کا شکار ہو جانا، اچانک موت
لنگر از کف دادن	بے اختیار اور سخت مضطرب ہو جانا

م

مایۂ مسکوب	بہتا ہوا پانی
مُتشبّث بہ قلب	قلب سے لپٹا ہوا، قلب کو متاثر کیے ہوئے
مُحتضَر	عالم سکرات میں، نزع کے عالم میں (احتضار سے اسم مفعول)
مردم داری	مروت
مردہ شو بُردہ	کوسنا ہے کہ اُسے مردوں کو غسل دینے والے لے جائیں
مرغوا مُو	گھونگھریالے بالوں والا
مَزِلّۃ الاَقدام	پیروں میں لغزش پیدا کرنے والا، (جہاں غلطی کا امکان ہو)
مستِ سرانداز	نہایت بدمست
مُصحف خوردن	قسم کھانا
مُغترّ	مغرور، گھمنڈی
مغزِ خر خوردہ	احمق، گاودی
مُلّائے قشری	کٹھ ملّا
مہتاب بہ گز پیمودن	بے فائدہ کام
مُہوّس	کیمیاگر
میان دادن	اجازت دینا، رخصت کرنا
میخِ چشم بودن	کسی کو تکلیف پہنچانا، رنج دینا، آنکھوں میں کھٹکنا

میخ دوز ایستادن	مضبوطی سے جم کر کھڑا رہنا، ہمت سے مقابلہ کرنا

ن

نازہائے ہرمزی	عجیب نخرے، ناز و انداز دکھانا
نام برگشتہ بیمار	بیماری طویل ہو جائے تو بہ طورِ فال بیمار کا نام تبدیل کر دیتے ہیں یہ ایران کا دستور ہے
نان بر شیشہ مالیدن	نہایت حریص اور لالچی ہونا
نان بہ روغن اُفتادن	عیش ہونا، پانچوں گھی میں ہونا
نانِ جوان	روٹی کی ایک قسم، تازہ روٹی
نان خورشِ پیر	باسی سالن
نان شماط	تندور، بہت سی روٹیاں رکھنے کا ظرف
نان گربہ را بہ تیر زدن	حیلے بہانے سے روزی حاصل کرنا، نہایت مفلس ہونا
نسقچی باشی	شہر میں امن و امان کا انتظام کرنے والا
نسق مقرر شدن	امن و امان قائم ہونا
نشیمنہ	بیٹھنے کی جگہ، مسند
نصف دل خوش	بے دلی کے ساتھ۔ بادلِ ناخواستہ
نطعی پوش	چمڑے کی جیکٹ جو پہلوان پہنتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ چمڑے کا وہ ٹکڑا ہے جسے بچھا کر پہلوان کشتی لڑنے سے پہلے اپنا سامان رکھ دیتے ہیں، یہ اُستاد ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے، ایک تحقیق یہ ہے کہ فنِ کشتی میں مہارت پیدا کر لے کے بعد ایک جیکٹ کو مدت تک روغن کنجد (تلوں) میں بھگو کر رکھا جاتا ہے پھر اُسے پہننے والا نطعی پوش کہلاتا ہے گویا اب وہ مانا ہوا اُستادِ فن ہے۔
نقشِ کارہ داشتن	کسی کام کے لائق نہ ہونا
نمازِ پیشین	ظہر کی نماز

نمد مُو	اُلجھے ہوئے بالوں والا
نواخوانی کردن/نمودن	اشاروں کنایوں میں بات کہنا، طعنہ دینا
نوکیسہ	نودولت

و

واکشیدن	کسی کو زور زبردستی سے کسی کام کے لیے تیار کرنا۔ میر نے واپس آنے کے معنی میں استعمال کیا ہے
وقفِ اولادی	فقہی اصطلاح، کسی چیز کو اولاد کے لیے وقف کر کے دوسروں کو تصرّف سے باز رکھنا۔

ہ

ہرزہ چانگی	بیہودہ گوئی، بکواس
ہرزہ مَرش	آوارہ، اِدھر اُدھر بھٹکنے والا
ہمسر	زوجہ، بیوی
ہمگیر	آرزو نے اس کا مفہوم نیرنگ گرفتن لکھا ہے لیکن جو شعر سند میں دیا ہے اس سے مفہوم موافقت کرنے کا ہی نکلتا ہے۔ میر نے بھی اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے

ی

یال و کوپال	کرّوفر۔ تن و توش
یخ آب گشتن	پریشاں و پراگندہ ہونا، تکلیف اٹھانا
یَراق	وردی، ساز و سامان
یک آش پختن	تھوڑی سی مدت۔ قلیل زمانہ
یک دمِ آب	ایک گھونٹ پانی
یک شاخ چادر افگندن	فاحشہ عورت کا شوخی و بے حیائی سے چادر اتار کر ایک طرف پھینک دینا۔ میر نے صرف یک شاخ افگندہ استعمال کیا ہے۔
یلغر	یلغار کرتے ہوئے، یورش

اشاریہ

[نوٹ : اِس اشاریے میں صفحات کے حوالے صرف میر کی آپ بیتی ترجمہ ذکرِ میر کے دیے گئے ہیں۔]

اشخاص

(الف)

(ب)

مقامات

ادارے

کتابیں و رسالے